QAMAR JAMALI KA GHAIR AFSANVI ADAB

A Dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

in

Urdu

Submitted by

SAYED FARYAD BEE
Reg. No. 20HUHL10

Supervisor

Prof. Syed Fazlullah Mukarram

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046
Telangana, India

December 2022

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

قمر جمالی کا غیر افسانوی ادب

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار

سید فریاد بی

20HUHL10

نگراں

پروفیسر سید فضل اللہ مکرم

UNIVERSITY OF HYDERABAD
सा विद्या या विमुक्तये

شعبۂ اُردو
اسکول آف ہیومانیٹیز
یونیورسٹی آف حیدرآباد
حیدرآباد 500046
تلنگانہ، انڈیا

دسمبر ۲۰۲۲ء

Date: ………………

DECLARATION

I, **SAYED FARYAD BEE** hereby declare that this dissertation entitled **"QAMAR JAMALI KA GHAIR AFSANVI ADAB"** submitted by me under the guidance and supervision of **Prof. Syed Fazlullah Mukarram,** is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my dissertation can be deposited in Shodganga / INFLIBNET.

Name: **SAYED FARYAD BEE**

Signature of the Student

Reg. No. 20HUHL10

Date: ……………..

CERTIFICATE

This is to certify that the dissertation entitled **"QAMAR JAMALI KA GHAIR AFSANVI ADAB"** submitted by **SAYED FARYAD BEE** bearing Registration No. **20HUHL10** in partial fulfillment of the requirements for the award of **Master of Philosophy** in **Urdu** is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for the award of any Degree or Diploma.

This is also to certify that **SAYED FARYAD BEE** participated in the One Day National Seminar on *"Asre Hazir Me Adab-e- Atfal"* held on 6th March 2021. He has presented the paper titled ***"BACHOO KA SHAYER MUZAFFAR HANAFI"*** Organized by Department of Urdu, held at Govt. Degree College, Siddipet (A) - Telangana.

Signature of the Supervisor
Prof. Syed Fazlullah Mukarram

//Countersigned//

Head
Department of Urdu

Dean
School of Humanities

GOVERNMENT DEGREE COLLEGE, SIDDIPET (A)

(Reacredited 'A' Grade by NAAC)

ONE DAY NATIONAL SEMINAR ON

CHILDREN LITERATURE IN PRESENT PERSPECTIVE

Sponsored by : NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE

Government of India, New Delhi

یک روزہ قومی سیمینار

بعنوان ''عصر حاضر میں ادب اطفال''

Certificate

This is to certify that Prof./Dr./Mr./Mrs. SAYED FARYADBEE of Hyderabad Central University

University/College, He/She Participated/presented a Paper/Chaired Session/ Acted as Resource Person Entitled BACHOO KA SHAYER MUZAFFAR HANAFI in NCPUL, Sponsored One - Day National Seminar on "ASRE HAZIR ME ADAB - E - ATFAL" Organized by Department of Urdu, held at Govt. Degree College, Siddipet (A) - Telangana, during on 06th March, 2021

Convener
(Dr. Syed Asrarul Haque)

Chairman & Principal
(Dr. Ch. Prasad)

فہـــــرست

■ پیش لفظ	2
■ باب اوّل: قمر جمالی سوانح حیات و شخصیت	6
■ باب دوم: قمر جمالی کی ادبی خدمات	23
■ باب سوم: قمر جمالی کا غیر افسانوی ادب (مجموعی جائزہ)	61
■ ماحصل:	247
■ کتابیات:	256

پیش لفظ

پیش لفظ

اُردوادب میں کارِتحقیق کا تصور زیادہ قدیم نہیں ہے۔کچھ عرصہ پہلے تک اُردو تحقیق کو بنجر ریگستان اور شجرِ بے سایہ دار کہا جاتا تھا۔حالاں کہ خالق کائنات اللہ رب العزت نے انسانی فطرت میں تحقیق وجستجو کا مادہ ازل سے پوشیدہ رکھا ہے۔اگر یہ نہ ہوتو انسانی شخصیت، ذہنیت،صحت اور روحانیت کا ارتقاءرُک جائے گا۔اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم کہیں لوگوں کا اجتماع دیکھتے ہیں تو ہمارا تجسس بڑھ جاتا ہے کہ کیا ہوا؟ اتنے سارے لوگ ایک ساتھ جمع کیوں ہیں؟ خیریت تو ہے؟

موسموں کی ٹھنڈک، حدت اور شدت سے بچنے کے لئے محفوظ مکان کی تلاش جسم ڈھانکنے کے لئے کپڑا، کھانا پکانے کے لئے آگ، دشمنوں سے بچنے کی تدابیر اور جانوروں کے شکار کے طریقوں کے علاوہ دنیا کے تمام مذاہب وعلوم وفنون کی تخلیق وترقی اسی جستجو اور تحقیق کے سہارے ہوئی ہے۔مرزا رفیع سوداؔ نے تحقیق کی اسی ضرورت واہمیت کے پیش نظر کہا تھا کہ ؎

سوداؔ نگاہِ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر اک ذرّے میں ہے آفتاب کا

اُردو میں تذکرے، نہ صرف تنقید کا بلکہ تحقیق کا بھی بنیادی ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔اور ادب کے دامن کو وسعت بخشنے میں تحقیق کا اہم رول ہوتا ہے،اسی سلسلے کی ایک کوشش میرا یہ مقالہ ہے۔

میں نے غیر افسانوی نثر میں دلچسپی کے سبب اپنے مشفق ومہربان نگراں پروفیسر سید فضل اللہ مکرم کے مشورے سے ’’قمر جمالی کا غیر افسانوی ادب‘‘ موضوع کا انتخاب کیا اور ان کی رہنمائی سے اس مقالے کو تین ابواب

میں تقسیم کیا ہے۔

باب اوّل: ''قمر جمالی کی حیات و شخصیت'' میں قمر جمالی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے۔

باب دوم: ''قمر جمالی کی ادبی خدمات'' میں قمر جمالی کا ادبی سفر مثلاً افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری اور قمر جمالی کے افسانوں اور ناول پر مختلف زبانوں میں کئے گئے تراجم کی تفصیل پیش کرتے ہوئے محرکات و رجحانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب سوم: ''قمر جمالی کا غیر افسانوی ادب'' ہے۔ مذکورہ باب کو ۱۲ ذیلی ابواب میں تقسیم کر کے غیر افسانوی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے غیر افسانوی نثر کے اقسام پر گفتگو کی گئی ہے۔ قمر جمالی نے غیر افسانوی نثر کے میدان میں تقریباً تمام اصناف میں اپنے جوہر دکھائے ہیں جس میں تبصرے، انشائیے، مضامین، سفرنامے، وفیات، خاکے، صحافت، رپورتاژ، دیباچے اور ریڈیو فیچر شامل ہیں۔ ان تمام اصناف کا جائزہ لیتے ہوئے قمر جمالی کے فن و خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے بعد حاصل مطالعہ میں اس تفصیلی مطالعہ کی اہمیت و افادیت کو اُجاگر کرتے ہوئے غیر افسانوی ادب میں قمر جمالی کے مقام و مرتبے کو متعین کیا گیا ہے۔ یہ مقالے کا مختصر اہم جز و ہے جو پورے مقالے کا احاطہ کرتا ہے۔

حاصل مطالعہ کے بعد کتابیات شامل ہے جس میں ان کتب و رسائل کا ذکر کیا گیا ہے جن سے مقالے کی ترتیب و تشکیل کے دوران استفادہ کیا۔

میں اس سلسلے میں سب سے پہلے مالک کائنات کا شکریہ ادا کرتی ہوں جس نے مجھے علم جیسی لازوال دولت سے نوازا۔ صحت و تندرستی عطا کی۔ اگر میرے کام میں اللہ جل جلالہٗ کا فضل و کرم شامل نہ ہوتا تو میں یہ مقالہ مکمل نہ کر پاتی۔

اس کے بعد خاص طور پر میں اپنے نگراں اور مشفق و محترم استاد پروفیسر فضل اللہ مکرم صاحب کی سپاس گزار ہوں جن کی باذوق علمی و ادبی شخصیت نے قدم قدم پر نہ صرف میری رہنمائی فرمائی بلکہ تحقیق کے دوران چھوٹی سے لے کر بڑی تمام رکاوٹوں اور میری ذہنی الجھنوں کو دُور کیا۔ یہ میرے لئے فخر کی بات ہے کہ میں نے ان کی نگرانی

میں اپنا مقالہ مکمل کیا۔اللہ تعالیٰ ان کو صحت وسلامتی عطا کرے۔(آمین)۔

اپنے والدِ محترم سید اسماعیل اور پیاری امی جان رحمت کا شکریہ تو میں کیسے ادا کروں کہ جنھوں نے میری زندگی میں کسی بھی طرح کی آنچ نہیں آنے دی اور جن کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں اس مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا رہی ہوں۔اللہ کرے ان کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رہے۔(آمین) اپنے بھائی بابا فخر الدین کی بھی بے حد شکر گزار ہوں جس نے میری پڑھائی میں میرا بھر پور تعاون دیا۔اور جن کی شفقت ومحبت نے مجھے اس سفر کے دوران حوصلہ بخشا۔

محترمہ قمر جمالی صاحبہ ایک شخص کا نام نہیں بلکہ بصیرتوں کے ایک زندہ عجائب خانے کا نام ہے۔میں اللہ رب العزت کی بے حد شکر گزار ہوں کہ مجھے ایک ایسی علمی وادبی شخصیت پر کام کرنے کا موقع فراہم ہوا۔موصوفہ نے بھی اس دوران مواد کی فراہمی میں میری کافی رہنمائی فرمائی۔وقتاً فوقتاً مجھے اپنے مشوروں سے نوازا۔علاوہ ازیں اس مقالے کو مکمل کرنے میں جن دوستوں نے میری رہنمائی کی،جنھوں نے میری ذہنی الجھنوں کو سلجھانے میں قدم قدم پر رہنمائی کی ان میں سے پہلے جاوید یوسف اور محمد ظفر صاحب کا دل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی توسط سے اپنا مقالہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔میں اپنے عثمانیہ شعبے کے اساتذہ کرام معید جاوید صاحب،مشتاق احمد،انجم النسا بیگم کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور میری کاوشوں اور ارادوں کو پستی سے نکال کر بلندی پر پہنچا دیا۔دعا گو ہوں کہ میرے تمام اساتذہ کرام کا اللہ حامی وناصر ہو۔(آمین)

محترمہ قمر جمالی صاحبہ کے غیر افسانوی ادب پر تنقیدی جائزہ میری پہلی تحقیقی وتجزیاتی کوشش ہے۔ظاہر ہے کہ کسی بھی نئے کام کو مکمل کرنے میں ایک تو زیادہ وقت لگتا ہے اور دوسرا اس میں بہت سی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔میری قارئین سے یہی توقع ہے کہ ایک تو تمام غلطیوں کی نشاندہی کی جائے اور دوسرا میری اس پہلی کوشش کو سراہا جائے۔تاکہ آئندہ بھی ایسے کاموں کو سرانجام دے کر اپنے تحقیقی سفر کو جاری رکھ سکوں۔

بصد شکریہ

سید فریاد (ریسرچ اسکالر)

شعبۂ اُردو،یونی ورسٹی آف حیدرآباد

باب اوّل

قمر جمالی: سوانح حیات و شخصیت

۱) خاندانی پس منظر:

قمر جمالی کا سلسلہ نسب ایک بڑے جید بزرگ حضرت سید جمال شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے ملتا ہے۔قمر جمالی کی والدہ اس خاندان کی ساتویں پشت سے تعلق رکھتی ہیں اور قمر اسی خاندان کی نواسی ہیں۔در اصل یہ خاندان تبلیغ اسلام کی غرض سے بخارا سے ہندوستان آیا اور نلگونڈہ Nalgonda کے موضع ایٹور میں سکونت پذیر ہوا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں بس کر رہ گیا۔ان کے مزار کی زیارت کے لیے میلوں دور دیہات اور شہر سے اپنی عقیدت کے والہانہ اظہار کے لیے لوگ جوق در جوق آج بھی چلے آتے ہیں۔آج بھی موضع ایٹور ضلع نلگنڈہ میں ان کے چھوٹے ماموں سید اسماعیل صاحب مرحوم کے مکان سے ہر سال عرس کا اہتمام بڑے جوش وخروش سے ہوتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ماموں کے مکان کے کونے کونے سے آج بھی درگاہ شریف کی ی خوشبو مہکتی ہے۔بچپن میں ہر سال وقت مقررہ پر ایٹور جایا کرتے تھے۔

قمر جمالی کے دادا کا نام محمد یعقوب شریف تھا گورے ہونے کی وجہ سے گھر والے انھیں لالن کے نام سے پکارتے تھے۔قمر جمالی کے نانا کا اسم گرامی سید وزیر علی اور نانی کا نام محمودہ بی بی تھا۔قمر جمالی کے نانا سید رزیر علی زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے ان کے پاس کافی زراعتی زمین تھی۔

قمر جمالی کے والد محترم کا نام محمد جمال شریف (مرحوم) تھا اور والدہ کا اسم افضل بی بی تھا۔قمر جمالی نے انٹرویو میں بتایا کہ ان کے والدین زراعت پیشہ تھے۔ان کے والد جمال شریف اور والدہ افضل بی بی کا تعلق موضع ایٹور سے رہا ہے جو آندھرا پردیش کی جدید تشکیل سے پہلے ضلع ورنگل کے تحت شمار کیا جاتا تھا اور اب ضلع نلگنڈہ کے تحت شمار کیا جاتا ہے۔قمر جمالی نے اپنی سوانح حیات کہیں چھپوائی نہیں بلکہ انھوں نے ریسرچ اسکالرز کو تحقیق کے دوران انٹرویو کے ذریعے جن باتوں کو پیش کیا ہے وہی مقالے کی زینت بنی ہوئی ہیں۔نیز ناچیز کو قمر جمالی نے مورخہ 2021ء کو ملاقات کا شرف بخشا،جس میں انہوں نے اپنی سوانح حیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کے والد اور والدہ مذہب کے پیروکار اور اعتقاد کے اعتبار سے سنی مسلک کے قائل تھے۔

قمر جمالی کے والد روشن خیال انسان تھے اور والدہ اس زمانے کی منشی کامل پڑھی ہوئی تھیں۔ فارسی زبان سے کافی واقفیت رکھتی تھیں فارسی کے محاوروں، روزمرہ، ضرب الامثال کا بہترین استعمال ان کی سرشت میں داخل تھا۔قمر جمالی کی والدہ بہت ہی منظّم قسم کی زندگی گزارنے والی خاتون تھیں۔ جب قمر جمالی کے والد کا انتقال ہوا تو ان کی والدہ نے اپنے اہل خانہ کی پرورش بڑے اچھے طریقے سے کی۔ وہ سلائی کڑھائی میں ماہر تھیں۔ دن رات انہوں نے تکلیف اٹھائی اور گھر کو سنبھالا۔

قمر جمالی کے والدین کی تین اولادیں ہوئیں تینوں لڑکیاں تھیں انھیں اولاد نرینہ نہ ہوئی۔ ان کی پہلی صاحب زادی قمر جمالی، دوسری طاہرہ سلطانہ اور تیسری ساجدہ سلطانہ ہیں۔قمر جمالی نے اپنے شوہر کے ساتھ حیدرآباد میں زندگی گزاری اور وہیں تحصیل داری کی ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔قمر کی بہن طاہرہ سلطانہ بھی مرزا احمد بیگ کے ساتھ حیدرآباد میں ہی بیاہی گئیں تھیں جو پچھلے پندرہ سالوں سے دوحہ (قطر) میں مقیم ہیں۔موصوفہ کی سب سے چھوٹی بہن ساجدہ سلطانہ کی شادی 1988ء میں حیدرآباد میں محمد عثمان سے ہوئی تھی ساجدہ دل کے عارضے کی وجہ سے 2006ء میں انتقال کر گئیں۔انھوں نے ایم-اے اردو کی ڈگری گولڈ میڈل کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی تھی اردو کے ساتھ ساتھ انھیں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی-ایڈ کی سند بھی حاصل ہوئی تھی بحیثیت اسکول ٹیچر انھوں نے زندگی کے ایام بسر کیے تھے۔چھوٹی بہن کی موت کا صدمہ آج بھی قمر جمالی کے دل کے کتبے پر کندہ ہے قمر جمالی بہن کی موت کے بارے میں پوچھے جانے پر کچھ یوں گویا ہوتی ہیں:

> ''میری تیسری بہن بہت ذہین تھی اس نے اردو ادب میں ماسٹر کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ایم-فل کیا، بی-ایڈ کیا جس کے بل بوتے پر اسے سرکاری فوقانیہ مدرسے میں ملازمت مل گئی مگر عمر نے وفا نہ کی عین جوانی میں دل کے عارضے سے 2006ء میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئی اس کی صورت میرے دل کی رہی سہی تری بھی اڑا لے گئی میں نے اپنے والد اور والدہ کی موت کا صدمہ برداشت کر لیا تھا مگر اس کی موت آج بھی میری آنکھوں کے سامنے تازہ ہے بالکل ابھی ٹھہرے لمحے کی طرح نہ وقت گزرتا ہے اور نہ وہ منتظر نظروں سے اوجھل ہوتا ہے، میرا دل قبرستان بن گیا ہے۔''(۱)

(ب) سوانحی خاکہ

۱) ولادت:

جمال شریف سیف اور افضل بی بی کے گھر میں دو اپریل 1950ء کو ایک لڑکی کی ولادت ہوئی جس کا نام قمر سلطانہ رکھا گیا جنھوں نے آگے چل کر اردو ادب میں قمر جمالی کے نام سے خوب شہرت پائی۔ قمر جمالی کی تاریخ پیدائش اسکول کے ریکارڈ کے مطابق 2 اپریل 1948 ہے جبکہ ان کی صحیح تاریخ پیدائش 2 اپریل 1950ء کی ہے ان کی تاریخ ولادت کے بارے میں پوچھے جانے پر قمر جمالی نے خود ہی بتایا ہے کہ:

> ''میری تاریخ پیدائش سرکاری ریکارڈ میں 22 اپریل 1948 ہے لیکن یہ تاریخ غلط ہے حقیقت میں میرا تعلق ایک زمیں دار گھرانے سے ہے میں اپنی والدہ اور بہنوں کے ساتھ حیدرآباد میں تھی اور میرے والد ذمہ داری کے لیے ایٹور میں رہتے تھے جب میرا داخلہ اسکول میں ہوا تو میری والدہ نے یہ ذمہ داری میرے ایک ٹیچر کو دی انھوں نے غلطی سے 1950ء کے بجائے 1948ء لکھوا دیا تھا جو کہ درست نہیں ہے میری صحیح تاریخ پیدائش 2 اپریل 1950ء ہے۔'' (۲)

اس طرح قمر جمالی کے اس بیان کے مطابق ان کی صحیح تاریخ پیدائش 2 اپریل 1950ء ہے اور اس تاریخ پیدائش کی کہیں سے کوئی اور رائے موصول نہیں ہوئی۔

۲) تعلیم و تربیت:

قمر جمالی کی ابتدائی تعلیم کا سفر حیدرآباد سے شروع ہوا تھا یہاں پرائمری درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مارچ/1964ء میں گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کاچی گوڑہ (Kachiguda) سے میٹرک کا امتحان اچھے نمبرات سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد والد محترم کا شفیق سایہ سر سے اٹھ گیا مگر قمر جمالی نے اپنا تعلیمی سفر بلا کسی تردد کے جاری رکھتے ہوئے پہلے بی-اے (English,Sociology,Economics) عثمانیہ یونیورسٹی سے کیا۔ اس کے بعد بعد ایم-اے انگلش لٹریچر میں اسی یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہی تھا کہ محکمہ مال گزاری (Revenue Department) میں 1975/05/05ء کو سرکاری ملازمت

مل گئی۔Revenue Department میں بحیثیت جونیئر اسسٹنٹ ملازمت اختیار کرتے ہوئے تحصیلدار کے عہدے پراس جلیل القدر منصب سے 2006ء کوسبکدوش ہوئیں اوراس کے بعد ایم-اے فارسی 2008ء میں جامعہ عثمانیہ سے مکمل کیا۔وہ اپنے ذوق کی تکمیل کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔قمر جمالی کے والد اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں روشن خیال تھے اس لئے انھوں نے انہیں حیدرآباد میں رکھا اوران کی تعلیم کا بہترین انتظام کیا۔قمر جمالی کی تعلیم کے سلسلے میں ان کے والد اور والدہ دونوں ہی کا بڑا ہاتھ رہا ہے اورآج وہ جو کچھ بھی ہیں انھی کی دعاؤں کے طفیل ہیں۔

۳)ملازمت وسبکدوشی:

والد کے انتقال کے بعد قمر جمالی شب وروز متفکر رہتی تھیں کہ کس طرح گھر والوں کی کفالت کی جائے لہٰذا انھوں نے زمانہ طالب علمی میں ہی ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا تھا جس کی بدولت انھوں نے گھریلو ذمہ داریوں کو بڑی خوبی سے انجام دیا اوراپنی پڑھائی بھی جاری رکھی جوں جوں ذمہ داریاں بڑھتی گئیں ان کے نوکری کرنے کا فیصلہ بھی پروان چڑھتا گیا اورٹیچر ز ٹریننگ کورس کرکے ایک پرائیویٹ اسکول میں بحیثیت مدرسہ ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔اس کے بعد محکمہ مال گزاری(Revenue department)میں 1957/ 05/ 05 کو جونیئر اسسٹنٹ کے منصب پر فائز ہوئیں اورانھوں نے 31 سال تک یہ خدمات انجام دیں۔ان 31 سالوں میں وہ مختلف عہدوں پر فائز رہیں اورترقی کرتے ہوئے تحصیل دار کے عہدے تک جا پہنچیں اوراسی اعلیٰ منصب سے اپریل 2006ء میں سبکدوش ہوئیں۔ریٹائرمنٹ کے بعد ایم-اے فارسی جامعہ عثمانیہ سے 2008ء میں مکمل کیا۔اپنی ملازمت حاصل کرنے کے بارے میں قمر جمالی یوں رقم طراز ہیں:

> ''ابتدا ہی سے ہم استانی بننے کے خواہش مند تھے ٹریننگ بھی لے لی مگر رزق کا دینے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔ع:
>
> ''دیتا ہے دینے والا جانے کہاں کہاں سے''
>
> کے مصداق اوپر والے نے ہمارے رزق کا ذریعہ محکمہ مال گذاری سے جوڑ رکھا تھا جہاں ہم نے 30 سال ملازمت کی اور بحیثیت تحصیلدار ریٹائر ہوئے۔ان 30 سالوں میں ہم نے اپنی ذمہ داریوں کو مقدور بھر نبھایا بلکہ ضرورت سے زیادہ حق ادا کیا جس کا حکومت آندھرا پردیش نے اعتراف بھی کیا اور 2002ء میں ہمیں ریاست کی طرف سے(MRO)بیسٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔''(۳)

ریٹائرمنٹ کے بعد 2008ء میں (Noises Junior College) ٹولی چوکی حیدرآباد سے پرنسپل شپ کا آفر ملا جو انھوں نے قبول کرلیا کیونکہ ابتدا ہی سے انھیں درس وتدریس کے شوق نے گرویدہ بنا رکھا تھا اس بات کا اعتراف انھوں نے ناول" آتش دان" میں یوں کیا ہے:

''ریٹائرمنٹ کے بعد ڈرامائی انداز میں ہمیں ایک جونیئر کالج میں پرنسپل شپ ملی۔ ڈرامہ اس طرح کہ ہم اپنے بھانجے کے ایڈمیشن کے سلسلے میں کالج گئے تھے۔ پتانہیں انھیں ہماری کون سی ادا پسند آئی یا پھر حکمِ خدا تھا کہ فون پہ ہمیں پرنسپل شپ کی آفر ملی جو ہم نے بلاتردد قبول کرلی۔ کیونکہ ابتدا ہی سے ہم استانی بننے کے خواہش مند تھے۔''(۴)

اس طرح 2008ء سے 2010ء تک وہ پرنسپل کے فرائض اس کالج میں انجام دیتی رہیں۔

۴)ازدواجی زندگی اور اولاد:

قمر جمالی 22/اکتوبر 1978ء کو حیدرآباد میں محمد محمود حامد سے رشتہ ازدواج سے منسلک ہوگئیں۔محمود حامد بذات خود بھی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔"سر اٹھایا تھا" (نومبر 1998ء)۔"محراب" (مارچ 2006ء)۔اور "طاس"(دسمبر 2007ء)ان کے افسانوی مجموعے ہیں جو کتابی شکلوں میں چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔موصوف صدر مجالسی اکاؤنٹینٹ جنرلز آفس حیدرآباد کے اعلی عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔دونوں کی ازدواجی زندگی بڑی خوش گوار رہی ہے۔قمر جمالی بھی اپنے شوہر سے بے انتہائی لگاؤ رکھتی تھیں اور محمود حامد بھی ان کا بے حد خیال رکھتے تھے دونوں میاں بیوی میں دوستانہ تعلقات قائم رہے۔لیکن محمود حامد سے قمر جمالی کی رفاقت ملازمت سے سبکدوشی کے بعد زائد برسوں تک نہ رہ سکی کیونکہ 2017ء میں بیمار ہوکر محمود حامد چل بسے۔

قمر جمالی اور محمود حامد دونوں کو نہ صرف لکھنے سے دلچسپی رہی ہے بلکہ دونوں نے سماجی اور فلاحی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ مختلف سیمیناروں اور کانفرنسوں میں بھی شرکت کی ہے۔بیرونی ممالک سفر کا ارادہ کرکے ادبی سرگرمیوں کو بڑھاوا دیا ہے۔اس طرح ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ سماج اور معاشرے کی خدمت بھی ان دونوں میاں بیوی کا امتیازی وصف رہا ہے۔

۵)اولاد:

قمر جمالی اور محمود حامد صاحب کی تین لڑکیاں ہیں اور کوئی لڑکا نہیں ہے۔ بڑی لڑکی صبا کونین ہے جو امریکہ میں ملازم ہے۔2006ء میں ان کی شادی حیدرآباد کی ایک جانی پہچانی فیملی میں ہوئی تھی ان کے شوہر محمد احمد

خان بھی بیرون ملک میں ایک بینک میں کام کرتے ہیں اس طرح دونوں ہی بیرون ملک بلکہ امریکہ میں ہی ہیں۔دوسری لڑکی کا نام نشا نورعین ہے وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر ہیں ان کی شادی 2006ء میں محمد اشفاق علی سے حیدرآباد میں ہوئی وہ خود بھی ایک ملٹی نیشنل فرم میں ملازم ہیں۔قمر جمالی کی تیسری لڑکی شمادرین نے B-Tech ہندوستان سے اور انگلینڈ سے MoS کیا ہے۔وہ بھی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کر رہی ہیں اور یہ وہیں انگلینڈ میں قیام پذیر ہیں۔اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قمر جمالی کا خاندان ایک اعلیٰ تعلیمی خاندان ثابت ہوا ہے۔ایک طرف تو وہ اپنے سارے خاندان کو سنبھال رہی تھیں تو دوسری طرف اپنے محکمے میں جہاں وہ ملازمت کرتی تھیں ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتی جارہی تھیں۔انھوں نے اپنی تینوں لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم سے نوازا ہے۔اتنی ساری حرکیاتی زندگی کے باوجود بھی وہ ادب سے لگاؤ رکھتی ہیں جو اردو افسانے اور ڈرامے کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

ج)شخصیت:

شخصیت کا لفظ بہت وسیع ہے۔انسان کی سیرت اور کردار سے شخصیت بنتی ہے لفظ شخصیت انگریزی میں prerson کو کہتے ہیں جو لاطینی لفظ persona سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مطلب وہ مکھوٹا یا مصنوعی چہرہ جو ڈرامے کے کردار ڈرامہ کرتے وقت چہرے پر لگاتے ہیں۔گویا اس سے ظاہری شکل وصورت مراد لی جاتی ہے لیکن ایک مکمل شخصیت انسان کی ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی خصوصیات کا مجموعہ ہوتی ہے کسی بھی شخصیت کے عناصر ترکیبی میں اس کے ظاہری خدوخال، سراپا، انداز واتوار، چال ڈھال، مزاج، عادات، خیالات، نظریات اور رویے وغیرہ شامل ہوتے ہیں پھر اس شخصیت کی زندگی میں پیش آنے والے کچھ حالات وواقعات بالخصوص بچپن اور جوانی سے متعلق گھر اور معاشرے کے ماحول، سماجی، معاشی رویے اور کچھ دیگر شخصیات کے اثرات بھی اس فرد کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔قمر جمالی کی شخصیت سازی میں بھی مذکورہ بالا عوامل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔اس طرح ان کی شخصیت کا عکس اور اثرات ان کے فن میں بھی پوری طرح در آئے ہیں۔قمر جمالی کی شخصیت کی ساخت وپرداخت اور ان کی شخصیت کو تشکیل دینے میں جہاں بہت سے خارجی اور داخلی عناصر کارفرما تھے وہیں ان کی زندگی کے حالات وتجربات اور پھر عصری اثرات نے بھی ان کی شخصیت کے ارتقا میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

قمر جمالی ایک اچھی افسانہ نگار ہیں ساتھ ہی اہم شخصیت ہونے کے باوجود ان کی شخصیت میں میں، تکبر، تصنع اور بناوٹ کے بجائے سادگی ہے جو ان کے پہناوے، بات چیت اور انداز و اطوار سے صاف دکھتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شخصیت کی ظاہری جھلک شخصیت کے بارے میں ایک فیصلہ کن تاثر قائم کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ شخصیت اور فن کے حوالے سے قمر جمالی کی تحریریں ہم جیسے جیسے پڑھتے جاتے ہیں ان کی شخصیت کے رنگارنگ پہلو ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک شخص کو شخصیت بنانے میں، ایک خاص سانچے میں ڈھالنے میں سب سے پہلے والدین کی تربیت کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ قمر جمالی پر ان کے والد کی کشادہ ذہنی کا کافی اثر رہا ہے۔

نفسیات، مزاج، عادات اور رویوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے میں انسان پر جہاں داخلی و خارجی حالات و واقعات کا گہرا اثر ہوتا ہے وہیں اس سے اپنی زندگی میں چند ایسی شخصیات سے ضرور واسطہ پڑتا ہے جو نہ صرف اس کے خیالات اور کردار پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں بلکہ ان شخصیات کے اثرات اس کی اپنی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ قمر جمالی کی شخصیت کی اس انفرادی نہج کی نشو و نما میں بھی بہت سی شخصیات نے اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ سب سے پہلے ان کے اپنے والدین کی شخصیت کے گہرے اثرات ان کی اس نشو و نما میں محرک بن گئے ہیں۔ ایک محفل میں قمر جمالی کی ملاقات علامہ حیرت بدایونی سے ہوئی۔ اس محفل میں قمر نے کہانی سنائی تھی جس کو حیرت بدایونی نے بہت پسند کیا مگر وہاں پر بیٹھے تقریباً سبھی لوگوں کا ماننا تھا کہ یہ قمر کی خود کی تخلیق نہیں ہے۔ اس بات کی وضاحت ڈاکٹر راج بہادر نے اپنے مضمون بعنوان "قمر کی کہانیاں" میں کچھ اس طرح کی ہے:

> ''ایک دن محفل سجی جس میں علامہ حیرت بدایونی بھی شریک تھے۔ قمر نے جو ابھی کم عمر ہی تھی اس محفل میں اپنی پہلی کہانی سنائی۔ لڑکوں نے آوازے کسے کسی سے لکھوائی ہے؟ تم تو ابھی بچی ہو وغیرہ۔ کہانی ختم ہوئی اور قمر روتی ہوئی اسٹیج سے اتری۔ علامہ حیرت بدایونی نے اس کی پیٹھ ٹھونکی کہا بیٹی یہ تو ہوتا ہی ہے ایسے تجربوں سے ہی گزرنا ہوگا۔'' (۵)

قمر جمالی کی شخصیت کو پروان چڑھانے میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا اہم نام ہے۔ مصنفہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھیں۔ قمر جمالی کو ان میں انسانیت کا وہ نمونہ نظر آتا ہے جو قابل تقلید ہے۔ وہ

ان کی بے پناہ عزت کرتی تھیں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے ہر وقت قمر کی حوصلہ افزائی کی جس کی بدولت شخصیت میں نکھار پیدا ہوا ہے۔ انھوں نے اس ہمت و حوصلہ افزائی کا اعتراف کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''میں احسان مند ہوں اس حسن اتفاق کی جس کی بنا پر مسودہ" شبیہ "پر محترم جناب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب جیسے اردو داں کی رائے حاصل ہوئی۔ کیونکہ ایک بار اخبار میں میری ایک کہانی کا ریویو پڑھ کر انھوں نے تذکرۃ مجھ سے کہا تھا بھئی قمر جمالی تمہاری وہ کون سی کہانی ہے جس کے بارے میں اخبار میں یوں لکھا ہے؟ بس دو تین دن بعد وہ سارے مسودے جو شبیہ میں شامل ہیں لے کر ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پہنچ گئی۔ میں تو بہت سہمی ہوئی تھی کہ میری اس جرات پر ڈاکٹر صاحب ضرور کوئی منفی تاثر لیں گے مگر انہوں نے میرا کچھ ایسا خیر مقدم کیا کہ بس ایک باپ ہی اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔''(۶)

قمر جمالی کو زمانہ طالب علمی سے ہی پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا زیادہ تر انگریزی ادب کا مطالعہ کرتی تھیں جس کے باعث ان کے خیالات وافکار میں کافی وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہوا۔ انگریزی ادب کے مطالعے کے باعث ان کے اسلوب میں جدت طرازی کا حسن پیدا ہوا۔ انجمن ترقی ہند مصنفین سے منسلک ہونے کے باعث قمر کی شخصیت اور فن پر اس کا کافی اثر رونما ہوا ہے۔ قمر جمالی ایک جامع شخصیت کی مالکہ ہیں وہ نہایت خوش مزاج، نیک سیرت، بلند خیال اور سنجیدہ خاتون ہیں۔

قمر جمالی کی طبیعت میں نرمی، ہمدردی اور توازن ہے۔ ان کے اخلاق و عادات متاثر کن ہیں۔ قمر معتدل مزاج اور شریف النفس خاتون ہیں۔ قمر جمالی باشعور، حساس، ذہین اور ذہنی پختگی کی حامل شخصیت کے طور پر بآسانی مشہور ہیں۔ قمر کی شخصیت کا سب سے لائق تحسین اور غالب پہلو یہ ہے کہ ان کے ظاہر اور باطن میں کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔ اس طرح وہ نہ صرف ایک اچھی انسان بنیں بلکہ ایک بہترین افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی انھوں نے خوب شہرت حاصل کی۔

ا) حلیہ:

قمر جمالی کا حلیہ کچھ اس طرح ہے، سانولی رنگت مگر کھڑا چہرہ، لمبی ناک، مناسب آنکھیں، پر کشش چہرہ،

مناسب قد اور مناسب جسامت، لہجہ میٹھا اور دل لبھانے والا، آواز نرم اور پر کشش، غرض قمر جمالی کی شخصیت میں عجیب سی رعنائی ہے اگر کوئی ان سے ایک بار ملاقات کر لیتا ہے تو بار بار ملنے کا متمنی رہتا ہے۔ڈاکٹر بانو خالدہ سعید نے قمر کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے:

''سانولی سلونی خوبرو خوش قامت ملنسار متبسم لڑکی کا نام قمر جمالی تھا۔سرکاری ملازمت
کے ساتھ ساتھ ان کا ادبی ذوق باعث تعجب اور قابل تحسین تھا۔''(۷)

۲)غذا:

قمر جمالی کا ماننا ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی کوئی نعمت خراب نہیں ہوتی۔قمر جمالی زیادہ تر سادہ غذا کھانے میں پسند کرتی ہیں اس کی کئی وجوہ ہیں۔ان کی بڑی نند گھر میں اکثر بیمار رہتی ہیں۔وہ آرتھرائٹس کی بیمار ہیں اور ان کے شوہر کو بھی کڈنی پرابلم ہے۔اس لئے سادہ غذا کو ہی قمر جمالی اور ان کی فیملی پسند کرتی ہے۔اس بات سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ قمر جمالی اور ان کے اہل خانہ بہت ہی معتدل انداز میں زندگی گزارتے ہیں ان کے گھر میں سیدھے سادے معیار زندگی کو پسند کیا جاتا ہے۔

۳)معمولات زندگی:

قمر جمالی ایک معتبر ادیبہ ہی نہیں بلکہ ایک ذمہ دار خاتون بھی ہیں ان کی دن بھر کی مصروفیت یوں ہے۔ان کی صبح اذان سے شروع ہوتی ہے اور صبح 07:00 بجے تک تلاوت قرآن پاک کے بعد مختلف وظائف پڑھتی رہتی ہیں پھر ناشتہ پکوان اور دیگر ذمہ داریوں کو پورا کرتی ہیں۔شام آٹھ ساڑھے آٹھ سے نو یا دس بجے تک گھر والوں کے ساتھ بیٹھتی ہیں، ٹی وی دیکھتی ہیں اور اپنے کمرے میں چلی جاتی ہیں اور پھر عشاء کے بعد لکھتی پڑھتی ہیں ہر رات 12 بجے تک جاگتی ہیں اس کے بعد ہی سوتی ہیں سونے سے پہلے اپنی دونوں بیٹیوں اور نواسیوں سے بات کرتی ہیں کبھی کبھی اپنی بہن سے بھی۔لکھتے وقت کے بارے میں پوچھے جانے پر انہوں نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ:

'' لکھنے پڑھنے کے لیے مجھے کوئی خاص وقت کی ضرورت نہیں ہوتی گھر کے کام کاج کے
درمیان آرام سے لکھتی بھی رہتی ہوں کام بھی کرتی ہوں۔''(۸)

۴)لباس:

قمر جمالی بہت سادہ لباس پہنتی ہیں ان کو سوت اور ریشم بہت پسند ہے۔اس لئے ان کے یہاں اسی فیصد ساڑیاں یا تو سوتی ہیں یا ریشمی۔ باقی بیس فیصد قیمتی۔ وہ بھی کسی شادی بیاہ کے موقع کے لیے خریدی گئی ہوں تو استعمال کرتی ہیں۔اکثر شادیوں میں بھی وہ سیدھی سادی ریشم کی ساڑی پہنتی ہیں۔

۵) آرائش وزیبائش:

قمر جمالی آرائش وزیبائش کا خاص خیال نہیں رکھتیں۔ان کو لپسٹک لگانا بہت پسند ہے لیکن یہ عادت بھی انھیں شادی کے بعد ہوئی ہے اس کی اصل وجہ یہ رہی ہے کہ ان کی والدہ نے اس طرف کم ہی توجہ دلائی تھی کیونکہ وہ بھی سادہ لوح شخصیت تھیں اس لیے اپنی لڑکیوں کو بھی ان چیزوں سے دور ہی رکھا۔زیورات میں ان کو سچے موتی اور قیمتی پتھر کا زیور بہت پسند ہے۔سونا پسند نہیں ہے۔اکثر عورتیں سونے چاندی کے زیورات پہننا پسند کرتی ہیں۔لیکن انھیں قیمتی پتھر اور موتی کے زیور ہی پہننا زیادہ پسند ہے۔وہ ملازمت کے زمانے میں کلف کی ساڑیاں اور بالوں کا جوڑا پہنا کرتی تھیں دراصل وہ ملازمت پسند خاتون تھیں اور ایسے عہدے پر تھیں جہاں انھیں آرائش وزیبائش کا خیال رکھنا زیب نہیں دیتا تھا اس لئے ان کے لباس اور ان کے زیورات سے ہی ان کی باوقار اور پرکشش شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۶)نظم ونسق:

قمر جمالی مشہور ومعروف ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اصول پسند اور نظم ونسق کی پابند خاتون بھی ہیں جو ان کے تشخص میں اور بھی زیادہ نکھار پیدا کرتا ہے۔اپنے پیشے کے نظم ونسق کو بحسن وخوبی اس طرح نبھایا ہے کہ وہ ان کی زندگی کا معمول بن کر ان کی گھریلو زندگی میں بھی اپنی تاثیر چھوڑ گیا۔آج ایک دہائی کے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ گھر کے چھوٹے بڑے کاموں کو شیڈیول کے ساتھ انجام دیتی ہیں۔انٹرویو کے دوران اس بات پر غور کیا کہ وہ ہر چیز کو نہایت قرینے سے رکھنا پسند کرتی ہیں اور دیگر افراد خانہ کو بھی اصولوں پر چلنے کی بار بار تلقین کرتی رہتی ہیں۔

قمر جمالی بہت Strict Officer رہیں ہیں۔وقت کی پابندی ان کے لئے بہت اہم ہے۔وہ اپنے assistants کو وقت پر آنے اور وقت پر جانے کی تلقین کیا کرتی تھی۔نظم ونسق کے معاملے میں وہ اپنے بچوں کو بھی discipline میں رہنے کی

سخت تلقین کرتی ہیں۔عورت کو discipline میں رہنا بہت ضروری ہے عورت کئی رشتوں میں جیتی ہے ایک عورت نظم ونسق کی عادی ہوتو پورا گھر disciplinised ہوتا ہے اگر عورت میں discipline نہ ہوتو وہ گھر بے معنیٰ ہے۔

۷)مشرقی اقدار کی پاسداری:

قمر جمالی مشرقی اقدار کی پاسداری کرنے والی خاتون ہیں۔ وہ سب کے ساتھ بڑے خلوص وحمیت اور شائستگی سے پیش آتی ہیں۔ بڑوں کا ادب واحترام اور چھوٹوں سے محبت ومشفقانہ برتاؤ اور دوست واحباب کے ساتھ مخلصانہ و ہمدردانہ رویہ رکھتی ہیں۔ قدیم تہذیبی روایات کو انھوں نے جانے نہ دیا یہی وجہ ہے کہ سب ان سے محبت کرتے ہیں اور ان کا احترام بھی کرتے ہیں۔فریدہ زین بھی حیدرآباد کی ایک معروف افسانہ نگار ہیں۔قمر جمالی سے ان کے گہرے دوستانہ مراسم ہیں وہ ان کی شخصیت کی اس خوبی کے بارے میں اپنے ایک انٹرویو میں یوں بتاتی ہیں:

> ’’قمر جمالی سے میری دوستی تیس سالہ عرصے پر محیط ہے۔ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔مگر قمر کے ہاتھوں چپو تیزی سے چلتا ہے گرداب وگردش کے خطرے سے بے نیاز اس نے بہت جلد ادب میں مقام بنالیا جس کی مجھے بے حد خوشی ہے وہ ادب کی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہے۔اس کے باوجود کسی برتری کے احساس کے بغیر وہ مجھ سے بے پایاں محبت رکھتی ہے۔ میرے ہر غم کے لمحے کو سمیٹ لیتی ہے ہر تکلیف میں وہ چارہ گر بن جاتی ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جب بھی کسی محفل میں میرے شریک رہی ہمیشہ یہ کہا" فریدہ مجھ سے سینئر ہے مگر میری پیاری دوست ہے، اس کا طرز تخاطب دل میں جگہ بنالیتا ہے شاید میرے اور اس کے درمیان یہی اساس ہے۔‘‘(۹)

قمر جمالی سب کے ساتھ خلوص و ہمدردی کا جذبہ رکھتی ہیں ہر کسی سے ملنساری کے ساتھ ملتی ہیں۔ایک تخلیق کار کے مزاج میں یہ عناصر پائے جانا بہت ضروری ہیں۔اس لیے انھیں ادب کی دنیا میں محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

۸)معاصرین کے ساتھ برتاؤ:

قمر جمالی ہمہ جہت شخصیت رکھتی ہیں۔ایک انسان، ایک استاد، ایک شاگرد، ایک دوست، ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ہمیشہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہی ہیں۔بطور انسان وہ بڑی رواداری اور محبت کرنے والی شخصیت ہیں۔ معاصرین کے ساتھ قمر جمالی کا رویہ ہمیشہ دوستانہ رہا ہے۔انھوں نے حسد اور جلن سے ہمیشہ خود کو دور رکھا ہے۔ وہ ہر کسی سے بڑی فراخدلی سے ملتی ہیں

کسی صلہ اور ستائش کی پرواہ نہیں کرتیں اور یہی وجہ رہی ہے کہ معاصرانہ چشمک سے ہمیشہ دور رہی ہیں۔ خاموشی سے ادب کی خدمت میں مصروف رہی ہیں۔ وہ ترقی پسند مزاج کی حامل ہیں لیکن اپنے ہم عصر شاعر، نثر نگار، نقاد اور محققین کی قدر کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کبھی بھی کسی قسم کی چشمک سے خود کو دور رکھا ہے یہی ان کی خوبی ہے۔

۹) بحثیت ناظم جلسہ:

قمر جمالی ایک افسانہ نگار ہیں انھیں اکثر جلسوں کی نظامت کی ذمہ داری دی جاتی تھی۔ چنانچہ کسی جلسے کی کامیابی کا انحصار نظامت کرنے والی شخصیت پر بھی ہوتا ہے جب نظامت اچھی ہوتی ہے تو سامعین بھی جوش وخروش کے ساتھ جلسے کو سنتے ہیں۔ قمر جمالی بھی ایک بہترین ناظم جلسہ ہیں، ان کی آواز اور لہجہ اتنا متاثر کن اور سحر انگیز ہوتا ہے کہ سامعین محظوظ ہو کر سنتے ہیں۔

۱۰) قمر جمالی بحثیت بیٹی/ بہن:

قمر جمالی کے والدین کے یہاں تین بیٹیاں ہوئیں۔ قمر جمالی اپنے والدین کی فرمانبردار اور سب سے بڑی بیٹی ہیں۔ ان پر گھر میں سب سے بڑی بیٹی ہونے کی وجہ سے بڑی ذمہ داریاں بھی آن پڑیں مگر انہوں نے ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھایا۔ جس وقت قمر جمالی کے والد صاحب کا انتقال ہوا انھوں نے انھی دنوں میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ بڑی بیٹی ہونے کے باعث نہ صرف ان کو اپنی پڑھائی کا خیال رکھنا تھا بلکہ اپنی ماں اور بہنوں کو بھی دیکھنا تھا۔ انہوں نے بڑی دلیری سے اپنی ماں اور بہنوں کا خاص خیال رکھا۔ اپنی دونوں بہنوں کو دینی اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کیا اور خود بھی اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہوئیں۔ وہ ہمیشہ سے اپنی بہنوں کو مشفقانہ نگاہوں سے دیکھتی رہیں اور ان کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا۔ وہ بڑی متانت اور شائستگی سے اپنی بہنوں کو سمجھاتی رہیں۔ لہجے سے نصیحت آموز باتیں ہمیشہ میٹھے چشمے کی طرح نکلتی ہیں جو دلوں کو ایک دم موہ لیتی ہیں اس تناظر میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ’’آسان نہیں ہوتا ایک سولہ سترہ سالہ لڑکی کا اچانک سے سرپرست بن جانا مگر اپنی ماں کی رہبری میں میں نے یہ مرحلہ بڑی آسانی سے سر کیا۔ جس تگ و دو میں میں نے اپنی زندگی کا موسم دیکھا میں نے دو ہی موسم جئے بچپن اور بزرگی والا۔ میری دوسری بہن بھی ماشائاللہ خوب پڑھی تیسری اور چھوٹی بہن بھی بہت ذہین تھی اس نے اردو ادب میں ماسٹرز کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ایم-فل کیا، بی-ایڈ کیا جس کے بل بوتے پر اسے

سرکاری فوقانیہ مدرسہ میں ملازمت مل گئی مگر عمر نے وفا نہ کی۔عین جوانی میں دل کے عارضے سے 2006ء میں چل بسی۔اس کی موت میرے دل کی رہی سہی تری بھی اڑا گئی۔میں نے اپنے والد اور والدہ کی موت کا صدمہ برداشت تو کرلیا مگر اس کی موت آج بھی میری آنکھوں کے آگے تازہ ہے۔ بالکل ابھی ٹھہرے لمحے کی طرح۔وقت گزرتا ہے اور نہ وہ منظر نظروں سے اوجھل ہوتا ہے میرا دل قبرستان بن گیا۔''(۱۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر خزاں کے بعد بہار لازمی ہے اور ہر کامیابی کو مشکلات و مصائب کی راہوں سے گزر کر ہی منزل کا حصول ہوتا ہے اور یہ کہ انسان وقت کے ساتھ ہی کچھ کھوتا اور کچھ پاتا ہے ان سب چیزوں کے علاوہ محبت ایک ایسی لازوال چیز ہے جو اپنوں کے احساس کو ہمیشہ کے لئے تابندگی عطا کرتی ہے۔

۱۱)بحثیت بیوی

بیوی ایک عظیم رشتے کا نام ہے جس کے بغیر زندگی ادھوری تصور کی جاتی ہے یہی بیوی جب نیک، اخلاق وکردار سے متصف ہوتی ہے تو زندگی جنت کی مہک کی مانند ہو جاتی ہے۔اخلاق وکردار کے ساتھ ساتھ جب بیوی میں عالمانہ تدبر اور تفکر ہو تو یہ عظیم رشتہ اور بھی زیادہ استوار ہو جاتا ہے۔قمر جمالی کی شخصیت کا اگر بحثیت بیوی تجزیہ کیا جائے تو ان کی زندگی کا پیمانہ ہر لمحہ احساس خودی اور احساس فرمانبرداری سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔قمر جمالی ایک وفادار، شوہر پرست، نیک سیرت اور فرماں بردار بیوی ہیں۔وہ اپنے شوہر کا ہر وقت خیال رکھتی ہیں وہ ایک ملازمت پیشہ خاتون ہونے کے باوجود بھی اپنے گھریلو فرائض سے غافل نہ رہیں۔شوہر کا حد درجہ خیال رکھنا اور ان کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھنا بڑی ہی نرمی اور انکساری سے بات کرنا اور ان کی بیماری میں ان کا بھرپور خیال رکھنا بحثیت بیوی وہ اپنا فرض سمجھتی ہیں۔محمود حامد قمر جمالی کو بحثیت بیوی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''قمر بحثیت بیوی پرفیکٹ بیوی ہیں تمام باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں جو بھی ضروریات ہیں ان کو بخوبی انجام دیتی ہیں۔قمر اچھی مصنفہ کے ساتھ ساتھ اچھی بیوی بھی ہیں۔1978ء میں ہماری شادی ہوئی آج تک ہم میں کوئی جھگڑا نہیں ہوا قمر بیانیہ کہانی لکھتی ہیں اور میں abstract اس کے باوجود بھی ان کی کہانی کا پہلا قاری اور مبصر میں رہتا ہوں اور میری کہانی کی پہلی قاریہ اور مبصرہ وہ رہتی ہیں۔ہم لوگ اپنے گھر

میں ہی اپنی چیزوں کی تنقید کر لیتے ہیں، تبصرے کر لیتے ہیں کچھ خامیاں ہوتی ہیں تو
اسے دور کر لیتے ہیں اکثر لوگ کہتے ہیں کہ بیوی شوہر سے تھوڑا آگے چلی جائے تو شوہر
کو jealousy فیل ہوتی ہے۔ مجھے نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی ترقی میں
میری ترقی مضمر ہے۔''(۱۱)

۱۲) بحیثیت ماں:

ماں اللہ کی عظیم اور شفیق تخلیق ہے اور اس لفظ میں اللہ نے محبت اور شفقت کا ایک عالم بھر دیا ہے ماں کے بارے میں حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ محبت اور شفقت ہر ماں کی سرشت میں داخل ہوتی ہے۔ جو ماں علم کے زیور سے آراستہ ہو اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ تمام اوصاف سے متصف ہو تو گھر کو جنت نما بنا دے گی اور ایسا ہی کچھ قمر جمالی کا معاملہ ہے۔ قمر جمالی اپنے بچوں کی خوشیوں کا ہر وقت لحاظ رکھتی ہیں ان کے سکھ میں شریک ہوتی ہیں اور ان کے دکھوں کو حتی الامکان سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں کیونکہ وہ چاہتی ہیں کہ زندگی میں جن سنگلاخ راہوں سے انھیں گزرنا پڑا وہ ان کے بچوں کو ہرگز نہ جھیلنا پڑیں۔ قمر جمالی میں محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے بحیثیت ماں وہ نہایت شفقت و محبت کرنے والی اور اپنوں پر جان چھڑکنے والی ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی خوشیوں کا بھرپور خیال رکھتی ہیں۔ اس چیز کا خیال رکھتے ہوئے وہ اپنے بچوں کو عنایتوں اور مہربانیوں کے گہوارے میں پروان چڑھانا چاہتی ہیں۔ تاکہ انہیں ہر وہ خوشی میسر آجائے جو بچپن میں انہیں نصیب نہ تھی اسی لیے وہ بچوں کی خوشی کو اپنی ہر خوشی پر مقدم سمجھتی ہیں۔

۱۳) بحیثیت دوست:

دوستی ایک عظیم رشتہ ہے جو انسان خود بناتا ہے اور خود نبھاتا ہے۔ دوستی میلان روح کی ایک صورت ہوتی ہے۔ قمر جمالی بھی اس عظیم اور مقدس رشتے کو بہت ہی خلوص سے نبھاتی ہیں۔ وہ اپنے دوستی کے رشتے کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیتیں۔ مرد حضرات ہوں یا خواتین سب کے ساتھ مخلصانہ اور مسکراتا برتاؤ رکھتی ہیں۔ جن سے ان کی دوستی ہے وہ لوگ بھی ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ فریدہ زین، فریدز ماں، مجید بیداد اور حیدرآباد کی اہم شخصیتوں کی آراء میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کی دوستی اور اپنوں سے محبت کا جذبہ قدر و اہمیت کا حامل ہے بہت کم شخصیتوں میں یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ پروفیسر مجید بیداد اور فریدہ زین کے علاوہ ڈاکٹر اودیش رانی کے مطابق قمر جمالی کی انسان دوستی اور اقربا پروری اپنی مثال آپ ہیں۔

۱۴)مہمان نوازی:

دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ قمر جمالی ایک اچھی مہمان نواز بھی ہیں مہمانوں کو کھلانا، پلانا ان کی فطرت میں داخل ہے وہ کھلے دل سے گھر آئے مہمانوں کی خاطر داری کرتی ہیں۔قمر مخلص میز بان ہونے کے ساتھ ساتھ فراخ دل اور اچھی مہمان نواز بھی ہیں یاسین احمد نے قمر جمالی کی مہمان نوازی کا اعتراف یوں کیا ہے:

> ''قمر جمالی گھر گرہستی چلانے میں بھی ماہر ہیں۔ایک مخلص میز بان بھی ہیں۔خاکسار کو ایک دفعہ ان کی قیام گاہ پر کھانا کھانے کا شرف حاصل ہوا تھا بڑے ہی مخلص انداز میں خاطر مدارات کرتی رہیں۔''(۱۲)

۱۵)ذمہ دار شخصیت:

قمر جمالی ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں ان کی سیرت میں مذہب بندی اور ہمدردی کا جذبہ شامل ہے۔ان کے کردار میں اعلیٰ ظرفی چھپی ہوئی ہے بلاشبہ ان کی شخصیت میں ظاہر و باطن کا امتزاج نظر آتا ہے اور وہ ایک ذمہ دار خاتون ہیں۔بحثیت بیٹی/ بیوی/ ماں اور ایک آفیسر کے وہ اپنے فرائض بخوبی نبھاتی ہیں۔کسی جلسے کی جب انھیں ذمہ داری سونپی جائے تو وہ حسن سلیقہ کے ساتھ جلسے کی کارروائی بخوبی انجام دیتی ہیں۔گھر کی ذمہ داریاں ہوں یا آفس کی وہ کبھی غفلت نہیں برتتی ہیں انہیں اپنی ذمہ داری کا بخوبی احساس رہتا ہے۔فریدہ زین نے ان کے اس وصف کی ستائش کی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو دوسروں پر لادنے کی کوشش نہیں کرتی ہیں:

> ''قمر جمالی کی شخصیت کئی خانوں میں بٹی ہوئی ہے وہ سب کے ساتھ انصاف کرتی ہیں بہت باہمت، نڈر خاتون ہیں انھوں نے اپنے عہدے کا کبھی غلط استعمال نہیں کیا۔ بلند پایہ افسانہ نگار ہوتے ہوئے اپنی برتری نہیں دکھائی۔ انتظامی صلاحیتوں کی حامل ادبی جلسوں کی کارروائی بڑے ہی شائستہ انداز میں چلاتی ہیں۔ ذمہ داریوں سے کبھی غلط نہیں برتتیں۔ گھر گرہستی کے کاموں میں مکمل ذمہ داری کا احساس رکھتی ہیں۔ تیمار داری، مزاج پرسی میں سب پر سبقت لے جاتی ہیں۔ رشتوں کو مضبوطی سے باندھے رکھنے کا ہنر جانتی ہیں۔ میں نے کبھی انہیں غصے میں نہیں یکھا بڑی سمجھداری سے معاملے کو رفع دفع کر دیتی ہیں۔(۱۳)

حوالہ جات

(۱)۔شخصی انٹرویو،انٹرویور: سید فریاد،25 / مارچ2021ءدن جمعرات دو پہر02:53 بجے گنڈم گوڑہ حیدرآباد
(۲)۔شخصی انٹرویو،انٹرویور سید فریاد25 / مارچ2021ءدن جمعرات دو پہر12:53 بجے گنڈم گوڑہ حیدرآباد
(۳)۔ناول ’’آتش دان‘‘ازقمر جمالی،ص:5،6
(۴)۔ناول ’’آتش دان‘‘ازقمر جمالی ص5،6
(۵)۔افسانوں کا مجموعہ "شبیہ "ازقمر جمالی ص:18
(۶)۔فسانوں کا مجموعہ "شبیہ "ازقمر جمالی ص:18
(۷)۔افسانوں کا مجموعہ "شبیہ "ازقمر جمالی،ص:27
(۸)۔شخصی انٹرویو،انٹرویور: سید فریاد25 / مارچ2021ءدن جمعرات دو پہر12:53 بجے گنڈم گوڑہ حیدرآباد
(۹)۔بحوالہ ’’قمر جمالی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ‘‘،شاہین سلطانہ،ص56-55
(۱۰)۔شاعر بمبئی "عالم یوم خواتین کے نام "مارچ2015ء،ص:17
(۱۱)۔بحوالہ ’’ناول آتش دان کا تنقیدی مطالعہ‘‘،جاوید احمد شاہ،ص64-63
(۱۲)۔شاعر بمبئی "عالم یوم خواتین کے نام ’’گوشہ قمر جمالی‘‘ مارچ/2015 ص:21
(۱۳)۔بحوالہ ’’قمر جمالی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ‘‘،شاہین سلطانہ،ص62-61

باب دوم

قمر جمالی کی ادبی خدمات

قمر جمالی کی ادبی خدمات

ادبی سفر:

قمر جمالی کو بچپن ہی سے کہانی لکھنے کا بے حد شوق تھا۔ طالب علمی کے دوران ان کی ٹیچر انھیں کسی موضوع پر مضمون لکھنے کو کہتی تھیں تو وہ اس میں ایک کردار کو شامل کر کے کہانی کا جامہ پہنا دیتی تھیں۔ یہیں سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ قمر جمالی کے ادبی سفر کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

> ''قمر نے کہانی لکھنی کیوں شروع کی؟ یہ بھی ایک عجیب حقیقت ہے۔ اسکول میں جب اسے کوئی مضمون لکھنے کو کہا جاتا تو اس کا مضمون دوسروں سے الگ ہوتا۔ وہ انشائیہ نہ ہوتا بلکہ وہ ایک کردار کے اطراف گھومتا۔ یہ قمر کی استانی کو ناگوار گزرتا اور قمر کی اکثر پٹائی بھی ہو جاتی۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دن ایک محفل سجی جس میں علامہ حیرت بدایونی بھی شریک تھے۔ قمر جمالی نے جو ابھی کم عمر ہی تھیں اس محفل میں اپنی پہلی کہانی سنائی لڑکوں نے آوازے کسے " کسی سے لکھوائی ہے؟ تم تو ابھی بچی ہو" وغیرہ۔ کہانی ختم ہوئی اور قمر روتی ہوئی اسٹیج سے اتری۔ علامہ حیرت بدایونی نے اس کی پیٹھ ٹھونکی کہا یہ تو ہوتا ہی ہے تمھیں ایسے تجربوں سے گزرنا ہوگا میری بیٹی بھی کہانی لگتی ہے۔ قمر کی ڈھارس بندھی پھر کسی نے قمر کا نشر گاہ کے کرتا دھرتاؤں سے تعارف کروایا اور قمر نے نشر گاہ سے کہانیاں نشر کرنی شروع کیں۔ یہاں کوئی سپورٹ کرنے والا تھا اور نہ ہی کسی کے توصیفی کلمات سننے کو ملتے کہ حوصلہ بڑھے۔ مگر یہ کیا کم تھا کہ اس کی وجہ سے قمر جمالی کا قلم چل پڑا۔''(۱)

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ قمر جمالی کے اندر کا ادیب طالب علمی کے زمانے ہی سے متحرک تھا جس کے باعث وہ مضامین میں بھی کردار سازی کرتی تھیں۔

قمر جمالی کی قلمی زندگی کا آغاز افسانے سے ہی ہوا جس کا عنوان "اے چاند چھپ نہ جانا" تھا جو عشقیہ موضوع پر مبنی ہے۔ایک ہفتہ وار اخبار نما رسالہ "روداد حیات" دہلی میں غالباً 1966ء میں چھپا تھا جبکہ ان کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی۔ان کی تاریخ پیدائش سنہ 1950ء قرار پائی ہے اور اس میں اگر پندرہ سال جمع کر دیئے جائیں تو 1965ء حاصل ہوتا ہے۔لہٰذا اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ کہانی 1965ء یا 1966ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی ہوگی۔کیونکہ اس ضمن میں قمر جمالی کے ذہن میں صاف طور پر اس کہانی کا سنِ اشاعت محفوظ نہیں ہے۔قمر جمالی نے اپنی باضابطہ قلمی زندگی کا آغاز 1969ء میں کیا جب ان کی دوسری کہانی ''فاصلے مٹ گئے'' ماہنامہ ''بیسویں صدی'' میں شائع ہوئی۔یہ ان کی ادبی زندگی کا ایسا موڑ تھا جہاں سے انھیں اپنی پہچان بنانے کی چاہ شروع ہوئی۔ہندوستان اور بیرون ہندوستان سے آنے والے ستائشی خطوط ملنے سے انہیں حوصلہ ملا۔

اس کے بعد ان کے قلم میں توانائی آئی اور وہ افسانہ نگاری کی طرف باقاعدگی سے توجہ دینے لگیں۔اس طرح لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ان کا کہنا ہے کہ جب تک موضوع پر انھیں گرفت حاصل نہیں ہوتی وہ نہیں لکھتیں۔اس سلسلے میں وہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

> ''پہلی کہانی چھپنے سے جو ہمت افزائی ہوئی وہ میرے لئے ایسی طاقت ثابت ہوئی کہ میں نے پھر کبھی مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا سلسلہ جاری رہا۔ ہاں یہ میں قبول کرتی ہوں کہ میں سست قلم ہوں کہانی جب تک میرے ذہنی کوکھ میں پک نہیں جاتی نہیں لکھتی ہوں۔''(۲)

اس طرح افسانہ نگاری کی طرف توجہ کی اور کئی افسانے قلمبند کیے۔ان کے افسانے ہندوستان کے سبھی معتبر رسالوں میں اور پاکستان کے بادیاں، سخنور، منشور میں چھپ چکے ہیں۔قمر جمالی نے تقریباً تمام نثری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ایک غزل بھی لکھی ہے اور نظم نگاری کی طرف بھی توجہ کی۔ایک انگریزی نظم چھپ بھی چکی ہے لیکن انکی طبیعت شاعری سے زیادہ نثر کی طرف مائل رہی اس لیے انھوں نے صرف نثر ہی کو ذریعہ اظہار بنایا اور اسی میں اپنے قلم کے جوہر دکھا رہی ہیں۔نثر سے دلچسپی کی وجہ پوچھے جانے پر انہوں نے بتایا:

> ''اب تک نثر نگار ہوں البتہ شعر سننا بہت اچھا لگتا ہے الفاظ میں تغزل کی شیدائی ہوں میرا خیال ہے نثر میں تغزل پیدا ہو سکتا ہے۔اگر شعور ہو تو میں لفظوں میں آہنگ پیدا کرنے کی قائل ہوں۔میں نے افسانہ، ڈرامہ، مضامین، انشائیے، فیچرز، رپورتاژ

سفرنامے تقریباً سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی، ایک ناول شروع کیا ہے خدا سے دعا
ہے کہ تکمیل کی توفیق دے۔ آمین۔'' (۳)

ادبی کارنامے:

اردو یا کسی زبان کے نثری ذخیرے کو مزاجاً دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہیا فسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب۔

1) افسانوی ادب کی چار اقسام ہیں۔ داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ۔

2) غیر افسانوی ادب میں فکشن کے علاوہ ہر طرح کی نثری تحریریں شامل ہیں جن کی متعدد شکلیں ہیں۔ مثلاً مضمون، مقالہ، انشائیہ، سوانح، آپ بیتی، مکتوب، خاکہ، تبصرہ، طنز و مزاح، سفرنامہ، ترجمہ اور نثری نظم وغیرہ۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی کتاب اصناف ادب میں اردو ادب کے نثری ذخیرے کی تقسیم افسانوی اور غیر افسانوی ادب کے طور پر کی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ فکشن کے زمرے میں وہی چار اصناف ادب شامل ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔ ان چار نثری اصناف ادب کے علاوہ باقی نثری اصناف غیر افسانوی نثر میں شامل ہوتی ہیں۔ اگر چہ قمر جمالی نے تقریباً تمام تر نثری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مگر یہاں جمالی کی ادبی خدمات میں صرف افسانوی ادب کے حوالے سے ذکر کیا جائے گا کیونکہ میرا موضوع قمر جمالی کے غیر افسانوی ادب سے متعلق ہے نیز ان کے غیر افسانوی ادب کا تفصیلی جائزہ تیسرے باب میں پیش کیا جائے گا۔

قمر جمالی کی ادبی خدمات افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، ادبی اداروں اور انجمنوں سے وابستگی، سیمینار و کانفرنسوں میں شرکت، انعامات و اعزازات، سماجی و فلاحی خدمات، بیرونی ممالک کے سفر کا مفصل جائزہ آئندہ سطور میں لیا جا رہا ہے۔

ا) افسانہ نگاری:

قمر جمالی حیدرآباد کی خواتین افسانہ نگاروں میں انفرادی حیثیت کی حامل ہیں۔ اور وہ عہد جدید کی ایک مشہور افسانہ نگار بھی ہیں۔ یوں تو انہوں نے ناول، ڈرامے، انشائیے، رپورتاژ، سفرنامے، تحقیقی و تنقیدی مضامین اور تبصرے بھی لکھے ہیں لیکن وہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں اور اسی حیثیت سے ہی ان کو شہرت اور مقبولیت

حاصل ہے۔افسانوں پر گہری سوچ رکھنے والی اور افسانوں میں اپنی منفرد پہچان بنانے والی قمر جمالی کے اب تک پانچ افسانوی مجموعے شائع ہوکر منظر عام پر آ چکے ہیں۔جن کی تفصیل یوں قرار پائی ہے۔

1) "شبیہ" (جملہ 12 افسانے) مارچ/1990ء خورشید پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد۔

2) "سبوچہ" (جملہ 9 افسانے) نومبر/1992ء تناظر پبلیکیشنز، سپر پرنٹرس، دہلی۔

3) "سحاب" (جملہ 12 افسانے) اپریل/2001ء وشتا گرافکس، حیدرآباد۔

4) "زہاب" (جملہ 6 افسانے، 3 افسانچے) دسمبر، ایس کے پرنٹرس، حیدرآباد۔

5) "صحرا بکف" (12 افسانے) 2015ء روشان پرنٹرس، دہلی

☆ پہلا افسانوی مجموعہ ''شبیہ'':

سرزمین حیدرآباد کی ترقی پسند خواتین میں قمر جمالی کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ "شبیہ" مارچ 1990ء میں شائع کیا۔فہرست کا آغاز قطعۂ تاریخ سے کیا گیا ہے جو باقر محسن رضوی کا لکھا ہوا ہے اور اقبال متین نے "عکس شبیہ" کے زیر عنوان خیالات پیش کیے ہیں جبکہ راج بہادر گوڑ کی مدح سرائی کے بعد ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے بھی ان کے افسانوی انداز کا جائزہ لیا ہے اس کے بعد افسانوں کے آغاز سے قبل خود قمر جمالی نے اپنی افسانہ نگاری کے بارے میں "من دانم" کے زیر عنوان اظہار خیال کیا ہے۔قمر جمالی کے افسانوں کے مجموعے "شبیہ" پر ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے نہ صرف اظہار خیال کیا ہے بلکہ اس مجموعے کے اکثر افسانوں پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ علاوہ اس کے انہوں نے یہ قطعہ بھی تحریر فرمایا ہے:

سورج کی اک کرن ہو قمر کا جمال ہو
جان فغان اہل نظر یا کمال ہو
انساں کے دل کی نبض تمہارے قلم میں ہے
شہرت تمہارے فن کی ہو اور لازوال ہو' (۴)

بانو طاہرہ سعید کی یہ دعا کام آ گئی شاید اسی لیے وہ اپنی منزل زینہ بہ زینہ طے کرتی جا رہی ہیں اور شہرت بھی ان کے قدم چوم رہی ہے۔اقبال متین نے ان کی کتاب شبیہ پڑھنے کے بعد کہا تھا:

''میں "شبیہ" کی اشاعت کو اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی کہانی کا ایک اڑتا ہوا جگنو تصور

کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ کل یہ جگنو راستے کا دیا بن کر جھکڑوں کے آگے اس طرح سینہ سپر ہو جائے گا کہ راستے کا ہر موڑ واضح طور پر نظر آئے گا۔''(۵)

''شبیہ'' کے منتخب افسانوں کا تجزیہ:

قمر جمالی کی افسانہ نگاری میں انسانی زندگی میں درپیش مسائل اور عصرِ حاضر کے سلگتے ہوئے موضوعات کا احاطہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں فرقہ وارانہ فسادات، سیاست، پولیس کی ظلم و زیادتی، دہشت گردی، فرقہ پرستی، عورت کی مجبوری اور بے بسی کے علاوہ محبوب کے ظلم و زیادتی کے موضوعات کو جگہ دی ہے۔

افسانہ ''فاتحِ عالم'':

قمر جمالی کا افسانہ ''فاتحِ عالم'' میں ایک ایسی غریب اور لاچار ماں جس کے پاس تن ڈھکنے کے لئے لباس نہیں ہے کو دردناک صورت میں پیش کیا گیا ہے، اس میں ممتا کے جذبے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ماں اپنے بدن سے لباس کھینچ کر اپنے بیٹے کو ٹھٹھرا دینے والی سردی سے بچاتی ہے۔ اُسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی ہے کہ اس کے عریاں بدن کو گندی نگاہیں گھور رہی ہیں بلکہ وہ ممتا کے جذبے سے سرشار ہے اور بڑے فخریہ انداز میں کھڑی رہتی ہے جیسے کہہ رہی ہو کہ اس نے سارے عالم کو فتح کر لیا ہو۔ ماں کی عظمت کی اسی داستان کو اس میں بیان کیا گیا ہے۔ اپنی اولاد کے لئے ماں کی اس بہادری کو دیکھتے ہوئے زنانہ کردار کی زبان سے بس یہی نکلا:

''تم بہادر ہو ماں_ بہت عظیم ہو_ فاتح عالم ہو_ دنیا جہاں کی تسخیر شاید اسی کا نام ہے۔''(٦)

اس طرح قمر جمالی نے اس افسانے کے ذریعے رومانی کہانی اور قیاسی قصے کو اہمیت نہیں دی بلکہ اپنے معاشرے میں میں ہونے والے واقعات سے نتیجہ اخذ کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ عصر حاضر میں ہر شخص اپنے شوق کی تکمیل میں منہمک ہے جبکہ مجبور اور بے بس انسانوں کا کوئی سہارا نہیں۔ اس طرح افسانے کا پلاٹ اور اس میں مرد عورت جیسے دو کرداروں کے ساتھ بس کا سفر اور اس میں مجبور و مفلس عورت کے علاوہ اس کی مصیبت میں مبتلا بچے کی حقیقت بیان کر کے قمر جمالی نے افسانہ نگاری کے ذریعے زندگی کی تلخ حقیقت کو پیش کیا ہے۔

افسانہ "فاصلے مٹ گئے" میں قمر جمالی نے محبت میں ناکام ہونے والی ریشمی کی کہانی پیش کی ہے جو اپنے محبوب سے محبت کرتے ہوئے تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ اسی طرح افسانہ "عنوان" میں ایک عورت کے اپنے شوہر پر

اعتماد اور یقین کو موضوع بنایا گیا ہے وہ اس لیے کہ اس کا شوہر فنکار ہے اور اسے یقین ہے کہ فن کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ بابا جنہوں نے اسے سہارا دیا ہے ان سے کہتی ہے:

"بابا۔۔۔فنکار محبت میں خود دھوکہ کھا جاتا ہے دوسروں کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ وہ ضرور آئے گا۔"(۷)

اولاد آدم کی ہر کڑی کہیں نہ کہیں اسی نسل آدم سے ملتی ہے چاہے نام کچھ ہوں۔۔۔۔عنوان کچھ۔اسی طرح کہانی اختتام کو پہنچتی ہے کہانی میں دلچسپی برقرار رہتی ہے یہ تیسری متاثر کن کہانی ہے۔

☆ دوسرا افسانوی مجموعہ ''سبوچہ'':

قمر جمالی کا دوسرا افسانوی مجموعہ "سبوچہ" 1992ء میں شائع ہوا۔مجموعے کی ابتدا میں سہ ماہی "توازن" مالیگاؤں کے مدیر عتیق احمد عتیقؔ کے تاثرات اور کتاب کے آخر میں بلراج برسا کے خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب کی اشاعت ماڈرن پبلکیشن ہاؤس نئی دہلی سے کی گئی ہے۔کرامت علی کرامت کے پیش لفظ، مجاور حسین کے تاثر، اقبال متین کے نقش ثانی کے بعد راج بہادر گوڑ کا تاثر اور قمر جمالی کا حرف آغاز تک کا مرحلہ 28 صفحات پر مشتمل ہے۔

''تخلیقی ادب کی دستاویز'' کے زیر عنوان منتخبات کے ذریعے 10 افسانوں کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ کتاب کا انتساب قمر جمالی نے اپنے شوہر محمد محمود حامد کے نام کیا ہے۔پیش لفظ میں کرامت علی کرامت نے اچھے انداز سے 1970ء کے بعد اردو افسانے میں ابھرنے والی جدید نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے قمر جمالی کے فن اور کارناموں کو نمائندگی دے کر اس کے موضوع اور تکنیک کا محاسبہ کیا ہے۔اس کے بعد مجاور حسین رضوی نے ایک تاثر کے ذریعے قمر جمالی کو ساتویں دہائی کے اہم افسانہ نگاروں میں شمار کیا ہے جبکہ اقبال متین نے ان کے افسانوں میں موجود زندگی کی کہانیوں اور بوقلمونیوں کا اعتراف کیا ہے۔

راج بہادر گوڑ نہ صرف ان کی تخلیقی حسیت سے متاثر ہیں بلکہ افسانہ نگاری پر انہیں مبارکباد بھی دیتے ہیں۔ ان خصوصیات کو محسوس کرتے ہوئے قمر جمالی نے "زیر لب" کے عنوان سے دیباچہ لکھ کر اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔غرض قمر جمالی کا افسانوی مجموعہ سبوچہ میں شامل تمام افسانے قمر جمالی کی تخلیقی حسیت کی وضاحت کرتے ہیں۔کتاب کا نام شاعر مشرق علامہ اقبال کے ذیلی شعر سے تبرکاً لیا گیا ہے۔

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

علامہ اقبال

اقبال متین ''سبوچہ'' کے متعلق اپنا اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قمر جمالی "شبیہ" کی مقبولیت کے بعد اپنا دوسرا افسانوی مجموعہ "سبوچہ" پیش کر رہی ہیں۔ سبوچے کی خالق نے اردو کہانی کی زلف گرہ گیر سے سبوس نکال پھینکی ہے اور پھر سے اسے سنوارنے کے جتن کر رہی ہیں۔ سبوچے کی کہانیوں سے لگتا ہے کہ قمر جمالی نے اپنے قلم ہی کو نہیں صریر خامہ کو بھی یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ کہانی کا اس طرح ہم زبان ہو جائے جیسے کہانی خود زندگی کی ہم زبان ہے۔ سبوچے کی کہانیاں زندگی کی بوقلمونی اور تنوع کا بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے احاطہ کرتی ہیں۔ زندگی زندگی، کھنڈر، سوالیہ نشان اور اگنی اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ ان کا سفرنامہ بھی نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ ان کی نگاہی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس نقشِ ثانی کی پذیرائی نقش اول سے زیادہ ہوگی۔''(۸)

سبوچہ کے منتخب افسانوں کا تجزیہ:

افسانہ "اور پھانسی دے دی گئی" میں ذوالفقار بھٹو کے پھانسی دیے گئے واقعہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے میں ذوالفقار علی بھٹو کو جب سزا دی جاتی ہے تو افسانہ نگار کا دل بے چین ہوتا ہے۔ ہوا کے جھونکوں سے آنے والی خوشبو اسے کسی لاش کے کفن سے اٹھنے والی کافور کی بو معلوم ہوتی ہے۔

دوسرے دن افسانہ نگار کو بھٹو کے پھانسی کی خبر سے بار بار بے ہوشی کا دورہ پڑتا ہے۔ اور وہ تعجب سے کہتی ہے کہ ہاں ہاں پھانسی دے دی گئی، یہ سچ کہتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ رات کے ڈھائی بجے میں وہاں موجود تھی۔ جب لوگ پوچھتے ہیں کہ افسانہ نگار کا بھٹو سے کیا رشتہ ہے وہ کہتی ہیں:

''ہاں ___ کیا رشتہ تھا ___ کیا یہ سب نہیں جانتے کہ دنیا کے پہلے انسان حضرت آدم سے ابھی تک ہمارا رشتہ قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ مجھے لگا دنیا کے سبھی لوگ ایک جیسے ہیں اور اگر۔۔۔۔۔۔ سب ہی ایک جیسے ہیں۔۔۔۔۔۔ تو میں ہی الگ

یوں۔۔۔۔۔۔کیوں۔۔۔۔۔۔؟؟!''(۹)

انہوں نے اس افسانے کے ذریعے بتایا کہ انسانیت اور درد وغم کا ایک ایسا رشتہ ہے جس کی ڈور میں ہم سبھی پروئے ہوئے ہیں۔ یہی اس افسانے کا موضوع ہے۔ اس افسانے کا موضوع ذوالفقار حسین بھٹو کو پھانسی دینے کے منظر کی نمائندگی کرتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں قمر جمالی وہ واحد خاتون ہیں جنہوں نے ہندوستان کے سیاسی پس منظر یعنی راجیو گاندھی کے قتل کی سازش اور پاکستان کے بھٹو کی موت کے بارے میں تاریخی حقیقتوں کو پیش نظر رکھ کر افسانہ نگاری کی تخلیقی حسیت کو واضح کیا ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ زبان و بیان اور فن کی خصوصیات کے علاوہ سادہ اظہار اور منظّم پلاٹ اپنے دکھاتا ہے۔

افسانہ " کفن" بھی ایک اہم کہانی ہے جس میں ایک مرتبان بیچنے والی ایک خانہ بدوش عورت کی دکھ بھری کہانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مجاور حسین رضوی نے قمر جمالی کے افسانوی مجموعے "سبو چہ" کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے افسانہ " کفن" کے متعلق لکھا ہے:

> ''اس مجموعے کی ایک کہانی کا نام کفن ہے یہ کہانی شائع بھی ہو چکی ہے۔ یہ عنوان اگر نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔ جس طرح اساتذہ کی زمین میں غزل نہیں کہنی چاہیے اسی طرح بہت مشہور عنوانات کو بھی نہیں اپنانا چاہیے کفن پریم چند کے لئے تھا_ اور بس۔۔۔!''(۱۰)

دراصل کفن نامی افسانہ منشی پریم چند کی تخلیق ہے جس میں انہوں نے سماج کے پست طبقے کی بڑے ماثر انداز میں عکاسی کی ہے۔

قمر جمالی نے بھی اسی عنوان کے تحت غریب اور محنت کش طبقے کی حقیقت کو نمائندگی دی ہے۔ قمر جمالی نے خانہ بدوش خاندان کی زندگی اور اس کی خواہشات کے ساتھ اولاد کی موت پر ہونے والی پریشانیوں کو بڑے ہی افسانوی انداز میں پیش کر کے زندگی کی حقیقت کو بھرپور نمائندگی دی ہے۔ دونوں افسانے سماج کے پسماندہ طبقے کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ اس مماثلت کی بنیاد پر اس افسانے کو حیثیت حاصل ہے۔

☆ تیسرا افسانوی مجموعہ سحاب:

قمر جمالی کی تخلیقی نثر پانچ مجموعوں میں سے تیسرا افسانوی مجموعہ سحاب اپریل 2001ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی اشاعت میں آندھرا پردیش اردو اکاڈمی کی جزوی مالی امداد فراہم ہوئی۔ تخلیق کار کی حیثیت سے قمر جمالی

نے انتساب ان بے نام جدتوں کے نام کیا ہے جو ان کی کہانیوں میں مجسم ہیں۔ اس مجموعہ میں بارہ افسانے شامل ہیں۔ جوگندر پال جیسے اہم تخلیق کار نے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ جس کے بعد قمر جمالی کا "خط کشیدہ" ان کے خیالات کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے سحاب میں شامل افسانوں کی جوگندر پال نے بڑی شدت کے ساتھ وضاحت کی ہے کہ قمر جمالی نے اپنی بے چین افسانوی شرکتوں کا باب اسی طرح بنائے رکھا ہے تو یہ توقع عین بے جا ہے کہ فنی سطح پر وہ اور بھی مضبوطی سے قدم جمائیں گی اور اردو افسانوں کے قاری کو آئندہ زندگی کا سراغ پانے کے مواقع ہم پہنچائیں گی۔ جوگندر پال کی اس رائے سے بلاشبہ کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ خط کشیدہ میں قمر جمالی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اپنی کہانیوں کے بارے میں کیا لکھوں! میری تخلیقات ہی میری شناخت ہے۔ باقی آپ سب کی نظر عمیق اور منصفانہ اظہار پر منحصر ہے۔۔۔۔۔۔''میری خواہش ہے کہ میری کہانی" آخر کیوں۔۔۔۔۔۔؟" کو مدرسے کے نصاب میں شامل کیا جائے۔'' (۱۱)

''سحاب'' کے منتخب افسانوں کا تجزیہ:

افسانہ " آخر کیوں" میں ہندوستان کی قدیم تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے قمر جمالی نے یہ بتایا ہے کہ کس طرح ہندوستان میں عید، تہوار کی خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ اس افسانے میں ایک مسلم گھرانے کی حقیقت کی نمائندگی کی ہے۔ اس افسانے کے ذریعے قمر جمالی نے اتحاد و اتفاق کی فضا کے ختم ہونے اور اس کی جگہ دکھاوے کی صورت گری کو نمائندگی دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ ایک دور میں لوگ مذہب کے نام ایک دوسرے سے قریب ہوتے تھے لیکن آج دور میں مذہب کے نام سے ایک دوسرے سے دور ہونے لگے ہیں۔ اس طرح یہ افسانہ اتحاد کی اہمیت اور بھائی چارگی کو وقت کی ضرورت قرار دیتا ہے۔ یہ افسانہ قومی یکجہتی کے عناصر سے مالا مال ہے۔ جزئیات نگاری کی ایک مثال افسانہ آخر کیوں سے دیکھیے جہاں اپنوں نے گاؤں کے ایک زمیندار گھر کے ایک منظر کے ذریعے جزئیات نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ مثلاً:

''صبح منہ اندھیرے کسی کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر ہم اپنی پلنگ پر لیٹے وہیں سے چلا اٹھے "بڑے ابا" بیٹا یہ دھوبی ہے" پھر انہوں نے ہماری انگلی تھامی، اپنی اندھیر کوٹھری میں لے گئے جہاں ٹین کے ایک صندوق سے اپنی شادی کی شیروانی نکالی اور دھوبی کے

ہاتھ میں تھما دی پھر جھک کر ہمیں گود میں اٹھا لیا اور گھر کے پچھواڑے لے گئے جہاں باولی سے پانی سینđ کر ہمیں نہلایا۔ دراصل گاؤں جاتے ہی ہم بڑے ابا کی جائیداد بن جاتے تھے اور وہ ہماری۔ جب تک ہم گاؤں میں رہتے ہم کھاتے بڑے ابا کے ساتھ، سوتے بڑے ابا کے ساتھ، یعنی ہر لمحہ انھی سے چپکے رہتے دے جوں ہی ہم نہا کر بڑے ابا کی گود میں سوار دالان میں آئے بڑی اماں ایک بڑے سے عود دان میں دہکتی ہوئی انگار لے آئیں اور ہمارے دو انچ لمبے بالوں کو جھٹک جھٹک کر اس وقت تک سینکتی رہیں جب تک ہمارے بال مینڈھے کے بالوں کی طرح اکڑ اکڑ کر کھڑے نہ ہو گئے۔'' (۱۲)

افسانہ "الاؤ" کے ذریعے قمر جمالی نے ایک ایسے کوڑھی انسان کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے جو اس وقت خوش ہوتا ہے۔ اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں برص کی بیماری رکھنے والے انسان کو ہر وقت ہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر الاؤ جل رہا ہے۔ اور چنگاریاں اٹھ رہی ہیں جو اس کی خواہشات اور نفس کو مارتی رہتی ہیں۔ حالانکہ یہی برص کی بیماری اس کے لئے موت کا الاؤ بن جاتی ہے۔ اس طرح قمر جمالی نے پورے افسانے کو شعور کی رو کی تکنیک کے ساتھ ایک ہی منظر میں اور ایک ہی کردار کے ذریعے نمائندگی دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ انہیں تخلیقی نثر لکھنے پر بڑا کمال حاصل ہے۔ اسی لیے افسانہ الاؤ میں برص کے مریض کے جذبات کی موثر نمائندگی کے ذریعے ایک کردار کی فطری حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

قمر جمالی کی تخلیقی حسیت کا یہ اعزاز ہے کہ وہ نہ صرف کئی کرداروں پر مشتمل افسانے لکھنے کا حق ادا کرتی ہیں بلکہ صرف ایک کردار پر بھی افسانہ لکھ کر انہوں نے افسانوی نثر کی حقیقت پسندی کو واضح کیا ہے اور فن کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اظہار کی بے ساختگی کو اس افسانے میں شامل کر کے اس کے عنوان کو ہمیشہ کے لئے یادگار بنا دیا ہے۔ غرض کردار کی ذہنی کشمکش کو افسانے میں شامل کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اسے شدت سے اپنی ازدواجی زندگی کا پہلا سبق یاد آنے لگا وہ جذبات ملاحظہ ہوں:

''شاید وہ اسے اپنی باہوں میں بھر لینا چاہتا ہے۔ سرخ گھونگھٹ کے پیچھے حیران سی کھلی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک نہیں کئی جام غٹا غٹ پینا چاہتا ہے۔ میٹھے پانی کا کنواں تھی وہ، مگر۔۔۔۔۔۔وہ تو رہ گیا اوپر۔۔۔۔۔۔ چھوٹے ڈول کی طرح اور

رسی۔۔۔۔۔۔؟

کشٹھ روگ چاٹ گیا اسے۔

بس رہ گیا ایک سرا جو بجائے کٹ کر گر جانے کے غڑاپ سے الٹا اندر چلا گیا۔اس کے وجود کے اندر۔

شاید یہی سرا رہ کر اس کے اندر ہلچل کرتا رہتا ہے۔

میں جینا چاہتا ہوں_ تمہارے ساتھ_ سنتی ہوں_؟ تمہارے آنچل کی ٹھنڈک میں۔

دیکھو! بظاہر میں بڑا خوفناک لگتا ہوں۔۔۔مگر۔۔۔۔۔۔۔۔"(۱۳)

☆ چوتھا افسانوی مجموعہ ''زہاب'':

قمر جمالی کا چوتھا افسانوی مجموعہ "زہاب" دسمبر 2007ء میں تناظر پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ کتاب کے آخر میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ کتاب آندھرا پردیش اردو اکادمی حیدرآباد کی جزوی مالی اعانت سے شائع ہوئی ہے۔انتساب قمر جمالی کی چھوٹی بہن ساجدہ سلطانہ کے نام معنون کیا گیا ہے جنہیں مرحوم لکھنے کو طبیعت نہیں چاہتی کیونکہ وہ تخلیق کار کی جان تھیں اور ان سے تخلیق کار نے بہت کچھ سیکھا حتیٰ کہ جینے کے ساتھ ساتھ بے آواز مرنا بھی ان ہی سے سیکھا ہے۔

اس کے بعد عباس متقی کا قطعۂ تاریخ درج ہے۔مندرجات میں سب سے پہلے پیش گفتار عقیل ہاشمی کا تحریر کردہ ہے جب کہ قمر جمالی نے اپنے اظہار اور فن پارے کے بارے میں" کچھ ہم بھی تو کہیں" کے زیر عنوان کے تحت نمائندگی دی ہے۔ایک صفحے پر ہندوستان کے سابق وزیراعظم اندر کمار گجرال کا پیش کردہ اہم خیال شامل کیا گیا ہے جس میں انھوں نے قمر جمالی کو دہشت گردی کی نفسیات کو دلچسپ انداز میں پیش کرنے کی وجہ سے مبارکباد دی ہے۔اس کے بعد تمام مددگاروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک صفحے پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی (دہلی) اور پیغام آفاقی (دہلی) کے تاثرات شامل کرنے کے بعد افسانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔اس افسانوی مجموعے میں بارہ افسانے شامل ہیں اور ہر افسانے میں تخلیق کار کی جرات اور تخلیقی حسیت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

ان کے منتخب افسانوں کے جائزے کے ذریعے یہ بتایا جائے گا کہ انہوں نے اردو میں مونو لاگ اور وقائیہ بھی لکھے۔اس کے علاوہ ان کے تین افسانچے بھی شامل اشاعت ہیں۔اور آخر میں سفرنامے کے ذریعے تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔کتاب کے آخری حصے میں عارف خورشید، خاور نقیب اور مقبول فاروقی کے تاثرات کو

بھی ایک ایک صفحے میں شامل کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیق کار کی صلاحیتوں کو ان کے عہد کے محققین اورنقادوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

زہاب کے منتخب افسانوں کا تجزیہ:

افسانہ ''کنکھجورا'' میں ایک ماں جو طوائف ہے وہ بیمار رہتی ہے اور اپنی لڑکی جسے اس نے پالا تھا اور اعلی تعلیم دلائی تھی جب وہ زندگی کی آخری سانس لے رہی تھی تو ریشمی کو مخاطب ہو کر کہتی ہے زندگی ہر آدمی کو اکیلے بسر کرنی پڑتی ہے اسے ہمت اور حوصلے سے زندگی کا سامنا کرنا چاہیے۔اس طرح ان کے افسانوں میں عورتوں کے کردار بھی بڑے جاندار اور متحرک معلوم ہوتے ہیں جنسی زندگی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ماں کی نصیحت ملاحظہ ہو:

> ''بیٹی! زندگی کے سفر کی بڑی نرالی تہذیب ہے۔شب مسافرت خود چل کر طے کرنی ہوتی ہے۔ہم سب کچھ دیر کے لیے کچھ دور تک بس ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ منزل تو مسافر کو خود ہی چل کر پہنچنا ہوتا ہے ہے۔ نہ کوئی قافلہ ساتھ ہوتا ہے اور نہ کارواں۔تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ مجھے یقین ہے میری ہی طرح تم بھی ایک اچھی فنکار بنو گی تم سمجھتی ہو فنکار کے معنی؟ فن کار! جن کے دل سلگتے بھی ہوں دھواں لبوں سے خارج نہیں ہوتا۔'' (۱۴)

افسانہ کنکھجورا میں شام کے وقت باغ کے ایک منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔اس منظر کی خوبی یہی ہے کہ سارا منظر نظروں میں گھوم جاتا ہے۔اور زبان و بیان کا لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے بڑی شگفتہ زبان استعمال کی ہے،مثلاً اقتباس دیکھیے:

> ''جانی یہ شام ڈھلنے سے پہلے عروسی جوڑا کیوں پہن لیتی ہے۔۔۔!
>
> سانولی دھوپ کو منہ چڑا لینے کے لیے۔۔۔۔۔!
>
> دل ڈھلتا ہے_
>
> پرند غول در غول اپنے آشیانوں کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔
>
> تاریکیوں سے بچنے کے لئے کھلے میدانوں سے نکل کر مزید تاریکیوں میں ہی کیوں پناہ

لیتے ہیں!

دن کا چہرہ سانولا نے لگا ہے۔شنکر نی لبادہ دھواں دھواں سا ہے۔

اب ہر طرف سیاہی کا تسلط قائم ہو گیا ہے۔ میں باغ کے اسی کم رونق حصے میں بیٹھی

تاریکیوں میں گھل گئی ہوں۔‘‘(۱۵)

غرض قمر جمالی نے فطرت کے حسین نظاروں کی بھی بہترین تصویر کشی کی ہے۔

ان کے دیگر افسانے خواب آنکھیں اور تعبیر، ایک روپیہ، تیرا نام کیا ہے، ابن آدم، کنکھجوراا ور لائف لائن کا پلاٹ بھی متاثر کن اور جاندار ہے کہانی شروع سے آخر تک تاثر سے پر ہے لیکن "لائف لائن" اور "تیرا نام کیا ہے" میں فلیش بیک کے ذریعے کہانی میں بے ترتیبی کہیں کہیں نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی کہانی کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قمر جمالی نے اپنے افسانوں میں واقعات کی ترتیب و تنظیم کا خیال رکھا ہے ترتیب وار واقعات کو بڑے دلچسپ موثر پیرائے میں بیان کیا ہے کہ دلچسپی شروع سے آخر تک افسانے میں برقرار رہتی ہے اور ان کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ کہانی کے آخر میں سماج کو کوئی پیغام ضرور دیتی ہیں احساس قاری ان کے پیغام سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔

☆ پانچواں افسانوی مجموعہ ''صحرا بکف'':

تخلیقی دنیا میں افسانہ نگاری کے توسط سے حیدرآباد کی خواتین کے نام کو روشن کرنے والی ایک اہم خاتون کی حیثیت سے قمر جمالی امتیازی مقام رکھتی ہیں۔اس سے قبل ان کے چار افسانوی مجموعے وقفے وقفے سے شائع ہوتے رہے۔"صحرا بکف" میں شامل بارہ افسانوں اور ایک سفرنامے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں قمر جمالی اپنی انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کے افسانوی مجموعے "صحرا بکف" کو 2015ء میں تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکادمی کی جزوی مالی امداد فراہم کی گئی۔پیش لفظ میں انہوں نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ "صحرا بکف" ان کا پانچواں افسانوی مجموعہ ہے۔لیکن ان کی جملہ آٹھ تخلیقات منظر عام پر آ چکی ہیں۔جن میں ایک ناول "آتش دان" ایک ڈراموں کا مجموعہ "سنگ ریزے" کے علاوہ ایک تبصروں اور دیباچوں کا مجموعہ "انعکاس" بھی شامل ہے۔اس طرح 2007ء میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعے "زہاب" کے بعد 2012ء میں "انعکاس" کی اشاعت عمل میں آئی۔پھر 2014ء میں ناول "آتشدان" کی اشاعت کے بعد 2015ء میں افسانوی مجموعہ "صحرا

بکف" کی اشاعت عمل میں آئی .اس مجموعے میں شامل ہر افسانہ انسانی زندگی سے قریب ہی نہیں بلکہ اس کی نیرنگیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

''صحرا بکف'' سے منتخب افسانہ ''میں سڑک ہوں'':

عام طور پر تخلیقی ماحول میں بے جان اشیاء کو جاندار بنا کر پیش کرنے کا عمل تشخص (personification) کہلاتا ہے۔بے جان اجسام کو جاندار کی طرح پیش کرنا بھی تخلیقی عمل کا حد درجہ نازک انداز ہے قدیم زمانے میں داستانوں اور حکایتوں کے ذریعے تمثیل allegory کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے عصر حاضر میں افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے تجسیم اور تشخص کی روایت کو پیش کرنے کی طرف پیش رفت کی ہے۔عمر جمالی کا یہ افسانہ بھی اسی انداز کا ہے۔انہوں نے حد نظر تک پھیلی ہوئی سڑک کو کسی الھڑ دوشیزہ کی طرح لچکتی اور بل کھاتی ہی نہیں بلکہ زلفوں سے گوندھی ہوئی سیاہ چوٹی کے مماثل بتایا ہے۔جب ایسی سیاہ سڑک جو چوٹی کی طرح جھولتی ہوئی ہے اس پر کسی عاشق کی نامراد نظر پڑتی ہے تو بلاشبہ اس کے دل پر تازیانہ برستے ہوں گے۔

قمر جمالی نے سڑک کے ہر موسم میں ایک جیسے ہونے کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ گرمی، سردی یا بارش ہر موسم میں ہر گزرتے ہوئے راہ گیر کو بلا مذہب ملت ورنگ ونسل اپنی آغوش میں لیے ہوئے خاموش گزرتی ہوئی سڑک تمام سڑکوں کی تاجدار لگتی ہے۔یہ سڑک جنگل بیابانوں سے گزرتی ہوئی، پہاڑوں کو کاٹتی اور بہتی ندیوں کا حصار بناتی ہوئی،شہروں اور آبادیوں سے دور ہو جاتی ہے تو سڑک پر سناٹا طاری ہو جاتا ہے۔سڑک ہمیشہ خطرناک ہولناکیوں کو نگل لیتی ہے۔وہ ہمیشہ خاموش رہتی ہے۔اسی سڑک پر کوئی پاگل رہ گیر کار کی کھڑکی سے سر باہر نکالے بڑی دیر تک پیچھے کی طرف دیکھ رہا ہے۔شاید انتظار کر رہا ہے کسی کے پاس سے گزرنے کا اور ایک کار زناٹے کے ساتھ گزر گئی۔اس نے گھبرا کر اپنا سر اندر کر لیا۔غرض سڑک نہ صرف شاہراہوں کی تہذیب بناتی ہے بلکہ اپنے اوپر سے گزرنے والوں اور مسافروں کو خوف سے دور کر کے منزل مقصود تک پہنچاتی ہے:

> ''میں تو بس نام ہی کیلئے شاہ ہوں۔راہوں کی شاہ ورنہ تو مجھ میں شاہوں جیسا کچھ بھی نہیں ہے۔''(۱۶)

جب سڑک پیچ وتاب کھاتا ہے تو ہیبت طاری ہونا فطری بات ہے۔ایسے موڑوں پر بورڈ لگا دیا جاتا ہے جو ہیئر پن ٹرن Hairpin Turn کی نمائندگی کرتا ہے۔اگر مسافر اسے دیکھ نہ پائیں تو پھر خطرناک صورت

حال سے گزر جاتے ہیں۔سڑک کی انسانی خصوصیات کے بارے میں قمر جمالی کہتی ہیں کہ جہاں انسانوں نے نفرت اور انتقام کے علاوہ محرومیوں کے ساتھ ساتھ حیوانی جبلت کی تکمیل کی اسی طرح سڑک درندہ صفت انسانوں کے ارادوں کو بھی بھانپ لیتی ہے۔اشارہ دے کر گزرنے والے راہگیر کو وہ شریف آدمی اور شاہراہوں پر بدتہذیبی سے گزرنے والوں کو نابلد قرار دیتی ہے۔

راہ گیر اگر اپنے راستے سے ہٹ جائے تو گاڑی روک کر پوچھ لیتا ہے کہ یہ سڑک کہاں جاتی ہے۔عام طور پر شاہراہوں پر گاڑی روکنا خطرناک ہوتا ہے لیکن بعض اوقات سڑک پر گاڑی چلاتے ہوئے انسان کسی بھوت پریت سے کم قرار نہیں پاتا۔سڑک کنارے دو چار کاریں ٹھہری ہوئی دیکھیں تو سمجھا کہ لوگ آرام کر رہے ہیں لیکن پتہ چلا کہ وہ گاڑیاں روک کر شغل فرما رہے ہیں۔ام الخبائث ان کی دلچسپی ہے۔غرض شراب نوشی میں مشغول افراد کا ذکر بھی سڑک کے کنارے ٹھہری ہوئی کاروں کے ذریعے کیا گیا۔

غرض تخلیق کار نے کائنات کی تمام وسعتوں کی خصوصیات سڑک کے ذریعے پوری ہوتے اور اتفاقات کا مرحلہ طے ہونے کا ذکر کرتے ہوئے قمر جمالی نے سڑک کے ذریعے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ اسی سڑک پر انسانی ہوس کاروں نے کسی لڑکی کو اپنی ہوس کا شکار بنایا۔ان ان درندوں نے لڑکے کو سلاخوں سے مار کر ختم کیا اور لڑکی کا گلا گھونٹ دیا۔ایسی تمام حرکات وسکنات سڑک کی آنکھ ہمیشہ دیکھتی رہتی ہے۔اسے اپنی افسانوی طاقت کے ذریعے پیش کرتے ہوئے تخلیق کار نے یہ بتایا ہے کے سڑک خدا کا شکر ادا کرتی ہے کہ وہ انسان نہیں ہے۔کیونکہ انسان گناہ کر کے اپنی گناہ گاری کو کسی دوسرے کے سر تھوپ دیتا ہے۔لیکن سڑک میں یہ ایمانداری موجود ہے کہ جہاں حادثہ ہوتا ہے اس کا ثبوت خود سڑک فراہم کرتی ہے۔اگر انسان کو حق مانگنا ہو تو قانون کے خلاف احتجاج کرنا پڑتا ہے۔اگر چہ سڑک بے بس، مجبور اور لاچار ہوتی ہے لیکن یوں ہی پڑی ہوئی کائنات کی وسعتوں کو سمیٹے ہوئے حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے۔سڑک خدا کا شکر ادا کرتی ہے کہ وہ انسان نہیں ہے۔اپنے افسانے سڑک کے ذریعے قمر جمالی نے واضح انداز سے تجسیم اور تشخص کی نمائندگی کی ہے۔عام طور پر اس قسم کے افسانے لکھنے کے دوران تخلیقی بیانیہ افسانہ نگاروں کی دسترس سے باہر ہو جاتا ہے لیکن قمر جمالی کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے افسانے کو حقیقی بیانیہ سے مربوط رکھا ہے۔

قمر جمالی نے اپنے تخلیقی سفر کے دوران پانچ افسانوی مجموعے، ایک ناول، ڈراموں کا مجموعہ، تبصروں اور

دیباچوں کا مجموعہ پیش کر کے بیک وقت افسانوی نثر اور غیر افسانوی نثر پر اپنی دسترس کا ثبوت پیش کیا ہے۔اس طرح دکن کی خواتین ترقی پسند تحریک کی توسط سے اردو افسانے کو نئے مسائل اور معاملات سے وابستہ کرنے والی خاتون کی حیثیت سے قمر جمالی کی تخلیقی صلاحیت کو قبول کیا جانا چاہئے۔قمر جمالی کے افسانوں کے مطالعے سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں کہانی پن کو برقرار رکھا ہے جدید افسانہ نگاروں نے علامتی اور تجریدی افسانہ نگاری کی طرف توجہ کی ہے۔قمر جمالی کی افسانہ نگاری کا آغاز بھی جدیدیت کے عہد میں ہوا۔ لیکن ان کے افسانے تجریدیت کے اثر سے پاک ہیں۔ان کے افسانے کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مجاور حسین لکھتے ہیں:

> ''آٹھویں دہائی کے آغاز سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ افسانہ کو بہر حال واقعات یعنی قصہ بن کا حاصل ہونا چاہیے۔قمر جمالی نے ساتویں دہائی میں بھی کہانیاں لکھی ہیں۔مگر ان پر اس ایہام پسندی یا تجریدیت کا اثر نہیں پڑا اور انہوں نے اب جو کہانیاں لکھی ہیں وہ اس اثر سے کافی دور ہیں۔"(۱۷)

ان کے افسانوں کی اسی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جوگیندر پال لکھتے ہیں:

> ''مشرقی خواتین کا دائرہ واردات آج بھی بالعموم گھر آنگن یا وہاں سے نکل کر اڑوس پڑوس تک محدود رہا ہے لیکن ادھر دو چار دہوں میں زندگی میں اتنی بوکھلا دینے والی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں کہ دادی اماں اگر اچانک قبر سے اٹھ کر گھر لوٹ آئے تو اپنی پوتیوں اور نواسیوں کی پٹ پٹ دیکھتی رہ جائے کہ کیا آخر کون ہیں۔قمر جمالی کی کہانیاں بھی پہلی ہی نظر میں ان تبدیلیوں کے ادراک کا بڑا قابل یقین سماں باندھے ہوئے ہوتی ہیں اور یہی سماں بندی دراصل اسے اپنی پیشتر ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں سے ممیّز کرتی ہیں۔مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ باہری زندگی کے مذکر صفت شعور کے ساتھ ساتھ وہ انسانی دکھ کو بعینہٖ مونث صفت باطنی، حساسیت سے پیش کرنے پر حاوی ہے۔''(۱۸)

قمر جمالی نے اپنے افسانوں میں افسانے کے اجزائے ترکیبی کا خاص خیال رکھا ہے۔موضوعات، پلاٹ، کردار نگاری، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری، کلائمکس اور زبان و بیان کا لطف و اختتام سبھی ان کے

افسانوں میں بدرجہ اتم موجود ہے کہ خاور نقیب نے انہیں حیدر آباد کی افسانہ نگاروں میں منفرد اور معتبر بتایا ہے وہ لکھتے ہیں:

''اردو کے موجودہ افسانہ نگاروں کی فہرست میں حیدر آباد کی خاتون افسانہ نگار محترمہ قمر جمالی کا نام منفرد بھی ہے اور معتبر بھی۔ قمر جمالی صاحبہ نے اپنے فن کو عصری تقاضوں کے مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں معاشرتی زندگی کے ہمہ جہتی ادراک اور عصری حقانیت کی فراوانی کے پہلو بہ پہلو جمالیاتی عنصر بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ قمر جمالی کے افسانوں میں جہاں مشاہداتی آگہی موجود ہے وہیں بیانیہ پر ان کی گرفت حد درجہ مضبوط نظر آتی ہے۔ موصوفہ نے اپنے فن کے دامن کو علائم کی شدت پسندی اور مکالماتی ابتذال سے بچائے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا فن عدم ترسیلیت کا شکار ہو کر (escapistic capsule) یعنی فراریت کے خول میں مقید نظر نہیں آتا۔''(۱۹)

قمر جمالی ایک حساس ادیبہ ہیں وہ خود عورت ہیں اس لئے عورت کے جذبات و احساسات کا بھرپور ادراک رکھتی ہیں انہوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات اور دلی کیفیات کا بیان بھرپور انداز میں کیا ہے لیکن دیگر انہوں نے خواتین افسانوں سے ہٹ کر مسائل پیش کیے ہیں۔ انہوں نے عورتوں کے مسائل کے علاوہ بعض اہم سماجی مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور اس پر طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ یوسف جمال نے ان کے افسانوں کے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے انہیں منفرد افسانہ نگار کہا ہے وہ لکھتے ہیں:

''قمر جمالی کے افسانوں میں گھٹن، افسردگی، شکست و ریخت کی جگہ زندگی اور امید کی خوشبو ہے۔ ان کے ہاں فرد کا کرب یا المیہ نہیں ہے بلکہ فرد کی بقا اور اس کی تقدیس ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ آج قمر جمالی جس مقام پر متمکن ہے اس کو حاصل کرنے میں انہوں نے اپنے اعتبار فن اپنی ذاتی لگن اور مسلسل محنت سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حلقہ باشعور نے قمر جمالی کے فن کو ایک بامعنی سرگرمی قرار دیا ہے۔ ان کے افسانوں کی اپنی ایک شناخت ہے ان کی ایک انفرادیت ہے۔(۲۰)

قمر جمالی نے اپنے افسانوں میں جن موضوعات کو پیش کیا ہے وہ عصر حاضر کے بعض اہم مسائل ہیں۔

عورت کی بے بسی، نفسیاتی کشمکش، حوصلوں کی شکستگی کے علاوہ عورت کی پاکدامنی، شریف النفسی اور نیک سیرتی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ رشتوں کی پاسداری کا احساس ان کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً میاں بیوی کا رشتہ، بہن بھائی کا رشتہ، عاشق اور معشوق کا رشتہ، ماں بیٹے کا رشتہ غرض انہوں نے اپنے افسانوں میں انسانی رشتوں کی بھرپور عکاسی کی ہے ہے۔ اور عصر حاضر کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع ملتا ہے اور اسلوب میں تازگی و شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات کے انوکھے پن کی ستائش کرتے ہوئے سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال لکھتے ہیں:

''قمر جمالی کے انسانوں کی چال زمانے سے ہم قدم ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے "اگنی پر ویش" میں دہشتگرد کی نفسیات کو بڑی سوجھ بوجھ سے پیش کیا ہے۔''(۲۱)

عصر حاضر کے افسانہ نگار (plot less) کہانیاں لکھ رہے ہیں ان میں کہانی پن نہیں ہوتا۔ لیکن قمر جمالی کے افسانوں میں کہانی پن نظر آتا ہے۔ انہوں نے مربوط پلاٹ استعمال کیے ہیں۔

قمر جمالی کردار نگاری میں بھی کمال رکھتی ہیں کرداروں کی کیفیات کا انہیں بھرپور علم ہے۔ انہوں نے بہت سارے ایسے کردار بھی تراشے ہیں جو ہیں تو ہماری ہی زندگی کے آس پاس رہنے والے لیکن قمر جمالی نے ان کے اطراف کچھ ماجرہ پناہ کہ وہ کاغذ کی سطح سے اٹھ کر دل و دماغ میں آباد ہو جاتے ہیں۔ قمر جمالی کی اپنے کرداروں سے جذباتی وابستگی پر روشنی ڈالتے ہوئے سرینواس لاہوتی لکھتے ہیں:

''قمر جمالی کے افسانوں میں جو کردار ہمیں ملتے ہیں ان کا تعلق مختلف طبقوں پر مشتمل ہے ان کی عکاسی میں افسانہ نگار نے جذباتی وابستگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ سب جیتی جاگتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ اچھے کہانی کار کا یہ وصف بھی ہوتا ہے کہ ایک کا طرز بیان دوسری کہانی سے مختلف ہو۔ قمر جمالی کی کہانیوں میں یہ بس صاف نظر آتا ہے۔'' (۲۲)

قمر جمالی کا اسلوب روحانی ہے۔ وہ واقعے کے سحر اور اس سے پیدا ہونے والے تجسس کے ذریعے منظر کو زندہ جاوید کر دیتی ہیں۔ ان کے افسانے قدرے طویل ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود پر کشش ہوتے ہیں۔ قمر جمالی کے افسانوں کی زبان بڑی خوبصورت ہوتی ہے ان کے قلم سے نکلنے والے اکثر بامعنیٰ، فلسفیانہ اور خوب جملے قاری کو مسرور کر دیتے ہیں تو کبھی اسے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور کبھی زبان سے بے ساختہ تعریف نکل جاتی

ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں شگفتہ بیانی سے کام لیا ہے بات کو سیدھے سادے انداز میں بیان کرنے کے بجائے وہ مشکل الفاظ میں بیان کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔وہ خود اپنے افسانوں کے اسلوب کے بارے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''میں شاید قدامت پرست طرز لکھنے والی ہوں میرا مطلب صرف اسلوب بیان سے ہے۔ادب میں ادب کو ملحوظ رکھنے کی قائل ہوں خصوصاً زبان کو ضرورت سے زیادہ سلیس وسادہ لکھنے کے بجائے تھوڑی سی ادق پسندی مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔جیسے کہ "اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور قریب تھا کہ وہ رو پڑتی" ایسا کہنے کے بجائے مجھے یوں کہنا اچھا لگتا ہے "ایک تلاطم تھا پس مژگاں جو بند ضبط توڑنے کے لئے بے چین تھا" اپنی کہانیوں کے بارے میں بس اتنا کہوں گی کہ اگر قاری کچھ لمحوں کے لیے خود کو کہانی کے ساتھ چلتا ہوا محسوس کرے اور اس کے چہرے پر وہ تاثر پیدا ہو جس کے اثر کہانی لکھی گئی ہے تو سمجھوں گی کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔''(۲۳)

قمر جمالی کے افسانوں کے مجموعی جائزے اور دانشوروں کے خیالات کی روشنی میں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے افسانہ نگاروں سے ایک الگ راہ نکالی ہے۔اسلوب کی چاشنی وادبیت سے اپنے افسانے کو زیادہ موثر اور جاندار بنایا ہے ان کے افسانوں میں افسانہ نگاری کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم ملتی ہیں۔قمر جمالی کے افسانوں کا بنیادی موضوع محبت ہے۔اور یہ محبت کبھی ان کے افسانوں میں ایک حساس عورت کے پرتو میں جھلکتی ہے، کبھی محبوبہ کی صورت دکھائی دیتی ہے، کبھی ماں کی شفقتوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے، کبھی بھائی بہن کے درمیان اس کے جلوے نظر آتے ہیں تو کبھی یہ محبت نور بن کر ان لفظوں سے ٹپکنے لگتی ہے۔

انہوں نے عورت ہونے کی حیثیت سے سماج و معاشرے کے بعض اہم مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے عورت کے دکھ درد، پریشانیاں، بے بسی اور سماجی بندھنوں کی پاسداری وغیرہ کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ بعض اہم سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل بھی ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں بڑے جاندار اور متحرک کردار پیش کیے ہیں جن میں زندگی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔قمر جمالی نے عورت کے کردار کی بہترین تصویریں اپنے افسانوں میں پیش کی ہیں۔ان کی عورت گھر کی چاردیواری سے باہر ہوتے ہوئے بھی حوصلہ مند، وفادار اور مشرقی اقدار کی پاسدار ہے۔اس کے علاوہ مرد کرداروں میں بھی

زندگی کی حرارت دکھائی دیتی ہے۔قمر جمالی کو مکالمہ نگاری پر مکمل دسترس حاصل ہے۔انہوں نے طویل اور مختصر دونوں طرح کے مکالمے کرداروں کے ذریعے ادا کروائے ہیں۔ان کے مکالمے کے ذریعے کرداروں کی ذہنی کیفیات،خیالات وجذبات واحساسات اورایک دوسرے کے درمیانی روابط کا بھی پتہ چلتا ہے۔وہ مختلف کرداروں کی نفسیات کا گہرا شعور رکھتی ہیں تبھی تو ان کے مکالموں کے ذریعے وہ ان کرداروں سے اسی انداز میں گفتگو کرتی ہیں۔جیسی کہ وہ شخصیت رکھتا ہے یعنی ماں کی زبانی ادا کروائے گئے مکالموں سے ایک ماہ کے جذبات واحساسات کا علم ہوتا ہے۔اس کے علاوہ میاں بیوی، عاشق اور معشوق امیر اور غریب چھوٹا اور بزرگ شخص کے درمیان گفتگو کروا کران شخصیات کا بہتر تعارف کروایا ہے۔اس کے علاوہ ان کی علمیت اور قابلیت کو بھی محفوظ رکھا ہے اور شہری ودیہاتی زبانوں کے مخصوص مکالموں کے ذریعے بھی اپنے افسانوں میں جان پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔جذبات نگاری کی بہترین اور عمدہ مثالیں ان کے افسانوں میں بکھری پڑی ہیں۔انہوں نے انسانی جذبات کے کئی رویوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ماں اور بیٹی اور اس طرح کے کئی رشتوں کے درمیانی جذباتی لمحات اور احساسات اور نفسیاتی کشمکش کی کئی مثالیں ان کے افسانوں میں ملتی ہیں۔محبت،نفرت، انتقام،حسرت غم اور خوشی سبھی انسانی جذبات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔غرض قمر جمالی کو انسانی نفسیات کا بھرپور علم ہے وہ رشتوں کا احساس اوراحترام جانتی ہیں۔اسی لیے ان کے تمام کردار جاندار اور متحرک نظر آتے ہیں۔اوران کی جذباتی کشمکش اور نفسیاتی کیفیات سے قاری کا تجسس اور بڑھ جاتا ہے اور تاثر شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ان کی جذبات نگاری کی وجہ سے ان کی تمام کہانیاں قاری کو بے حد متاثر کرتی ہیں۔

قمر جمالی کو منظر نگاری کے علاوہ جزئیات نگاری پر بھی کمال حاصل تھا انہوں نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی تہذیب، یہاں کے رہن سہن وغیرہ کی عکاسی بڑی عمدگی سے کی ہے۔

زبان وبیان پر انہیں بھرپور قدرت حاصل ہے غزلوں میں سادگی کی بجائے مشکل زبان کے استعمال پر زیادہ توجہ دیتی ہیں لیکن باوجود اس کے کہ ان کے افسانے میں تاثر اور دلکشی برقرار رہتی ہے بڑا شگفتہ اور پرلطف اسلوب استعمال کیا ہے۔اس کے علاوہ بعض اہم مسائل پر غور وفکر کی دعوت بھی دیتی نظر آتی ہیں۔

خود کلامی اور فلیش بیک کی تکنیک کے تجربے بھی ان کے یہاں ملتے ہیں ہیں ان کے افسانے کی تمام خصوصیات کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بلاشبہ عصر حاضر کے افسانہ نگاروں میں منفرد حیثیت کی حامل افسانہ نگار

کہلائی جانے کی مستحق ہیں۔

ب) ناول نگاری:

قمر جمالی اُردو کی معروف اور سینئر فکشن رائٹر ہیں، ان کے متعدد افسانوں کے مجموعہ منظر عام پر آچکے ہیں۔ ''آتش دان'' ان کا پہلا ناول ہے، جو بڑے اہتمام واحتشام سے شائع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔قمر جمالی نے ''آتش دان'' لکھ کر اپنی تخلیقیت اور فنی بصیرت کا مسلم ثبوت ادبی دنیا کو فراہم کیا ہے۔قمر جمالی ناول ''آتش دان'' کے متعلق اپنے تاثرات اس طرح بیان کرتی ہیں کہ:

> ''یہ میری پہلی کوشش ہے۔اس لئے اس کی بابت ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے۔امید ہے کہ ہم نے جس ''آتش دان'' کو حساس دلوں میں جلتا رکھنے کی کوشش کی ہے اگر اس کی ایک چنگاری بھی روشن ہوگئی تو ہماری محنت رائیگاں نہیں گئی۔'' (۲۴)

اس ناول میں تقریباً تمام خوبیاں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں۔ ''آتش دان'' نہایت ہی سہل اور آسان زبان میں لکھا گیا ہے جس میں فلسفے کو ایک لطیف انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اشاروں کنایوں میں زندگی کے فلسفے کو سمجھایا گیا ہے۔گاؤں کے کسانوں کی مظلومیت، انانیت اور سیاست کے سہارے کی غنڈہ گردی، دولت اور قبیلے کے بل بوتے پر ڈکیٹیٹر شپ کی چکی میں پسے ہوئے عام انسان کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ناول نگار نے ایک چھوٹے سے دیہات کے ذریعہ ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کو پیش کیا ہے۔قمر جمالی نے ''آتش دان'' کے ذریعے یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید ہندوستان میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی جگہ سیاسی لیڈروں نے لے لی ہے۔ ''آتش دان'' زندگی کے رزمیہ ہی کو پیش نہیں کرتا بلکہ رزمیہ کے ساتھ ایک نظریہ اور فلسفہ کو بھی پیش کرتا ہے۔

قصہ کی شکل میں کرداروں کے توسط سے کہ یہی کردار اور ان کی تکرار ہی نظریہ فلسفہ کو جنم دیتی ہے۔اور ناول صرف تکرار کا قصہ نہیں رہ جاتا۔زندگی کا نرم گرم فلسفہ بن جاتا ہے۔قمر جمالی نے داستان اور قصہ کے فنکارانہ اور مفکرانہ امتزاج سے تاریخ، زندگی، سیاست، طاقت کو جس انداز سے شیر وشکر کیا ہے وہ ان کے فکر وفن کی مہارت کا پتہ دیتی ہے اور پھر ایسے تخلیقی وتفکری جملے ادا ہوتے ہیں:

> ''دل کو اتنا بھی بڑا نہیں ہونا چاہئے کہ سینے کا صندوق چھوٹا پڑے۔کہتے ہیں فریادیں

بے اثر ہوجاتی ہیں، تو انسان بغاوت پر اُتر آتا ہے۔‘‘(۲۵)

پلاٹ کے اعتبار سے بھی یہ ناول اہم ہے۔ ناول کا پلاٹ سیدھا سادا اور منظّم ہے۔ واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ قاری کا تاثر شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ کہانی میں تجسس اور دلچسپی بھی آخر تک قائم رہتی ہے۔ اس طرح ناول میں کردار نگاری بھی بڑی علیحدگی سے کی گئی ہے۔ ناول میں ہمیں جیتے جاگتے زندہ اور متحرک کردار نظر آتے ہیں۔

قمر جمالی نے مکالمہ نگاری میں اپنی فن کاری کا اچھا مظاہرہ کیا ہے۔ اور ہر کردار کی زبان سے ایسے مکالمے ادا کروائے ہیں جو بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔ میر مدار اور فسر کے درمیان کے مکالمے اور جذباتی کیفیت اور متاثر کن ہے۔

منظر نگاری کے بھی بہترین نمونے اس ناول میں پیش کئے ہیں۔ انہوں نے ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو قصے سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔

ناول ’’آتش دان‘‘ کا اسلوب نہایت سلیس، سادہ اور آسان ہے۔ مصنفہ نے ناول میں تخلیقی اور معیاری زبان کا استعمال کیا ہے۔ حسین اور دلکش استعارات، ضرب الامثال، کہاوتیں اس ناول میں بڑی عمدگی سے پیش کئے گئے ہیں۔ قمر جمالی کا ناول ’’آتش دان‘‘ فنی نقطہ نظر سے کامیاب ناول ہے۔ انہوں نے اس ناول میں اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ زبان و بیان ہو یا تکنیک ناول پڑھنے کے بعد اس کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ انہوں نے بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ موضوعات و مسائل کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی وجہ سے یہ ناول قاری کو پڑھنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ قمر جمالی نے اس وقت مارکسی نظریہ کو احیائے نو بخشا جب ہمارا اُردو ادب نئے نظریات کے دھندلکوں میں کہیں گم ہوگیا تھا۔ اور حقیقت نگاری کے بجائے غیر منکشف چیزوں پر زور دیا جاتا تھا۔ قمر جمالی کا ناول ’’آتش دان‘‘ اسی فلسفہ حیات کی ایک عمدہ مثال ہے۔ جس میں زندگی کی پیچیدگیوں کو پیش کیا گیا ہے۔

ان کا یہ ناول رومان، خاندان، پاندان وغیرہ سے الگ ایک ’’آتش دان‘‘ کو پیش کرتا ہے۔ جو شروع تو ہوتا ہے انسان کی ذات سے لیکن پھیل جاتا ہے سماج اور معاشرے میں اسی لئے وہ زندگی کا ’’آتش دان‘‘ بن جاتا ہے۔ جس کی لو سے سنگھرش کی داستان بیان ہوتی ہے۔ زندگی ہر دور میں جلتی اور سلگتی رہی ہے۔ اسی آگ سے انسان کندن بنتا ہے اور زندگی بھی سونے کی طرح چمک اٹھتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مصنفہ، ناول نگار زندگی کو کس زاویہ

سے پیش کر رہی ہے اور اس کا نظریہ حیات کیا ہے۔قمر جمالی ترقی پسند احساسات ونظریات کی قلمکار ہیں۔اس لئے ناول کوحسن ونشاط پر ہی ختم ہونا تھا اور ہوا۔اسی لئے ناول ختم ہوتے ہوتے آتش داں سے گلدان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ایک گلدان جس میں پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی ہوا کرتے ہیں۔ناول کے اختتام پر ناول کا کامیابی کے سرور اور جشن کامیابی کوطوالت کے ساتھ دکھا کر موڑ کو اختتام میں ضم کر دیا گیا ہے۔اس کے باوجود اسی مقام پر چند ایسے جملے بھی ہیں جو متاثر کرتے ہیں:

''زندگی کا جواب نہیں۔جب تک مسائل تھے، زندگی تھی، بے سکونی و بے اطمینانی تو حیات کا سرچشمہ ہے۔زندہ رہنے کے لئے زندگی کی شوریدہ سری ہی تو زندگی کی ضامن ہے۔''(۲۶)

مجموعی طور پر قمر جمالی ایک ایسی نسائی آواز ہے جو اپنی تحریروں کی وساطت سے اُردو دنیا میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ان کے فن پاروں کی زبان شستہ اور معیاری ہے۔وہ الفاظ کو نگینوں کی صورت جڑنا جانتی ہیں۔ان کا ذوقِ جمال ان کے ناول آتش دان میں نکھر کر سامنے آیا ہے۔''آتش دان'' میں جاگیردارانہ ظلم وجبر اعلیٰ افسر شاہی، معاشرتی اور سیاسی وسماجی حال کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔انہوں نے اپنے ناول میں پیچیدہ لب و لہجے سے گریز کیا ہے۔انہوں نے اپنے ناول میں کہیں کہیں تلگو اور انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔جو ناول کے اسلوب میں چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔چھوٹے چھوٹے جملے یا فقرے سے ایک صوتی آہنگ پیدا کر دیتے ہیں۔کہانی میں ان کا لب ولہجہ سادہ اور سپاٹ ہے۔انہوں نے تمام واقعات کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے انسانی فطرت کے تمام اسرار و رموز کی مضبوط گرہیں کھولنے کی سعی میں اپنی کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔آتش دان بلاشبہ عصر حاضر کا ایک اہم ناول ہے جو قمر جمالی کی تخلیقی صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے۔

ج) ڈرامہ نگاری:

قمر جمالی نے افسانہ نگاری کے علاوہ ڈرامہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔انہوں نے ڈرامے ریڈیو کے لئے لکھے تھے، جو ریڈیو پر نشر بھی ہو چکے ہیں۔یہ نشری ڈرامے کتابی صورت میں "سنگریزے" کے عنوان کے تحت 1933ء میں خورشید پریس، چھتہ بازار حیدرآباد سے شائع ہو چکے ہیں۔جس کا انتساب "بے نور" آنکھوں کے نام کیا ہے۔یہ کتاب اردو اکادمی آندھرا پردیش کے جزوی مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔اس مجموعے میں کُل پانچ

(5) ڈرامے ہیں مثلاً ریشما، یودتیا، تنہا تنہا، سنگریزے اور انوکھے لوگ۔

اس مجموعے کا مقدمہ رفعت سروش نے لکھا ہے۔" کہی ان کہی" کے عنوان کے تحت قمر جمالی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے رفعت سروش لکھتے ہیں:

''میرے مطالعے کے مطابق سنگریزے کسی خاتون ڈرامہ نگار کا پہلا مجموعہ ہے۔ یوں بھی ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے اکا دکا ہی چھپتے ہیں اور یہ امتیاز قمر جمالی کو ان کے ہم عصروں میں میں نمایاں مقام عطا کرے گا۔" (۲۷)

قمر جمالی نے اپنی ڈرامہ نگاری کی ابتدا 1975ء تا 1985ء کے دوران کی ہے۔اور یہ وہ دور تھا جب حیدر آباد میں ڈرامہ نگاری کا سنہری دور تھا اور لوگوں میں ریڈیو ڈرامے کافی مقبول تھے۔ بڑی بے چینی سے لوگ ان ڈراموں کا انتظار کرتے تھے اور یہ ڈرامے ریڈیو پر سنا کرتے تھے۔ان کا پہلا ڈرامہ ریشما کے ریڈیو پر نشر ہوتے ہی انہیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور یکے بعد دیگرے کئی ڈرامے منظر عام پر آئے۔اپنی ڈرامہ نگاری کے بارے میں قمر جمالی لکھتی ہیں:

''75 تا 85ء کا زمانہ حیدر آباد میں ریڈیو ڈرامے کا سنہری دور تھا۔اس زمانے میں حیدر آباد سے (Comiticon Sprit) میں ڈرامے نشر ہوا کرتے تھے۔سامعین کا ذوق بھی عروج پر تھا۔ادھر ڈرامہ نشر ہوا ادھر نتائج برآمد۔ڈرامہ ریشما کے بعد جو مہمیز لگی تو سامعین نے میرے ہاتھ میں چابک تھما دی۔پانچ سال کے مختصر عرصے میں میں نے بہت ڈرامے لکھے۔'' (۲۷)

قمر جمالی کے پہلے ڈرامہ ریشما میں سات کردار ہیں۔ 1۔ ریشما 2۔ نجیب: ریشما کا محبوب 3۔شمشیر خان: ریشما کا منگیتر 4۔شیر خان: ریشما کا چچا 5۔سریر: فارسٹ آفیسر 6۔عبدل: صحرادار 7۔ماں: سریر کی ماں۔

ڈرامہ "ریشما" کا مرکزی کردار ریشما ہے۔یہ ڈرامہ 8 اکتوبر 1975 کو AIR حیدر آباد سے نشر کیا گیا۔ یہ ایک رومانی ڈرامہ ہے۔ بے لوث محبت کی کامیابی اس ڈرامے کا موضوع ہے۔ڈرامے کا پلاٹ مربوط ہے۔گرچہ پلاٹ طویل ہے لیکن مصنفہ نے بڑی چابکدستی سے اختصار پیدا کیا ہے۔ڈرامے میں صوتی اثرات اور موسیقی کا ذکر عمدہ ہے۔زبان و بیان پوری طرح سے ڈرامائی ہے۔کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری کے بہترین نمونے موجود ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ریشما: ناجی!

نجیب: ہاں

ریشما: یہ میری کون سی تصویر ہے۔

نجیب: دسویں

ریشما: اتنی ساری تصویروں کا کیا کرو گے؟

نجیب: اس ایک تصویر کو چھوڑ کر باقی نو 9 تصویروں کی قیمت میں تمہارے بابا کو دوں گا۔

ریشما: اور یہ تصویر!

نجیب: یہ تصویر میرے فن کی معراج ہوگی۔ میرے احساس میں انگڑائیاں لیتی، میرے آرزؤں، رنگوں اور رنگوں کی آمیزش سے میں اس تصویر کو ایک لازوال شاہکار بناؤں گا۔تمہیں کیسی لگی یہ تصویر ریشما؟

ریشما: بہت اچھی لگی۔مگر ٹھڈی پر اس تل کو ذرا گہرا کرونا۔نہیں تو میں خود کو کیسے پہچانوں گی۔ سچی بات تو یہ ہے ناجی یہ تصویر مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔

نجیب: (چہک کر) سچ۔تم سے بھی زیادہ خوبصورت ہے! ایسا ممکن نہیں ہے ریشما۔ میں تو سوچ رہا ہوں، اگر میرا برش بہکے بغیر تمہارے نقوش ابھارنے میں کامیاب ہوگیا تو سمجھو میری یہ محنت دنیائے مصوری کا ایک لافانی شاہکار ہوگی۔مگر تو ہو اس بلا کی حسین کہ برش کانپنے لگتا ہے۔

ریشما: ناجی یہ تصویر بابا کو دکھانے کے ل لئے دو گے۔

نجیب: ابھی نہیں۔ پہلے میں اسے عالمی نمائش میں پیش کروں گا۔ یہ نمائش ہمارے ملک کے باہر ہوگی۔ میں بھی کچھ دنوں کے لئے باہر جاؤں گا۔''(۲۹)

ڈرامہ "پورنیما" میں نو (9) کردار ہیں۔ 1) پورنیما (جو بعد میں رادھا کا کردار بھی ادا کرتی ہے۔)۔2) ونود (اویناش کردار میں بھی ونود ہی ہے)۔3) واصف (ونود کا دوست)4) ڈاکٹر 5) چوکیدار 6) سردار وکاس چندر (ویناکشی قبیلے کا سردار)7) دیوان جی 8) پاروتی (تعمیری مزدور)9) وقار مرزا (تعمیری پروجیکٹ کا سپروائزر) مرکزی کردار پورنیما اور ونود ہیں۔ یہ ڈرامہ اکتوبر 1987ء کو AIR حیدرآباد سے نشر کیا گیا ہے۔قمر جمالی

کا ڈرامہ "پورنیما" کی فضا آسیبی ہے اور آخر تک (Suspense) باقی رہتا ہے۔قبرستان کی سنسان فضا کو قمر جمالی نے مناسب لفظوں اور صوتی اثرات کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ ویران محل کی صوتی منظر کشی بھی قابلِ تعریف ہے۔ مگر ڈرامہ اتنا گنجلک ہے کہ اسے ایک بار سن کر سمجھنا آسان نہیں۔اس میں "وکاس پور"، "وکاس محل" اور اس سنسان بیابان میں زیرِ تعمیر ہوٹل کو کہانی میں رنگ بھرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ بات صرف اتنی ہی ہے کہ لندن کے انٹر یو کا ایک ذمے دار افسر وقار مرزا بن کر اس ڈرامے میں موجود ہے۔ جسے اپنے بھائی کے قاتل اور ایک بین الاقوامی مجرم پرکاش کو معہ ثبوت گرفتار کرنا ہے۔مگر اس ڈرامے میں اس کی تکمیل نہیں ہوسکی ہے۔ ہر حرف ایک مکالمے سے واضح ہوتا ہے۔مقدمے میں رفعت سروش ڈرامے کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

> ''میرا تاثر یہ ہے کہ یہ ڈرامہ زندگی کی حقیقتوں سے بہت دور ہے اور مصنفہ کی تحریر کی چستی اور مکالمے کی برجستگی اور فضا آرائی کے باوجود یہ ڈرامہ ایسا ہی ہے جیسے آجکل پیچ در پیچ پلاٹ پلاٹ لے کر فلمیں بن رہی ہیں۔جن کو جب تک دیکھتے رہئے ذہن اس فضا میں منہمک رہتا ہے اور فلم ختم ہونے کے بعد کوئی تاثر باقی نہیں رہتا۔'' (۳۰)

ڈراما "تنہا تنہا" 13 مارچ 1984 کو آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر کیا گیا ہے۔اس ڈرامے میں آٹھ (8) کردار ہیں۔ 1) بھوک: مجسم ہو کر بولتی ہے۔ 2) شیاملی: جوان لڑکی (بعد میں اس کا نام رجنی ہوتا ہے۔ 3) ماں: شیاملی کی ماں 4) مانٹی: پاپ سنگر 5) اناونسر 6) بابا 7) وشال: بابا کا بیٹا 8) سنیل: ایک بدمعاش ڈرامے کا مرکزی کردار شیاملی ہے۔ڈرامے کا موضوع عورت کی تنہائی کا احاطہ کرتا ہے۔ایک عورت کا کردار جو دنیا کے نشیب و فراز کا تختۂ مشق بنتی ہے۔ کہیں ٹھوکر کھاتی ہے کہیں دھتکاری جاتی ہے۔ کہیں اپنائی جاتی ہے اور کہیں خود ٹھوکر مار کر تنہائی کو اپنا مسکن بنالیتی ہے۔ڈرامے میں حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے۔سماج میں عورت کی صورتحال کے ایک پہلو کو بحسن خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔فنی اعتبار سے ڈرامے کا پلاٹ مربوط ہے۔کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے ساتھ صوتی اثرات اور موسیقی کا ذکر ایک کامیاب ریڈیو ڈرامہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

"سنگریزے" ڈراما 8 جنوری 1988 کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کیا گیا ہے۔اس ڈرامے میں پانچ (5) کردار ہیں۔ 1) سیف احمد فراز (ایک نوجوان لڑکا کرنل فیضان کا بیٹا جو اپنے والد کا ہم شکل ہے۔) 2) بتی بابا: حویلی کا نگران 3) وحیدے: بتی بابا کی بیوی 4) شکورے: احسان کا ملازم 5) مائی: احسان کی بیٹی مرکزی کردار سیف

احمد فراز اور مائی ہیں۔ مائی کا صرف ایک مکالمہ ہے مگر پورے ڈرامے میں اس کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ ایک محبت زدہ لڑکی کی کہانی ہے جو چھپ کر ایک شخص سے پیار کرتی ہے مگر کسی پر ظاہر نہیں کرتی۔ وہ پیار میں اس قدر دیوانی ہے کہ اس شخص کے ہم شکل بیٹے کو دیکھ کر اسی کو ہی سمجھ بیٹھتی ہے اور رات کو چھپ کر اس کا دیدار کرتی ہے۔ ڈراما رومانہ ہے۔ مگر قمر جمالی نے اس قدر ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے کہ ڈراما کے پورے ماحول میں تجسس اور آسیبی فضا چھائی ہوئی ہے۔ رفعت سروش لکھتے ہیں:

> ''سنگریزے" قمر جمالی کے مشاق قلم اور تخلیقی ذہن کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ اس ڈرامے میں قلم کی تحیر آمیزی اور مکالموں کی چستی اور بے ساختگی شباب پر ہے۔ (Suspense) پیدا کرنے کی عادت نے قمر جمالی کو یہ فن بخشا ہے کہ سامنے کی بات اس طرح گھما پھرا کے کہے کہ ہر منظر ڈرامائی انداز سے ظاہر ہو اور ڈرامائی انداز سے ہی آنکھوں سے اوجھل ہو۔'' (۳۱)

ڈراما "اونچے لوگ" 15 فروری 1989ء کو آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں سات (7) کردار ہیں۔ 1) شیراز: فسادزدہ لڑکا 2) سارہ: نٹ کھٹ لڑکی 3) جاوید: شیراز کا دوست 4) ابو: سارہ کے ابو 5) دڈو: ابو کی دادی 6) اکمل اور 7) اجمل (سارہ کے بھائی)

"اونچے لوگ" بہت صاف ستھرا اور زندگی کی سچائیوں کی تاریخی دھوپ میں دمکتا ہوا ڈراما ہے۔ اعلیٰ اخلاقی اقدار اور انسانی زندگی کی نفسیات اس ڈرامے کا جوہر ہے۔ مکالموں کی چستی، تحیر آمیزی اور برجستگی کی ایک اچھی مثال ہے۔ مکالموں میں ٹکراؤ ہو تو ڈرامے کی گرہیں کھلتی ہیں اور کرداروں کے چہروں سے نقابیں اُٹھی چلی جاتی ہیں۔ یہ صفات قمر جمالی کے اس ڈرامے میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

غرض قمر جمالی کے یہ پانچ (5) ڈراموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کی تخلیقی صلاحیت کے غماز ہیں۔ وہ پلاٹ سازی کی اچھی صلاحیت رکھتی ہیں۔ واقعات کے غیر ضروری تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے، ایجاز واختصار کے ساتھ پلاٹ کو مرتب کرتی ہیں۔ زبان و بیان میں اس قدر ڈرامائی انداز ہوتا ہے کہ تحیر و تجسس کی فضا چھا جاتی ہے اور یہ ڈراموں کے لیے بہت ضروری ہے۔ ڈراموں کے مکالمے ریڈیو کے لیے جان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قمر جمالی نے اپنے ڈراموں میں جان پیدا کرنے کے لئے مکالمے پر کافی محنت صرف کی ہے۔ ان کے

مکالمے نہ صرف عمل سے مربوط ہیں بلکہ کردار کی شخصیت اوران کے جذبات کا اظہار بھرپور طریقے سے کرتے ہیں۔ منظر نگاری بھی جگہ جگہ ان کے ڈراموں میں نظر آتی ہے، جس کے مطالعے سے سارا منظر نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

تصادم اور کشمکش کی کیفیت بھی ان کے ڈراموں کے مخصوص اجزاء ہیں۔کرداروں کی داخلی کشمکش میں اکثر انہوں نے کرداروں کی خود کلامی کی تکنیک سے کام لیا ہے۔اس کے علاوہ فلش بیک کی تکنیک کا تجربہ بھی ان کے ڈراموں میں نظر آتا ہے۔غرض نثری ڈرامے لکھ کر انہوں نے ڈرامہ نگاری کے باب میں اضافہ کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔مقدمہ کے آخر میں رفعت سروش کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

'' مجھے یقین ہے کہ قمر جمالی کے "سنگریزے" ناقدین فن کی نظر سے گزر کر جواہر پاروں جیسی آب وتاب حاصل کریں گے۔''(۳۲)

قمر جمالی کے یہ ڈرامے ادبی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔اوران کا مجموعہ "سنگریزے" اردو کے نثریاتی ادب کا ایک سنگ میل ہے۔

د)انگریزی تراجم:

قمر جمالی کی تصانیف کے دوسری زبانوں میں بھی تراجم ہو چکے ہیں ان کی فہرست اس طرح ہے۔

1۔ فاتح عالم(افسانہ)انگریزی زبان میں چھپا ہے جسے پروفیسر راجندر سنگھ ورما نے چنڈی گڑھ یونیورسٹی سے بعنوان(Conqueror of the World)شائع کیا۔

2۔ ان کا افسانہ "اگنی درویش" انگریزی زبان میں بھی اسی نام سے چھپا ہے جسے پروفیسر راجندر سنگھ ورما نے ترجمہ کیا ہے اور یہ(Symphony monthly) کٹک سے شائع ہوا ہے اسی کہانی کو ہندی زبان میں ڈاکٹر اہلیہ مترا نے ترجمہ کیا اور یہ(Sankalpon ke saaye) میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔

3۔ افسانہ "اپج" کا ترجمہ اڑیا (Oriya) زبان میں ڈاکٹر نسیمہ بانو نے (Ankur) کے نام سے کیا جو (literary edition of daily news Jhamkar"Jhamkar") کٹک(Orissa) 1995ء میں شائع ہوا۔

4۔ افسانہ " کھنڈر" کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر عافیہ بانو نے کیا اور یہ (South Asian review) سے 2009ء میں شائع ہوا۔

5۔ افسانہ " کفن" کوشری ایم۔اسدالدین نے انگریزی میں (Shroud) کے نام سے New Urdu fiction by Katha سے 2008ء میں شائع ہوا۔

6۔ مسلم خواتین کو قومی دھارے میں لانے کے لیے "لائحہ عمل" کا ترجمہ خود قمر جمالی نے انگریزی زبان میں (Main Streaming The Indian Muslim Women) کے نام سے کیا جس کو MANUU نے 2017ء میں(Main Streaming The Indian Muslim Women The Way Forwarded-) نام سے شائع کیا۔

7۔ ناول " آتش دان" کو ہندی زبان میں آتش دان کے کے نام سے منشی نارائن سودھین نے ترجمہ کیا جس کو (Under pego titation) نے شائع کیا۔

8۔ ان کا افسانہ "درد کا رشتہ" کو Mr. Satnam Singh Bandwi نے پنجابی زبان میں ترجمہ کیا جو سنجھی سر پبلیکیشنز راجپورہ اسے 2019ء میں شائع ہوا۔

☆ محرکات ورجحانات

الف) سماجی وفلاحی خدمات:

قمر جمالی کو خداوند قدوس نے خوشحال زندگی عطا کی ہے وہ اپنی بچیوں، دامادوں اور نواسیوں میں خوش ہیں۔ اپنی خوشیوں میں دوسروں کو بھی شریک کرنے کو وہ امتیازی وصف قرار دیتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے انٹرویو دینے کے دوران اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ کسی بھی سماجی وفلاحی تنظیم کے رکن کی حیثیت سے باضابطہ خدمات انجام نہیں دیں لیکن اسما اور شاہین جیسی تنظیموں میں غریب اور ضرورت مند خواتین کی مدد کرنے میں نہ صرف وہ بلکہ ان کے شوہر بھی باضابطہ رقومات کی فراہمی پر توجہ دیتے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے ملاقات کے دوران یہ بھی بتایا کہ فلاحی اداروں کے جلسوں میں شرکت اور غرض مند لوگوں کے مسائل کو پیش کرنے کے لئے انہوں نے قلم کو بطور

وسیلہ بھی استعمال کیا۔اس طرح باضابطہ سماجی وفلاحی اداروں سے وابستگی اختیار کرنے کے بجائے "اسمیتا" جیسی تنظیم کے ذریعے نہ صرف ہر طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین کے مسائل اور ان کی ترقی کے لیے منعقد ہونے والے سیمیناروں میں شرکت کی بلکہ اپنی صالح رائے سے بھی نوازکر "اسمیتا" کوفروغ دینے میں خصوصی توجہ مرکوز کی۔

ابتدا ہی سے قمر جمالی کا رجحان خواتین پر ہونے والے مظالم کی روک تھام تھا۔ مذہبی عقیدت کے نام پر عورت پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کے خاتمے کی طرف مرکوز رہا۔یہی وجہ رہی کہ انہوں نے اپنی زندگی کے نصب العین کو خواتین کی ترقی اور خاص طور پر پسماندہ طبقات ہی نہیں بلکہ مسلم طبقے میں خواتین کے تعلیمی اوسط میں اضافے کے لئے جدوجہد جاری رکھی۔جس کے لیے انہوں نے صرف انسانوں اور تحریک اس بیداری کا ثبوت نہیں دیا بلکہ عملی طور پر بھی کام انجام دے کر عورتوں کی ہمہ جہت ترقی پر بھی خصوصی توجہ دی۔سماجی اور فلاحی کاموں کے پس منظر میں ان کا زیادہ وقت خواتین کی بھلائی کے لئے صرف ہوتا رہا۔اور انہوں نے مذہب، ذات، ترقی اور نسل کے حدود سے آگے بڑھ کر ہر غرض مند کی مدد کر کے خواتین کو اعلی مقام پر پہنچانے کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔اس سے ان کے جذبہ انسانیت اور اپنے وطن سے بے ساختہ محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔غرض قمر جمالی کی زندگی اپنی اور اپنے خاندان کے ساتھ ساتھ عوامی بھلائی کے لئے بھی صرف ہوتی رہی جس کے لئے دونوں میاں بیوی کی مثالی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ب) ادبی اداروں اور انجمنوں سے وابستگی:

قمر جمالی کا ادبی حلقہ بہت وسیع ہے۔انہوں نے اپنا اثر ورسوخ اسطرح سے بڑھایا ہے کہ ہر انجمن اور محفل میں ان کے نہ صرف چہیتے بلکہ ان کے اپنے معتقد بھی وسیع پیمانے پر موجود پائے جاتے ہیں۔قمر جمالی کی ادبی اداروں اور انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ذیل میں اس کی تفصیلات درج ہیں:

1۔ ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' حیدرآباد کی انہوں نے 1989ء میں باضابطہ رکنیت لی اور تین سمسٹرس (بہ ٹرم دو سالہ) تک سکریٹریٹ رہی ہیں اسی دوران 1995ء میں حیدرآباد میں انجمن کی سلور جوبلی کانفرنس ہوئی یہ کانفرنس ترقی پسند تحریک کے لیے سنگ میل ثابت ہوئی کیونکہ اس میں جو ریزولیشن پاس ہوا اس سے ثابت ہوگیا کہ ترقی پسند تحریک کو جو لوگ مردہ تحریک سمجھتے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ یہ نظریہ اس کانفرنس

کے بعد اور توانا ہو گیا۔ اس میں انہوں نے باضابطہ شرکت کی۔

2۔ 2009ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین اعظم گڑھ کی جانب سے ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں انہوں نے قمر جمالی کو بطور سیکرٹری مدعو کیا تھا۔

3۔ "حلف" حیدرآباد لٹریری فورم کی 2007ء تا 2009ء وہ جوائنٹ سیکریٹری رہ چکی ہیں۔ اور 2010ء سے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ اور کئی مرتبہ وہ صدر مہمان خصوصی کے طور پر بھی اس انجمن میں سرگرم رہی ہیں۔

4۔ "محفل خواتین" حیدرآباد کی 1995ء سے رکن ہیں اور اب رکن عاملہ ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں مثلاً دہلی، کٹک، اڑیسہ، چنڈی گڑھ، الہ آباد، بروڈا اور بینگلور وغیرہ میں بھی وہ کئی اداروں اور انجمنوں سے وابستہ رہ چکی ہیں۔

پروفیسر حبیب ضیا اپنے انٹرویو میں قمر جمالی کی "محفل خواتین" کی ممبر کی حیثیت اور ان کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''حیدرآباد کی باوقار انجمن "محفل خواتین" کی وہ رکن عملہ بھی ہیں کئی دفعہ بحیثیت صدر و مہمان خصوصی اور بحیثیت مقررہ مدعو رہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمی رکن ہیں۔ اسی انجمن میں میری پہلی ملاقات قمر سے ہوئی تھی''۔

5۔ "القلم" لٹریری سوسائٹی بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم "بنات" (Banat) جیسی تنظیموں سے بھی وابستہ رہ چکی ہیں۔

ج) سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت:

قمر جمالی نے اپنے آپ کو ہمیشہ بھیڑ سے دور رکھا وہ گھریلو خاتون کی حیثیت سے خاندان کی خدمت انجام دیتی رہیں۔ لیکن سماجی خدمت کے پس منظر میں انہوں نے مذہب اسلام کی بھرپور پابندی تھی تھی۔ ظاہری پردے سے خود کو الگ رکھا۔ محفلوں میں انہوں نے کبھی پردہ دار خاتون کی طرح شرکت نہیں کی اور ادبی محفل میں بحث و مباحثے کے دوران انہوں نے متوازن کلام کا استعمال کرتے ہوئے کسی کی دل شکنی بھی نہیں کی۔ ادب سے وابستگی اور تخلیقی ادب کی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے افسانوں کی محفلوں میں اور فکشن سیمیناروں میں شرکت کر کے وہ

نہ صرف اپنی منفرد رائے سے عوام کو مستفیض فرماتی رہیں بلکہ مطالعے کی بنیاد پر فن کی باریکیوں کو نمایاں کر کے طرز اظہار کا لوہا منواتی رہیں۔ انہوں نے مختلف سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی غرض سے دہلی لکھنؤ کے علاوہ بیرون ملک جیسے قطر کا بھی سفر کیا۔

قمر جمالی نے ہندوستان میں جن علاقوں کا سفر کیا ان میں دہلی کا سفر ادبی مصروفیت کے سلسلے میں کئی مرتبہ کیا ہے۔ ان کی دوسری کتاب سبوچہ کی رسم رونمائی دہلی کے کانٹی نیوشن کلب میں ہوئی تھی۔ اندر کمار گجرال نے اس کی صدارت کی اور ان کی اس کتاب کو تناظر اپلیکیشن نے چھاپا تھا۔ اور اس کی چیف ایڈیٹر بلراج ورما نے اہتمام کیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ پہلی مرتبہ دہلی گئیں۔ انجمن ترقی اردو ہند نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی 75 ویں سالگرہ کے موقع پر قمر جمالی کو راج بہادر گوڑ پر مقالہ پڑھنے کی غرض سے دہلی مدعو کیا گیا تھا۔ اس وقت اپنے شوہر جناب محمود حامد صاحب کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا۔ بعد ازاں اس مضمون کو انجمن ترقی اردو نے راج بہادر گوڑ کی حیات پر مرتبہ کتاب میں شامل کیا۔ قمر جمالی نے "تناظر" کی ادارت بھی کی تھی اس رسالہ کے پہلے ہی شمارے کو" کتھا" (قومی سطح کا ایک ادبی ادارہ ہے جو ہندوستانی ادب کی ترویج میں منہمک رہتا ہے) اس نے 274 شمارے کو بیسٹ جرنل (Best gournal) ایوارڈ سے نوازا تھا۔ اس ایوارڈ کو بحیثیت پبلیشر حاصل کرنے کے لیے 1997ء میں وہ دہلی گئیں اس مرتبہ بھی انہوں نے اپنے شوہر کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا۔

"اسمیتا" (Asmita) نامی جو خواتین کا ایک ادارہ ہے اس کے کئی سیمینارس میں شرکت کی غرض سے بھی انہوں نے دہلی کا سفر کیا۔ اس طرح قمر جمالی دہلی کے ادبی حلقوں سے آشنا ہوئیں۔

سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کے تحت جب سہ روزہ قومی سیمینار بہ عنوان "اردو افسانہ" منعقد ہوا تو اس میں شرکت کرتے ہوئے قمر جمالی نے اپنا ایک افسانہ پیش کیا تھا۔ 1997ء میں قمر جمالی کو امتیاز میر ایوارڈ ملا اسے حاصل کرنے کی غرض سے وہ لکھنؤ گئیں اور وہاں منعقدہ سیمینار میں ایک مقالہ پیش کیا اور ایک افسانہ بھی۔

قمر جمالی نے مختلف نوعیت کے سیمیناروں میں نہ صرف شرکت کی بلکہ سیمینارس میں دیے گئے عنوان کے ساتھ بھی بھرپور انصاف کیا یہ ان کے تعارف میں ایک نمایاں اور اعلیٰ نوعیت کا اضافہ ہے جس کی فہرست اس طرح ہے:

1) سلور جوبلی کانفرنس آف پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن حیدرآباد 1995ء مارچ

2) سیمینار نیشنل لیول حیدرآباد آف سپریش آف انڈیا 1997ء ستمبر حیدرآباد۔

3) کانفرنس نیشنل فیڈریشن آف پروگریسیو رائٹرز چنڈی گڑھ 1999ء حیدرآباد۔

4) کانفرنس آف نیشنل فیڈریشن پروگرام صف رائٹرز الہ آباد 2000ء مارچ۔

5) بڈان سیمینار "ویمن ویجین اینڈ یا لیٹکس آف بڑودا، گجرات 2001ء جون۔

6) نیشنل کولوریشم آف انڈین رائٹرز آف حیدرآباد 2001ء جولائی۔

اس کے علاوہ انہوں نے ہندوستان بھر میں متعدد سیمینار اور کانفرنسوں میں شرکت کی۔ دہلی، مدراس، چنڈی گڑھ، بینگلور، مالیر کوٹلہ (پنجاب)، اودے پور (راجستھان) جے پور، گجرات، ممبئی، حیدرآباد (تلنگانہ) کی کئی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں متعدد تقاریب میں خطاب کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ویمنس کالج اور دیگر کئی ڈگری کالجس اور تلنگانہ بھر میں ادبی تنظیموں سے وابستہ رہیں۔ اور دیگر کامیابیاں (AIR) 20 سال سے زائد عرصے تک Interviews اور Anchor دور درشن حیدرآباد میں interviews اور news reader اردو میگزین تناظر کی (editor) 1997ء تا 2002ء پانچ سال کال اور روزنامہ کے ادبی ایڈیشن "ہمارا عوام" میں چار سال تک اپنی خدمات انجام دیں۔

د) بیرونی ممالک کا سفر:

ہندوستان کے کئی علاقوں کا سفر کرنے کے ساتھ ساتھ قمر جمالی نے بیرونی ممالک کا سفر بھی کیا ہے۔ بیرونی ممالک کے سفر میں انہوں نے دوحہ (قطر) کے ادیبوں کی جانب سے دعوت نامہ قبول کیا۔ اور بطور ادیبہ کے دعوت نامے پر اس بزم میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ 29 اپریل 2011ء کو "زندہ دلان قطر" جس کے بانی جناب نجیب الرحمٰن مقدس ہیں انہوں نے اردو ڈیرہ کے عنوان سے ایک محفل آراستہ کی اس میں قمر جمالی بھی شریک رہیں اور اپنا افسانہ بھی سنایا۔ اس انجمن کے صدر جناب ممتاز راشد ہیں۔ یکم مئی 2011ء کو بزم اردو (قطر) کی جانب سے ایک خیر مقولی جلسہ ہوا۔ جس میں قمر جمالی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس جلسے میں قمر جمالی نے انسان کی کئی فنی جہتوں پر بھی روشنی ڈالی۔

21/ مئی 2011ء کو انجمن محبان اردو ہند-قطر جس کے بانی جناب ابراہیم کمال صاحب تھے تھے۔ ان کی

جانب سے خیر مقدمی جلسہ کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔جس کا موضوع" حیدرآباد میں افسانہ نگاری" تھا اس جلسے میں قمر جمالی نے بھی اپنی آراء کا اظہار خیال کیا تھا۔

قمر جمالی کے فن پارے درخشندگی اور تابندگی کے جوہر سے بھرپور ہیں۔ یہ ایک فطری تقاضا ہے کہ انسان جس چیز سے لگاؤ زیادہ رکھتا ہے اس چیز کی خوبیوں اور کمزوریوں کو باریک بینی سے رکھ کر چھوڑ دیتا ہے۔قمر جمالی نے موقع بہ موقع سیمیناروں، انجمنوں اور دیگر ادبی محفلوں کے ذریعے ادبی خدمات انجام دیں اور ادبی دنیا میں اپنی ذات کو تابندہ و پائندہ بنایا۔اردو ادب کی تاریخ میں جب خواتین کی خدمات کا ذکر کیا جائے گا اس وقت قمر جمالی کا نام بھی احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

ح) انعامات واعزازات:

قمر جمالی نے آج تک ادبی دنیا کے لئے بہت سے کارنامے انجام دیے ہیں ان کے کارناموں میں جہد اور جگر کاوی کے انمٹ نقوش آج بھی ادبی دنیا کے کتبے پر آب زر سے کندہ ہیں۔ان کی اس کوشش اور سخت محنت کے سلسلے میں انھیں بہت سے انعامات واعزازات سے نوازا گیا۔اکادمی اور انجمنوں سے حاصل شدہ مختلف ایوارڈ مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "شبیہ" 1991ء میں شائع ہوا جس کو آندھرا پردیش اردو اکادمی کی جانب سے دوسرا انعام ملا۔

2۔ "سبوچہ" 1992ء جو کہ ان کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس کی اشاعت 1993ء میں ہوئی تھی اس پر بھی آندھرا پردیش اردو اکادمی کی طرف سے اول انعام ملا۔

3۔ "سنگریزے" ان کے ڈراموں کا مجموعہ ہے جس کی اشاعت 1993ء میں ہوئی تھی اس پر بھی آندھرا پردیش اردو اکادمی کی جانب سے پہلا انعام ملا۔

4۔ آندھرا پردیش اردو اکادمی کی جانب سے ان کے افسانوی مجموعے سحاب 2001ء پر بھی پہلا انعام ملا۔

5۔ آندھرا پردیش اردو اکادمی کی جانب سے ان کے افسانوی مجموعہ طناب 2007ء پر بھی پہلا انعام ملا۔

6۔ "انعکاس" 2014ء جو کہ ان کے تبصروں اور مضامین کا مجموعہ ہے اسے بھی اے-پی سے اول ایوارڈ سے

نوازا ہے۔

7۔ "آتش دان"2015ء جو کہ ان کا پہلا ناول ہے اس کو بھی اے-پی سے پہلے انعام سے نوازا ہے۔

8۔ ساہتیہ اکادمی دہلی کی جانب سے 1995ء میں قمر جمالی کو(travel great to Orissa state) کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

9۔ میرا اکادمی لکھنؤ کی طرف سے امتیاز میر ایوارڈ سے سے انہیں 1997ء میں نوازا گیا۔

10۔ بحیثیت ایڈیٹر انہوں نے کئی سارے اعزازات حاصل کیے ہیں جیسے " کتھا" ایوارڈ دہلی، کتھا جرنل ایوارڈ برائے "تناظر" سہ ماہی دہلی-1999ء

11۔ آندھرا پردیش اردو اکادمی کی طرف سے مجموعی ادبی خدمات ایوارڈ 2007ء برائے فکشن جس میں 25 ہزار روپیہ نقد اور توصیف نامہ شامل ہے۔

12۔ حکومت آندھرا پردیش نے قمر جمالی کو 1997ء تا 1998ء میں ایوارڈ بحیثیت سماجی کارکن سے نوازا۔

13۔ "علمبرداران اردو" ایوارڈ 2017ء میں بزم علم وادب حیدرآباد سے ملا۔

14۔ راجستھان ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے 2018ء میں " قمر رئیس" ایوارڈ سے نوازا گیا۔

15۔ بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم دہلی سے 2018ء میں "عصمت چغتائی" ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

ذ)اعزازات بحیثیت آفیسر:

1۔ قمر جمالی کو سرکاری خدمات کے سلسلے میں حکومت آندھرا پردیش نے Best MRO ایوارڈ سے 2006ء میں نوازا۔

2۔ نیشنل ریڈ کراس سوسائٹی کی جانب سے انہیں 2003ء میں Gold Medal سے نوازا گیا۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱)۔ "قمر جمالی کی کہانیاں" از ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، مطبوعہ "شبیہ" 1990ء، ص 18-17

(۲)۔ بحوالہ ''قمر جمالی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ''، شاہین سلطانہ، ص 43

(۳)۔ ایضاً

(۴)۔ قمر جمالی، ''شبیہ'' ص 28

(۵)۔ روزنامہ سیاست، حیدرآباد، بروز ہفتہ، 19/اپریل 2008ء

(۶)۔ افسانہ ''شبیہ'' از قمر جمالی خورشید پریس حیدرآباد 1990ء صفحہ 50

(۷)۔ ''عنوان''، افسانوی مجموعہ ''شبیہ'' 1990ء، ص:39

(۸)۔ ماہنامہ "شاعر" ممبئی۔ قمر جمالی۔ سوچ و ذہن کی فن کارہ ستمبر 2007ء صفحہ 49

(۹)۔ "پھانسی دے دی گئی" سبو چہ، 1992ء صفحہ 83

(۱۰)۔ مجاور حسین، ایک تاثر، سبو چہ 1992ء صفحہ 22

(۱۱)۔ قمر جمالی "خط کشیدہ" سحاب، اپریل 2001ء

(۱۲)۔ قمر جمالی، آخر کیوں، ''سحاب''، 2001ء ص 91

(۱۳)۔ قمر جمالی، "سحاب" از قمر جمالی، صفحہ 25

(۱۴)۔ قمر جمالی، افسانہ "کنکھجورا" زہاب 2007ء ص 74

(۱۵)۔ قمر جمالی، "کنکھجورا" زہاب، 2007ء ص 70

(۱۶)۔ قمر جمالی، "صحرا بکف" از قمر جمالی، صفحہ 55

(۱۷)۔ مجاور حسین رضوی، ایک تاثر، سبو چہ، ص 24

(۱۸)۔ جوگیندر پال، پیش لفظ، سحاب، 2001ء ص

(۱۹)۔ خاور نقیب، زہاب، 2007ء ص 126

(۲۰)۔ یوسف جمال، زہاب 2007ء ص 104

(۲۱)۔ اندر کمار گجرال، زہاب، 2007ء ص 13

(۲۲)۔ سرینواس لاہوتی، زہاب، 2007ء ص 150

(۲۳)۔ قمر جمالی،من دانم،شبیہ،1990ء ص31

(۲۴)۔ قمر جمالی''آتش دان''،مارچ ۲۰۱۴ء،ص:۹

(۲۵)۔ علی احمد فاطمی''آتش دان''،سنگھرش کی داستان،ماہنامہ سب رس،اگست ۲۰۱۴ء ص:۱۷

(۲۶)۔ قمر جمالی''آتش دان''،مارچ ۲۰۱۴ء،ص:۲۵۰

(۲۷)۔ قمر جمالی،''سنگریزے''،نثری ڈرامے،1993،ص:9

(۲۸)۔ قمر جمالی،''سنگریزے''،نثری ڈرامے،1993،ص:23

(۲۹)۔ قمر جمالی''سنگریزے''1993ء،ص:40

(۳۰)۔ قمر جمالی،''سنگریزے''،نثری ڈرامے،1993،ص:3-4

(۳۱)۔ قمر جمالی،''سنگریزے''،1993ء،ص:19

(۳۲)۔ قمر جمالی،سنگریزے،1993،ص22

باب سوم:

قمر جمالی کا غیر افسانوی ادب (مجموعی جائزہ)

ا) اُردو میں غیر افسانوی ادب: ایک جائزہ

تخلیقی ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب، تخلیقی عمل میں دنیا کی حقیقتوں، مسائل، تجربات، مشاہدات اور احساسات کو قصہ پن کے بغیر ادب اور فن کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ پیش کیا جائے تو ایسی نثر ''غیر افسانوی نثر'' کہلاتی ہے۔

غیر افسانوی ادب میں قصہ بیان کرنے کے بجائے ادیب زندگی میں درپیش حقیقی واقعات پر اپنے احساسات اختیار کردہ مخصوص صنف کی ہیئت کے دائرہ کار میں پیش کرتا ہے۔ فرضی کرداروں اور فرضی واقعات کا تانا بانا جوڑ کر قصے کہانیوں کے رنگ میں جو انسانی تہذیب کا قدیم ترین وصف ہے۔ بیان کیا جائے تو اس طرح کا ادب افسانوی ادب کہلائے گا۔ چنانچہ داستان، ناول، افسانہ، ڈراما اور ناولٹ جیسی تمام اصناف کو افسانوی نثر کا درجہ حاصل ہے۔ غیر افسانوی نثر میں مقالہ، مضمون، سوانح، خاکہ، سفر نامہ، خودنوشت، سوانح، آپ بیتی، طنز و مزاح ،مکتوب، انشائیہ اور رپورتاژ جیسی اصناف کی شناخت کی جاتی ہے۔

قصہ گوئی کا فن قدیم ترین فن ہے۔ داستانوں سے ناول تک ہمارے ادب نے ایک طویل سفر طے کیا اور طویل عرصے تک اُردو ادب پر افسانوی نثر کا غلبہ رہا۔ داستانوں کی صورت میں اُردو کا افسانوی ادب برسوں ترقی کرتا رہا۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور جو بھی علوم وفنون اور نئے خیالات کا فروغ کے نتیجے میں غیر افسانوی ادب ترقی کرنے لگا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کے توسط سے افسانوی ادب کو فروغ حاصل ہوا اور اُردو ادب پر داستانوں کی حکمرانی رہی لیکن 1824ء میں دہلی کالج کے قیام کے بعد غیر افسانوی ادب کی طرف توجہ دی گئی۔ ماسٹر رام چندر اور ماسٹر پیارے لال نے پہلی مرتبہ ہر قسم کی حقیقتوں کی موضوعاتی وضاحت کی جانب توجہ دی۔ جس کی وجہ سے ''مضمون نگاری'' کی صنف کا آغاز ہوا۔

غیر افسانوی نثر کی شروعات میں ''مضمون'' کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ مضمون نگاری کے علاوہ ''سفر نامہ'' کی روایت کا بھی آغاز ہوا۔ چنانچہ محمد یوسف کمبل ہوش نے ''عجائبات فرنگ'' لکھ کر غیر انسانوی ادب میں ایک نئی صنف کا آغاز کیا۔

مرزا غالب کے ابتدائی خطوط کی وجہ سے غیر افسانوی ادب کی نمائندگی ۱۹۵۷ء سے قبل ممکن ہوسکی۔ جس کے بعد غیر افسانوی اصناف آپ بیتی، سوانح، اور خود نوشت سوانح کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ غیر افسانوی ادب کے ذریعے نثر کو فروغ دینے میں سر سید تحریک نے موضوعات اور اسالیب دونوں اعتبار سے بے حد اہم کردار نبھایا۔ انشائیہ، خاکہ، مقالہ اور رپورتاژ جیسی نثری اصناف کے غیر افسانوی ادب کا سرمائے میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ ''اودھ پنچ'' اور اس کے معاصرین کے توسط سے طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کو کافی فروغ ہوا۔ جس کا سلسلہ آج تک بھی جاری ہے۔ نثر کے تمام پیرائے اظہار میں طنز و مزاح نگاروں نے اپنے جوہر دکھائے۔ آج غیر افسانوی ادب میں نثر کی معروف و غیر معروف بے شمار اصناف رائج ہو چکی ہیں۔

جنوبی ہند کے علاقوں میں رائج دکنی زبان کے اندر صوفیانہ تشریحات اور اسلامی قوانین و اصولوں کو سمجھانے کے لئے جو اسلوب اختیار کیا وہ غیر افسانوی ادب کی بنیاد ہے۔ خدا کی ذات، اس کی صفات، نور اور نور کے جلوے اور اسلام کے سربستہ رازوں پر سے پردہ اٹھانے کا کام دکن کے بزرگانِ دین اور صوفیاء کرام نے انجام دیا۔

چنانچہ دکن میں غیر افسانوی ادب کے ابتدائی نقوش ''رسالوں'' کی صورت میں دستیاب ہیں۔ جن میں سے کئی شائع بھی ہو چکے ہیں اور بے شمار قلمی نسخوں کی شکل میں مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ دکن میں تحریر کردہ صوفیانہ، اسلامی، شرعی، فقہ و عقائد کی تشریح کرنے والے تمام رسالے مذہبی ادب کا سرمایہ ہیں لیکن ان میں جہاں تہاں غیر افسانوی تخلیقی ادب کے ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔

طویل عرصے تک اُردو میں افسانوی نثر کا چلن عام رہا اور پھر غیر افسانوی ادب کے ابتدائی نقوش بھی کئی رسالوں سے ظاہر ہونے لگے۔ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط اور ان کی جانب سے نئے علوم و فنون کے فروغ کی کوشش کی وجہ سے غیر افسانوی ادب کے پھلنے پھولنے کا موقع فراہم ہوا۔ ان ابتدائی منتشر اور خام نمونوں کے بعد اُردو کی پہلی غیر افسانوی صنف ''مضمون نگاری'' کو باضابطہ فروغ حاصل ہوا۔

اُردو ادب کے تاریخی پس منظر میں جب غیر افسانوی اصناف کے ارتقاء پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُردو کی بیشتر غیر افسانوی اصناف کی ترقی ۱۸۵۷ء سے پہلے ہوئی اور جب سر سید تحریک نے اپنا اثر دکھایا تو انگریزی ادب اور جو علوم و فنون کے زیر اثر ۱۸۵۷ء کے بعد ایک جانب قدیم اصناف کی ہیئتوں اور مزاج

میں فرق آیا تو دوسری طرف بعض نئی اصناف سے اردو والے روشناس ہوئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید نے بھی سادہ اسلوب کی وکالت کے ساتھ نئی اصناف سے متعارف کیا۔ لکچر یا خطبات کی بنیاد رکھی اور انشائیہ نگاری ان کی ذات سے وابستہ صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ سرسید کے نامور رفقاء نے غیر افسانوی نثر کے فروغ میں اہم بنیادی حصہ لیا۔ ماضی میں اُردو نثر پر افسانوی رنگ حاوی تھا۔ سرسید کے دور میں حقیقت پسندی کی تحریک اور خاص طور پر مبالغہ سے پرہیز کے نتیجہ میں مروجہ نثری اصناف میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اگرچہ پہلی جنگ آزادی سے قبل مضمون، سفرنامہ، آپ بیتی، مکتوب اور خودنوشت لکھنے کی روایت کا آغاز ہو چکا تھا لیکن بعد کے دور میں ان تمام اصناف میں اسالیب، ہیئت اور موضوعات کے اعتبار سے نمایاں تبدیلیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ سائنسی، علمی و ادبی، تاریخی وتدریسی، معلوماتی اور علوم وفنون کے مختلف شعبوں سے متعلق مضامین کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ اس دور میں مضمون نگاری کو ہمہ جہت ترقی حاصل ہوئی۔

ب) غیرافسانوی نثر کی اقسام:

ساری دنیا میں لفظی اظہار و بیان کے ہمیشہ سے دو طریقے رہے ہیں۔

ایک نظم اور دوسرا نثر۔ اس طرح ادب دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ ''نظم'' اور ''نثر'' اگرچہ ادب کی دو شاخیں ضرور ہیں لیکن ہر منظوم تحریر ادب میں شامل نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ قدیم زمانے میں علمی، فنی، طبی اور صرف ونحو کی کتابیں بھی نظم میں لکھی گئی ہیں۔

اسی طرح ہر نثری تحریر بھی ادب میں داخل نہیں ہوسکتی۔ موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے نظم ونثر کی مختلف اصناف ہیں۔ نثری اصناف کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ''افسانوی نثر'' اور ''غیر افسانوی نثر'' اسی کو ''افسانوی ادب'' اور ''غیر افسانوی ادب'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

افسانوی نثر (یا) افسانوی ادب میں داستان، ناولٹ، افسانہ اور ڈراما شامل ہیں۔ ان تمام اصناف میں قصہ یا کہانی قدرِ مشترک ہے یعنی ان اصناف کی بنیاد کہانی یا قصے پر ہوتی ہے۔ اس کے لئے فنکار اپنی غیر معمولی قوتِ متخیلہ، سماجی وسیاسی بصیرت اور تجربے ومشاہدے سے کام لے کے غیر حقیقی واقعات کو حقیقت کے لباس میں پیش کرتا ہے۔

غیر افسانوی نثر (یا) غیر افسانوی ادب میں ہم جن اصناف کو شامل کر سکتے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱)مضمون	(۲)انشائیہ	(۳)مقالہ
(۴)مکتوب	(۵)سفرنامہ	(۶)سوانح نگاری
(۷)خودنوشت سوانح	(۸)آپ بیتی	(۹)خاکہ
(۱۰)رپورتاژ	(۱۱)روزنامچہ	(۱۲)دیباچہ
(۱۳)مقدمہ	(۱۴)تقریظ	(۱۵)تنقید
(۱۶)تبصرہ	(۱۷)تحقیق	(۱۸)تذکرہ
(۹)طنزومزاح		

مندرجہ بالا اصناف کو ان کے مختلف انداز اور نوعیت کے باعث ایک دوسرے سے الگ کیا ہے۔ان کے علاوہ موضوع کے اعتبار سے بھی ان کی مزید تقسیم کی جا سکتی ہے۔

مختلف تحقیقی وتنقیدی مقالہ جات، تذکرے، اخبارات، آرٹیکل، فیچرز وغیرہ بھی غیر افسانوی نثر وادب کی مختلف صورتوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔ایک رائے یہ بھی موجود ہے کہ بنیادی طور پر ان تمام اصناف کو ادب میں ان کے جمالیاتی طرزِ اظہار اور انداز کی وجہ سے شامل کیا ہے۔

غیر افسانوی ادب میں شامل اصناف کی اکثریت ایسی ہے جو مغربی اصناف سے ماخوذ ہیں۔البتہ چند اصناف جن میں مکتوب، تذکرے، سیرت وسوانح اور دیباچے وغیرہ ایسے ہیں جن کی ہمیں مشرقی دنیا میں بھی ایک قدیم روایت نظر آجاتی ہے۔

قمر جمالی کا غیر افسانوی ادب: مجموعی جائزہ

قمر جمالی اُردو ادب کی ایک عظیم فنکارہ ہیں۔ وہ موجودہ صدی کی بہت ہی معتبر اور توانا شخصیت ہیں۔ ان کی تخلیقات ادبی و فنی نقطۂ نظر سے کامیاب اور دنیائے ادب میں شاہکار کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ ایک فکشن نگار کی حیثیت سے انہوں نے اُردو کے سرمایا ادب میں بیش بہا افسانے لکھے ہیں۔ انہوں نے ناول، افسانے اور ڈراموں کے علاوہ غیر افسانوی ادب کے مختلف اصناف میں خامہ فرسائی کی ہے۔ منجملہ ان کے غیر افسانوی نثر میں شامل اصناف مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) تبصرے	(۲) انشائیے	(۳) مضامین
(۴) سفرنامے	(۵) وفیات	(۶) خاکے
(۷) صحافت	(۸) رپورتاژ	(۹) دیباچے
(۱۰) ریڈیو فیچر		

قمر جمالی بنیادی طور پر ایک فکشن نگار ہیں لیکن انہوں نے صرف فکشن پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ادب کی دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ غیر افسانوی ادب میں بھی ان کا ایک اہم سرمایہ موجود ہے۔ انہوں نے مختلف ادیبوں کی متنوع موضوعات پر مشتمل تصانیف کے دیباچے بھی لکھے اور مختلف اصناف ادب سے تعلق رکھنے والی کتابوں پر تبصرے بھی لکھے۔ یہ ان کی ذہنی اپج ہے جو اُن کے قلم کو رُکنے نہیں دیتی۔ اُن کا قلم بہت زرخیز ہے اور مختلف و متنوع موضوعات پر لکھتی رہتی ہیں۔

ج) تبصرے:

قمر جمالی نے مختلف تصانیف پر جو تبصرے لکھے اُن میں سے اکثر مختلف موقّر رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے لیکن ان سب کو انہوں نے کتابی شکل میں شائع کیا جو ''انعکاس'' کے نام سے منصۂ شہود پر آئی۔ اس میں اگرچہ وہ تبصرے شامل ہیں جو پہلے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے تھے لیکن ان تبصروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو انہوں نے کتابوں کے رسم اجراء کے موقع پر پڑھے ہیں۔ قمر جمالی کے تبصروں میں چند تبصرے ایسے بھی

ہیں جواُن کی ذاتی بیاض میں موجود ہیں لیکن اُن کے متعلق کوئی جانکاری نہیں ملتی ہے کہ وہ کہاں سے شائع ہوئے بلکہ اُن کے صرف مسوّدے مل رہے ہیں۔

انہوں نے کل ۳۷ تبصرے تحریر کئے ہیں۔جن کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

☆ مرزادبیرنمبر، بعنوان مرزادبیرنمبر(مجموعہ مقالات) ماہنامہ آندھراپردیش،حیدرآباد، دسمبر ۱۹۹۷ء

☆ پنچھی باورا، بعنوان ''پنچھی باورا-ایک تجزیہ'' روزنامہ سیاست حیدرآباد، ۲ر اگست ۱۹۹۲ء

☆ ورقِ تازہ، بعنوان ''ورقِ تازہ-ایک تبصرہ'' سہ ماہی ناندیڑھ، ایڈیٹرابراہیم اختر، ۲۱ر ستمبر ۱۹۹۳ء

☆ سماج کی یہ بیٹیاں، بعنوان ''سماج کی یہ بیٹیاں-نسائیت کی تجسیم'' تقریب رسم اجراء، بتاریخ ۲۹ر اگست ۱۹۹۴ء بحیثیت معتمد ''انجمن ترقی پسند مصنّفین'' آندھراپردیش، حیدرآباد، ناظم جلسہ۔

☆ اُبھرتے نقوش، بعنوان ''اُبھرتے نقوش-ایک تعارف'' روزنامہ 'ہماراعوام' ۱۸ر اپریل ۱۹۹۹ء

☆ شاخِ صنوبر، بعنوان ''ڈاکٹر کرامت علی کرامت-شاخِ صنوبر کے آئینے میں'' روزنامہ سیاست، ۱۷ر جون ۲۰۰۷ء

☆ بعنوان ''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے'' دسمبر ۲۰۰۷ء کتاب کی رسمِ اجراء پڑھا گیا۔

☆ عکس فریادی، بعنوان ''نسیمہ تراب الحسن-ایک معالج مصنفہ'' روزنامہ سیاست ۷ر جون ۲۰۰۸ء

☆ مشکِ حنا، بعنوان ''مشکِ حنا-ایک تعارف'' روزنامہ، منصف ۱۴ر دسمبر ۲۰۱۰ء، روزنامہ سیاست ۱۶ر دسمبر ۲۰۱۰ء

☆ ٹوٹا ہوا شیشہ بعنوان ''ٹوٹا ہوا شیشہ-میری نظر میں'' طبع شدہ ''رفتارادب'' اورنگ آباد، ٹائمنر، ۱۸ر ستمبر ۲۰۱۰ء

☆ مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا-یادوں کی سرگزشت'' کتاب کی اجراء کے موقع پر پڑھا گیا، ۲۲ر دسمبر ۲۰۱۰ء

☆ آخری پودا، بعنوان ''آخری پودا-ایک تجزیہ'' اجراء پر پڑھا گیا، ۲۲ر جنوری ۲۰۱۱ء

☆ شہرآرزو، بعنوان، ''ایک قدم-شہرآرزو میں''، روزنامہ منصف ۲۷ر اکتوبر ۲۰۱۱ء

☆ زرِنقد، بعنوان ''نقد ونظر میں شاہد پٹھان کا رویہ'' ماہنامہ 'سب رس' حیدرآباد، مئی ۲۰۱۲ء

☆ وہ جسے کہ دل کہیں، بعنوان عاصمہ خلیل تحریروں کے آئینے میں'' 'مشہور' 'انعکاس' ۲۰۱۲ء

☆ اردوناول میں نسائی حسیت، بعنوان ''اُردو ناول میں نسائی حسیت - ایک تجزیہ''، ماہنامہ 'قومی زبان' حیدرآباد، دسمبر ۲۰۱۲ء

☆ تارِنظر، بعنوان ''تارِنظر ایک اجمالی جائزہ'' ماہنامہ 'بزمِ آئینہ' کرنول، مارچ ۲۰۱۵ء

☆ مکتوبات نذیر فتح پوری بنام سلطان اختر، بعنوان ''مکتوبات نذیر فتح پوری بنام سلطان اختر'' مشمولہ نواحِ ادب ۲۰۱۶ء

☆ خشک زمین کے پھول، بعنوان ''خشک زمین کے پھول - ایک تعارف'' روزنامہ منصف (آئینۂ ادب) ۳/جون ۲۰۲۰ء

☆ شہانہ اقبال (افسانہ) بعنوان شہانہ اقبال کی کہانی'' نمودِ سحر' مشمولہ 'اے راحتِ جاں' ۲۰۲۰ء

☆ پرتیبھا رائے کے منتخب اڑیا افسانے، بعنوان پرتیبھا رائے کے منتخب اڑیا افسانے - ایک مطالعہ'' ماہنامہ خواتین دنیا، دہلی، جولائی ۲۰۲۰ء

☆ حامد اکمل، جہات وجستجو، بعنوان چند تصویر بتاں اور - حامد اکمل کے اشعار (بصری پیکروں کا شاعر حامد اکمل) مرتب: غضنفر اقبال، اسیاق پبلیکیشنز (پونے) ۲۰۲۰ء

☆ سماج اور صنفی تصورات، بعنوان ''صنفی تصورات - ایک سماجی تحقیق'' ۲۰/ستمبر ۲۰۲۰ء

☆ شمع افروز زیدی (خاکہ) بعنوان ''محبتوں کا پیکر - نگار عظیم ایک تجزیہ'' ۷/جنوری ۲۰۲۱ء

☆ شمع افروز زیدی (انشائیہ) بعنوان مع افروز زیدی کا 'یادوں کی پروائی' ۱۲/جنوری ۲۰۲۱ء

☆ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر اپنی ہمعصر افسانہ نگاری کے نظر میں (مجموعی طور پر افسانوں پر) ۲۳/مارچ ۲۰۲۱ء

☆ جنہیں میں نے دیکھا جنہیں میں نے جانا، بعنوان ''جنہیں میں نے دیکھا جنہیں نے جانا ایک اجمالی جائزہ'' ششماہی 'بیسویں صدی'، افسانہ نمبر اگست ۲۰۲۲ء

ان تبصروں کا یہاں مجموعی طور پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

قمر جمالی کے تبصروں اور دیباچوں کا مجموعہ ''انعکاس'' نومبر ۲۰۱۲ء میں اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جزوی مالی امداد سے شائع ہوا۔ تزئین وترتیب جناب محمد حامد نے کیا اور اس کا سرورق شمادرّین نے تیار کیا ہے۔ کتاب کا انتساب قمر جمالی نے پاپا آنجہانی جناب بلراج ورما کی محبتوں اور شفقتوں کے نام معنون کیا ہے۔ بلراج ورمانے

جشنِ قمر جمالی کے موقع پر دہلی کانسٹیوشن کلب میں جناب اندر کمار گجرال (سابق وزیر اعظم ہند)، جناب پی شیوشنکر (سابق ایم پی) پروفیسر قمر رئیس (مرحوم) اور دیگر اکابرین شرکاء کی موجودگی میں قمر جمالی کو اپنی ''ادبی بیٹی'' قرار دیا تھا۔قمر جمالی نے اس رشتے کو دل سے قبول کیا۔

''انعکاس'' کے ابتدائیہ میں انہوں نے شیخ سعدیؒ کی ''گلستان'' سے یہ مصرعہ 'بہ نطق بہتر ست از دواب' اخذ کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ انسان کو اشرف المخلوقات کا شرف اس کی زبان سے ملا ہے۔جو دوسروں تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ابتدائیہ میں ہی وہ آگے بیان کرتی ہیں کہ بالخصوص کتابوں کے معاملے میں ہمیشہ سے میری یہی خواہش رہی کہ قاری کتاب پڑھ کر چپ نہ سادھ لے بلکہ React کرے، مثبت ہو یا منفی۔

ابتدائیہ پڑھ کر قاری اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ قمر جمالی عادت سے مجبور ہو کر تبصرے اور دیباچے لکھتی ہیں۔بنیادی طور پر وہ فکشن رائٹر ہیں اور نقد و نظر اُن کا بنیادی میدان نہیں ہے۔اس تعلق سے وہ لکھتی ہیں:

> ''نقد و نظر میرا شیوہ نہیں ہے۔میں بنیادی طور پر فکشن رائٹر ہوں۔مگر......عادت سے مجبور ہو کر گاہے گاہے کچھ کتابوں پر تبصرے اور اپنے دوستوں کے اصرار پر کچھ کتابوں کے دیباچے لکھ کر انہیں قاری سے متعارف کروایا۔''(۱)

''انعکاس میں کل مشمولات ستائیس (۲۷) ہیں جن میں سولہ (۱۶) تبصرے، سات (۷) دیباچے، اور چھ (۶) مضامین شامل ہیں۔یہ مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ان تبصروں میں زیادہ تر افسانہ نگاری سے تعلق رکھتے ہیں یعنی افسانوی مجموعوں پر کیے ہوئے تبصروں کی تعداد زیادہ ہے۔اس کے علاوہ خواتین، قلمکاروں کی تصانیف پر بھی تبصرے شامل ہیں۔'انعکاس' میں شامل تبصروں کو ترتیب دیتے وقت قمر جمالی نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ اس میں شامل تبصروں کے آخر میں تبصرے کی تاریخ تخلیق تاریخ اشاعت اور مقام اشاعت بھی لکھا گیا ہے۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ مشہور و موقر جرائد و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

'انعکاس' میں شامل تبصرے اور ان کے دوسرے تبصرے پڑھ کر قاری ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور ادب کے تئیں محبت سے واقف ہو جاتا ہے۔ان کے بلند خیالات سے روشناس ہوتا ہے۔قمر جمالی بعض اوقات براہِ راست تبصرہ شروع کرتی ہیں لیکن زیادہ تر وہ کسی کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے کتاب کے موضوع سے متعلق بہت سی قیمتی اور انمول باتیں قاری کے ساتھ بانٹ لیتی ہیں اُس کے بعد وہ اپنے موضوع کی طرف قدم بڑھاتی

ہیں۔ وہ پہلے جیسے تمہید باندھتی ہیں کبھی تخلیق کے متعلق تو کبھی تخلیق کار کے متعلق، کبھی کسی صنف کے متعلق تو کبھی ادب کے منظرنامے کا جائزہ لیتی ہیں۔ یہ قمر جمالی کی خوبیوں میں شامل ہوسکتا ہے کیوں کہ وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا خوب سلیقہ رکھتی ہیں۔ قاری کا ذہن تجسس میں پڑتا ہے کہ کوئی اہم بات مصنف اپنے قاری کے ساتھ بانٹ لینا چاہتا ہے۔ ان کے زیادہ تر تبصروں میں انہوں نے یہی طرز اختیار کیا ہے۔ 'انعکاس' میں شامل پہلا تبصرہ 'نقد ونظر میں شاہد پٹھان کا رویہ زرِنقد کی روشنی میں شاہد پٹھان کی تنقیدی مضامین کا مجموعہ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ قمر جمالی نے روایتی انداز میں کتاب کا تعارف پیش نہیں کیا ہے بلکہ پہلے تخلیق کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اُن کے مطابق تخلیق صرف ایک کسبی فصل نہیں ہے بلکہ اس میں وہبی کارفرمائی کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

> ''تخلیق یعنی خلق کرنا خالصتاً بندے کا فعل نہیں۔ اس میں الوہیت کا دخل ہے کیوں کہ جب تک ودیعت نہیں ہوتی صورت گری ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق ہمیشہ سے ماورا رہی ہے۔'' (۲)

قمر جمالی (اُن) کا خیال ہے کہ تخلیق کے باوجود تحقیق ایک ایسا عمل ہے جو زیرنظر مواد میں مداخلت کرتا ہے اور معیارات درج کرتا ہے لیکن اس میں بھی توفیق بہرکیف ضروری ہے۔

قمر جمالی اگرچہ اتنی زود گو اور کثرت سے مطالعہ کرنے والی خاتون ہونے کے باوجود ان کو تنقید ایک مشکل میدان نظر آرہا ہے۔ ان کے مطابق ایک ناقد کا مطالعہ محدود نہیں ہونا چاہئے اور اس میں مشاہدات وتجربات کی کمی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ لکھتی ہیں:

> ''انتقادیات ایک جوکھم کا موضوع ہے۔ اس پر لکھنا تو درکنار پڑھنے کے لئے بھی قاری میں تنقید کے مختلف ابعاد کو ہر پہلو سے سمجھنے کی صلاحیت درکار ہے۔ دریں اثنا ایک اچھے ناقد کا ادب کی معنویت، ماہیت، موضوعات کی بوقلمونی اور تنوع، برجستگی اور ٹھہراؤ ادب کے افادی اور تعمیری افکار کی پہچان، ہم عصر ادبی رجحانات سے واقفیت، ماضی کے ادبی روایات اور تبرکات پارینہ کا احترام، ان تمام امور پر حاوی ہونا ضروری ہے۔'' (۳)

قمر جمالی سوال قائم کرتی ہیں کہ کیا اپنے ہم عصر کے بارے میں اظہار خیال ممکن ہے؟ پھر خود ہی کہتی ہیں کہ 'ایک ہم عصر دوسرے ہم عصر کا آئینہ ہے۔ اگر ایک ہم عصر دوسرے ہم عصر کا آئینہ ہے تو کیا ایک تخلیق کار کو اپنے

ہی مرتبے کا نقاد مل سکتا ہے۔اس کا جواب نفی ہی میں ہوگا کیوں کہ ایک استاد تخلیق کار کو کم علم اور کم سمجھ رکھنے والا نقاد بھی ہم عصر ہوگا جو مکمل طور پر اس کا احاطہ نہیں کر پائے گا یا کبھی کبھار اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ کسی تخلیق کار کو اپنے عہد میں ہی ایسا نقاد ملے جو اس کا آئینہ کہلانے کے مترادف ہو۔

قمر جمالی اسی خیال کو پیش کرتے ہوئے آگے لکھتی ہیں:

''اس میں نہ تو بزرگانہ پند و نصائح ہوتے ہیں اور نہ اُستادانہ تنقید۔''(۴)

تو یہاں بھی اُن کے اس خیال سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کیوں کہ پند و نصائح اور استادانہ تنقید اپنے عہد کے نقاد میں بھی ہوسکتی ہیں۔ایک کم عمر نقاد کا علم ایک عمر دراز تخلیق کار سے بھی زیادہ ہوسکتا ہے۔اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاید قمر جمالی نے یہ الفاظ اپنے لئے استعمال کئے ہیں کہ وہ خود کو ایک ادنیٰ سی قلم کار سمجھتی ہیں۔ یہ اُن کے مزاج کا انکسار ہے جو وہ خود کو ایک کم رُتبہ قلمکار سمجھتی ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ ان کا ادب خصوصاً جنوبی ہند کے اُردو ادب میں بہت اعلیٰ مقام ہے۔

قمر جمالی تصانیف پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔کہیں کہیں تو انہوں نے تصنیف سے زیادہ مصنف کی شخصیت پر زور دیا ہے۔اُن کا خیال ہے کہ فن آئینہ ہے جس میں مصنف کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔اس تعلق سے آپ لکھتی ہیں:

''عموماً دیکھا یہ گیا ہے کہ قارئین کتابیں تو ذوق وشوق سے پڑھ لیتے ہیں مگر لکھنے والے کی شخصیت کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں۔درحقیقت لکھنے والے کی شخصیت بڑی حد تک اس کی تحریروں کی پس پردہ ڈوبتی اُبھرتی نظر آتی ہے۔''(۵)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قمر جمالی اس بات پر زور دیتی ہیں کہ صرف تخلیق پر زور نہیں دینا چاہے بلکہ قلمکار کی شخصیت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔شخصیت کا ایک تخلیق پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قمر جمالی مصنف کی شخصیت کو فن پارے میں تلاش کرتی ہیں تو کبھی فن پارے کو مصنف کی شخصیت کے پرتو میں سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔

ایک ادیب اپنے مشاہدے اور ادراک سے اپنے موضوعات طے کرتا ہے وہ کیسا ادب تخلیق کرتا ہے یہ اس کی قوت تخیل، ندرت فکر، فنی دسترس اور قوت اظہار پر منحصر ہے۔ان چیزوں کا ہونا ایک اچھی تخلیق کا وجود میں

آنے کے باعث بن سکتے ہیں اور یہ چیزیں ایک ادیب میں ہوں تو وہ بے شک ایک اعلیٰ شخصیت کا حامل ہوسکتا ہے۔

قمر جمالی چونکہ خود ایک خاتون افسانہ نگار ہیں تو ان کا کہنا ہے کہ مرد سے بہتر کہانی ایک عورت ہی لکھ سکتی ہیں۔ڈاکٹر مجاور حسین کا قول استعمال کر کے وہ لکھتی ہیں:

''عورت،مرد کی بہ نسبت اچھی کہانی بُن سکتی ہیں۔''(۶)

اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے قمر جمالی لکھتی ہیں کہ عورت تخلیق کے کرب سے واقف رہتی ہے۔ دوسرے کہانی کہنا اس کی گھٹی میں پڑی چیز ہے۔ساتھ ہی مزاج کی نزاکت،نفاست اور صبر واستقلال سے کہانی کا تانہ بانہ ڈالنے معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔

قمر جمالی کے مطالعہ میں گہرائی،فکر میں وسعت اور خیالات میں رفعت ہے۔ان کے تبصروں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ایسا کیوں نہ ہوان کے مطالعے کا دائرہ کار محدود نہیں بلکہ لامحدود ہے۔ وہ نہ صرف اُردو زبان وادب سے واقفیت رکھتی ہیں۔ بلکہ فارسی،عربی،انگریزی پر بھی اُنہیں دسترس ہے۔علوم چاہے دنیا ہوں یا سماجی،سائنسی ہوں یا ادبی یہ سب اُن کے مطالعے میں رہتے ہیں۔ان کے تبصروں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عصری آگہی سے غافل نہیں ہیں بلکہ رونما ہونے والے حادثات وواقعات کی بھرپور خبر رکھتی ہیں۔وہ ادبی ہوں یا سماجی،سیاسی ہوں یا تاریخی،دنیوی ہوں یا دینی،سائنسی ہوں یا ادبی وہ ان سے بالکل بھی بے خبر نہیں رہتی۔

قمر جمالی جب کسی کتاب پر تبصرہ لکھتی ہیں تو اس میں شامل جزیات نگاری کا باریک بینی سے جائزہ لیتی ہیں۔صرف فہرست کو دیکھ کر اور سرسری تعارف وتوصیف سے کام نہیں لیتی۔ان کا خیال ہے کہ کتاب پڑھ لینے کے بعد (React) کرنا چاہئے خواہ مثبت ہو یا منفی۔جس کا وہ اپنی عملی زندگی میں بھی استعمال کرتی ہیں۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قمر جمالی قول وفعل کی سچی اور صداقت پسند مصنفہ ہیں۔ جب کبھی کوئی بات قمر جمالی کو نامناسب اور غیر متوقع محسوس ہوتی ہے تو وہ اس خامی کی نشاندہی کرتی ہیں۔اور دوٹوک الفاظ میں قلمبند کرتی ہیں۔کبھی کوئی تحریر اگر صنف کے اعتبار سے اجزائے ترکیبی پر کھرا نہیں اترتی تو اس کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں۔بانو طاہرہ سعید کے ایک افسانے ''یقین آئے نہ آئے'' کے متعلق قمر جمالی لکھتی ہیں:

''اس کہانی کو افسانے کے زمرے میں رکھنا اس کے ساتھ ناانصافی ہے کیوں کہ یہ افسانے سے زیادہ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔''(۷)

قمر جمالی نے تبصرہ کرتے وقت خوبیوں اور خامیوں دونوں کو پیش نظر رکھا ہے۔انہوں نے مصنفین کو فقیہ مشوروں سے نوازا بھی اور تجاویز بھی دی ہیں کبھی کسی مصنف کے خیال سے اتفاق یا اختلاف کیا تو اس کا برملا اظہار کیا کیوں کہ وہ صداقت پسند خاتون ہیں۔ان کی تحریروں سے کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کسی بات سے اختلاف کرتے وقت مصنف کا دل رکھنے کے لئے اس کی ہاں میں ہاں ملائے بلکہ اختلاف کرتی ہیں اور اختلاف کی وجہ بھی بیان کرتی ہیں۔ہاں البتہ لہجہ ہمیشہ نرم ہی اختیار کرتی ہیں۔لہجے میں کبھی شدت اختیار نہیں کی۔

حمیرا سعید کی کتاب ''اُردو ناول میں نسائی حسیت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے قمر جمالی لکھتی ہیں:

''میں حمیرا سعید کی نسائی حسیت کی اس Definition سے کہ یہ صرف عورت میں ہوتی ہے اور مرد میں نہیں، اختلاف کرتی ہوں۔کیوں کہ میری نظر میں نسائی حسیت، نسائی تحریک کا پیکرا پڑاؤ ہے اور اس میں مرد وزن دونوں شامل ہیں۔''(۸)

محمد اسلم ڈوگر نے اپنی کتاب فیچر کالم اور تبصرہ میں تبصرہ نویس کے دس اوصاف کا ذکر کیا ہے۔جو کچھ اس طرح ہیں:

''(۱)فطری رجحان (۲)زبان و بیان پر عبور (۳)قوت فیصلہ
(۴)فنی تقاضوں سے آگہی (۵)غیر جانبداری (۶)قوانین سے واقفیت
(۷)ضابطہ اخلاق سے آگہی (۸)شائستگی (۹)اعتدال وتوازن
(۱۰)معاشرتی اقدار'' (۹)

ان اوصاف کو مدنظر رکھ کر اگر قمر جمالی کے تبصرہ کا جائزہ لیں تو وہ ان سب پر کھرا اُترتی ہیں۔ان میں سے بعض کا ہم پہلے ہی غالباً جائزہ لے چکے ہیں۔

قمر جمالی کا قلم کے ساتھ ابتدا سے ہی رشتہ مضبوط رہا ہے۔ان میں لکھنے کا فطری رجحان موجود ہے۔اس کا یہ ثبوت کافی ہوگا کہ انہوں نے لکھنا بہت کم عمری میں شروع کیا تھا۔ذہنی بالیدگی کے ساتھ ساتھ ان کے قلم میں بھی روانی بڑھتی گئی ان کی تصانیف میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

قمر جمالی کے تبصروں کے مطالعے سے ان کی زبان وبیان پر قدرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ان کا میدان عمل محدود نہیں ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتی ہیں اوران کے طرز بیان میں شائستگی ،سنجیدگی، متانت اور صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔وہ فارسی ،عربی اور انگریزی ادب سے الفاظ وتراکیب لے کراُن کا اُردو میں استعمال کرتی ہیں۔

قمر جمالی ایک ماہر ادیبہ ہیں ان کا فنی تقاضوں سے آگاہ ہونا ایک لازمی سی بات ہے۔ وہ ادب وفن کے تقاضوں سے بالکل واقف ہیں۔اور وہ اپنی بات غیر جانبداری سے پیش کرتی ہیں۔ وہ قلم کو ایک منصف کی طرح استعمال میں لاتی ہے۔ جوحق وباطل میں تمیز کرتا ہے۔قمر جمالی لکھتے وقت اپنے قلم کو اعتدال وتوازن میں استعمال کرتی ہیں۔ان کے یہاں معاشرتی اقدار کا بھی لحاظ ہے۔

مجموعی طور پر اگر کہا جائے تو قمر جمالی ایک کامیاب تبصرہ نگار ہیں۔انہوں نے اپنے قلم سے قاری کے سامنے جواہر پارے پیش کئے ہیں۔ان کے تبصروں میں اگر چہ روایتی انداز کا تبصرہ نگاری بھی ملتی ہے جس میں مصنف کی یا تصنیف کی تعریف وتوصیف بھی ہے اور تاثرات بھی۔لیکن اس سے بڑھ کر قمر جمالی کے تبصروں کا جو بنیادی وصف ہے وہ اُن کا منفرد اسلوب اور طرز تحریر ہے۔ان کے تبصروں میں شائستگی اوراعتدال وتوازن بھی دیکھنے کوملتا ہے۔ غیر جانبداری اور معاشرتی اقدار کی پاسداری بھی ان کے پاس قوت فیصلہ بھی مضبوط ہے اور وہ فنی تقاضوں سے آگہی بھی رکھتی ہیں۔امید ہے کہ ان کے قلم سے اور بھی تبصرے قلمبند ہوتے رہیں گے اوران کا ادبی ذخیرہ اور بھی بڑھتا جائے گا۔

د) انشائیے:

قمر جمالی کی ہشت پہلو ادبی شخصیت میں افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈراما نگاری، خاکہ نگاری، رپورتاژ نگاری وغیرہ غیر افسانوی نثر کے تمام اصناف شامل ہیں۔ وہ اردو ادب کی منفرد شخصیت ہیں۔ان کی شخصیت کا ہر پہلو لازوال خصوصیات کا حامل ہے۔انہوں نے کل آٹھ انشائیے تحریر کئے ہیں۔جن میں دو غیر مطبوعہ ہیں۔

☆ اے وحشتِ دل کیا کروں، روزنامہ ’سیاست‘ حیدرآباد، ۲۵/دسمبر ۱۹۹۵ء

☆ لمحوں کے جھروکے سے، روزنامہ ’ہمارا عوام‘، ۱۲/مارچ ۱۹۹۸ء

☆ محبت،خوشی اوراظہارخوشی،تخلیق ۲۲رفروری ۲۰۱۱ء(غیرمطبوعہ)

☆ محشر بپا کرے گی یہ پیاز کی ڈلی،روزنامہ ُہماراعوام ٗ۲۲راکتوبر ۱۹۹۹ء

روزنامہ ُسیاست ٗ۲۲رجنوری ۲۰۱۱ء

☆ زبان سنبھال کے،روزنامہ سیاست (ادبی ایڈیشن) ۲رنومبر ۲۰۱۴ء

☆ اللہ میاں کے نام ایک خط،تخلیق،۱۶رجنوری ۲۰۲۰ء(غیرمطبوعہ)

☆ زندگی تیری عنایات اف! جھروکا زندگی کا،بنات بین الاقوامی نسائی ادب دہلی ۱۴راگست ۲۰۲۰ء

☆ خوش آمدید تلنگانہ (بات غیروں کی ہے۔بات ہے دیوانوں کی) مرتب:مُکتا N.G.O.

قمر جمالی کی انشائیوں کی خاص بات ان کا اسلوب بیان ہے۔وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا انداز بہت ہی عمدہ ہے۔ان کے انشائیوں کی زبان بھی بے حد خوبصورت ہے۔انہیں زبان وبیان پر عبور حاصل ہے۔ان کا مطالعہ وسیع ہے۔انہیں مختلف موضوعات پر دسترس حاصل ہے۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں عصر حاضر کے اہم مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔

’’اے وحشت دل کیا کروں‘‘

قمر جمالی نے ایک انشائیہ ’’اے وحشت دل کیا کروں‘‘ کے عنوان سے لکھا ہے۔یہ ان کا پہلا انشائیہ ہے جس کو انہوں نے ۲۵راکتوبر ۱۹۹۰ء کو لکھا جو ۲۵ردسمبر ۱۹۹۰ء میں روزنامہ سیاست میں شائع ہوا۔قمر جمالی نے یہ انشائیہ حیدرآبادی عوام کی نظر کی ہے۔اس انشائیہ میں آزادی کے بعد ہورہے فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع بنایا گیا ہے جس کی وجہ سے بے قصور عوام کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اُن مسائل کو اس انشائیہ میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یعنی ۱۹۹۰ء سے لے کر آج تک کے ہندوستان کے حالات کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے مختلف ریلیف کیمپس میں سمیٹے ہیں۔بالخصوص انہوں نے حیدرآباد کے اُن بدترین حالات وفسادات کا ذکر کیا ہے جو مکّہ مسجد،آمنہ گلشن،گاندھی بھون اور ایسے کئی ریلیف کیمپس میں رونما ہوئے۔اور ان فسادات کے کاروائی کے متعلق شہر حیدرآباد کے پولیس کی لاپروائی،لااعتناعی کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے لوگوں کے ساتھ رواں رکھے تھے۔قمر جمالی نے ایک جگہ پر ان ریلیف کیمپس میں عوام کے ساتھ رونما ہوئے حالات وجذبات اور احساسات کا ذکر کیا ہے جس

میں ان کے ذاتی تجربات کے ساتھ ساتھ حزن و ملال کی ہلکی سی جھلک اور اظہارِ جذبات کی ترنگ صاف دکھائی دیتی ہے مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اگر کوئی بہن جو پچھلے تین دن سے بھوکی ہے وہ یہ کہے کہ مجھے کھانا نہیں چاہئے، ذرا اتنا بتادو کہ میرا میاں زندہ ہے کہ مرگیا۔ جس وقت پولیس مجھے زبردستی ریلیف کیمپس میں پہنچا رہی تھی وہ زخموں سے چور چور زش پر پڑا تھا۔ وہ ابھی مرا نہیں تھا۔ بس اتنا بتادو کہ میں ابھی سہاگن ہوں امیری کلائیاں اجڑ گئیں۔'' (۱۰)

اسی انشائیہ کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں انہوں نے ہمارے سماج میں ہو رہے مظالم، فسادات اور خون خرابے پر عوام کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور ساتھ ہی ہمیں ایک ننھی سی بچی کی مثال دے کر اس کے معصوم سوالوں کی طرف توجہ دینے اور غور وفکر کرنے کی ترغیب دی ہے ملاحظہ کیجئے:

''آج جس مسئلہ پر خون خرابہ ہو رہا ہے اگر کبھی فرصت میں ہم خود اسے بہ آواز بلند خود سے کہہ لیں، مارے شرم کے ہم اپنی شکل آئینہ میں دیکھ نہ سکیں گے، بالکل اسی طرح جیسے ہم اس ننھی سی بچی کا سامنا کرتے کراتے ہیں جو ہم سے یہ پوچھتی ہے...... ماں، بابا!
آج یہ لڑائی کون کر رہا ہے؟
کس سے کر رہا ہے؟ اور کیوں کر رہا ہے؟ ان تینوں سوالوں کے جواب ایسے نہیں کہ ہم اپنی زبان سے ادا کرسکیں۔ کیوں ہم جانتے ہیں کہ ''ہم ان سوالوں کے جواب اپنی آنے والی نسل کو ترکہ میں نہیں دینا چاہتے۔ ہم شیطانیت کر تو لیتے ہیں سومثال بن کر شیطان کی تاریخ میں زندہ رہنا نہیں چاہتے۔ ہمارے احساس کا یہ جز ہماری امید کا مثبت پہلو بن سکتا ہے کیوں کہ ابھی انسانیت کی ایک امنگ ہمارے دلوں میں ٹمٹماتی ہے۔ ضرورت ہے تو حوصلے کی یزداں بہ کمند آور اے ہمن مردانہ آج حیدرآباد، فرخندہ بنیاد، تہذیب کا پروردہ رواداری کا امین اور اخلاص کا شہر بے چہرہ ہو گیا ہے۔ اس کے دونوں گال لہولہان ہیں۔ کون سے گال پہ کس نے طمانچہ مارا؟ یہ سوچنا بے سود ہے سوچنا تو یہ ہے کہ طمانچہ کس نے مار کون کھایا، جسم کس کا دُکھا......!
اگر ہمارے ہی جسم کے ہاتھ پاؤں سے بھڑ گئے کان ناک سے تو ہم باقی کہاں رہیں گے...... صفحۂ ہستی سے ہی مٹ جائیں گے......'' (۱۱)

فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ کوئی نہیں ہے۔صدیوں سے ہوتے آئے ہیں اور شاید ہوتے رہیں گے۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ ان فسادات کی نوعیت اور غرض وغایت بدلتی رہتی ہے۔مزید انھوں نے ''اس انشائیہ میں عوام کو اس بات کی غور وفکر کی دعوت دیتے ہوئے یہ احساس دلاتی ہے کہ آج ہندوستان کے پیچھے جو بھی طاقت کارفرما رہی ہے یعنی ان فسادات کی بنیادی وجہ مندر یا مسجد وجہ تو بس ایک ہی نفرت ہے۔اس نفرت کی بیج کو ہمیں دل سے نکال دینا چاہئے تاکہ ہمیں کسی حاکم کے آگے ہاتھ پھیلانے کی فریاد کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔مصنفہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہر انسان کو چاہئے کہ اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں اور انسانی اقدار کو ابھاریں تاکہ ان دو فرقوں کے درمیان جو جذبۂ نفرت ہے اس پر قابو پاسکیں اور انتقام کے اس عفریت کا سر کچل سکیں جو بھائی کو بھائی سے جدا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔مزید انھوں نے بھائی چارگی کا مشورہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ جب ایک انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کامل اور ایک مکمل انسان بنے تو اس کو چاہئے کہ اپنے آپ کا جائزہ لیں اور اپنے دل کو ٹٹولیں۔جس کے متعلق انہوں نے اقبال کے ایک شعر بطور مثال دی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس قوم کے جوان اپنی لوہے جیسی مضبوط خودی سے آشنا ہوں اور اس پر مضبوطی سے قائم بھی ہوں یعنی وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے واقف ہوں تو پھر اس قوم کو تلوار کی ضرورت نہیں ہوتی۔اس قوم کے لئے ان جوانوں کا جذبۂ ایمان اور جذبۂ حب الوطنی آلات حرب وضرب سے زیادہ کام کرتا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے دلوں میں جذبۂ نفرت کے بجائے جذبۂ محبت کو پروان چڑھانے کی سخت ضرورت ہے۔جس کے متعلق انہوں نے ناصر کاظمی کا ایک شعر کی مثال دی ہے اور اپنا اظہارِ خیال کیا ہے کہ آج اندھیرا ہے لیکن کل وقت کے ساتھ حالات بھی بدلیں گے اور آج جو بے رونقی کی زوال ہے کل سورج روشن ہوگا اور پھر اس شاخ میں پھول کھلیں گے۔بالآخر وہ اسی امید کے ساتھ آنے والے سال کو ایک نیک بشارت اور جہانِ نو کی ضمانت دیتے ہوئے ہم سب کو مل کر ایک جہاں بنانے کی ترغیب دی ہے۔

لمحوں کے جھروکے سے

قمر جمالی نے ایک اور انشائیہ ''لمحوں کے جھروکے سے'' کے عنوان کے تحت قائم کیا ہے یہ انشائیہ بہت مختصر ہے جس میں انہوں نے تاریخ کے ایک اہم واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے وقت کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالی

ہے اور اس انشائیے میں انہوں نے ریل کے سفر میں پیش آنے والے لمحوں کے جھروکے یعنی سفر میں ان کے ساتھ پیش آئے واقعات و مشاہدات اور اپنے خیالات و نظریات کا اظہار بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

''اب روشنی خوب ہے چلئے ہم آپ کو اپنے ساتھ لے چلتے ہیں، ہم نے قلم تھام لیا ہے۔ کاغذ تو کب سے ہمارے سامنے پھیلا پڑا ہے۔ ہم لکھنے لگے ہیں۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر اِدھر اُدھر بھی دیکھ لیتے ہیں۔ وہ سامنے جو مرد بیٹھا ہے وہ ہمیں یوں گھور رہا ہے جیسے ہم کسی چڑیا گھر سے نکلی ہوئی ہرنی ہیں اور پلک جھپکتے میں کھڑکی سے چھلانگ لگا کر میلوں پھیلے ان سنگترے کے باغوں میں کہیں کھو جائیں گے۔ دراصل یہ ایک فوجی افسر ہے خود بھی صبح سے الفرڈ ہچکاک کی ناول پڑھ رہا ہے۔ ہم صبح سے کوشش کر رہے ہیں کہ ناول کا نام پڑھیں مگر کمبخت کو اس ناول کے سرورق پر لیٹی نیم برہنہ عورت سے ایسا عشق ہو گیا ہے کہ اسے ہمیشہ اپنے سینے پر لٹائے رکھتا ہے۔ چلو ٹھیک ہوا وہ اب ہمیں گھور نہیں رہا ہے کیوں کہ دنیائے عالم میں موجود آدم اور حوا کے بیچ لٹکتی ''وہ قوم'' اسے اپنے نرغے میں لے کر گیت گا رہی ہے۔ ہم شاید محفوظ ہیں کیوں کہ ہم نے سنا ہے کہ یہ قوم عورتوں سے متاثر نہیں ہوتی۔ توبہ! کتنی بے شرم قوم ہے۔''(۱۲)

اس اقتباس میں قمر جمالی کے شگفتہ بیانی باعث شعور اور ذہنی بالیدگی، تخیل پرستی کے تمام آثار موجود آتے ہیں۔

قمر جمالی کے اسلوب کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کا جادو نگار قلم ہر منظر کو متحرک بنا کر پیش کرتا ہے۔ فضا آفرینی کی کیفیت یوں تو ان کے ہر کارنامے میں نظر آتی ہے۔ ان کی منظر کشی ایک طرف تو ادبیت کی چاشنی رکھتی ہے تو دوسری طرف صرف چند سطروں میں مرقع کھینچ کر رکھ دیا۔ 'انشائیہ لمحوں کے جھروکے سے' کا ایک اقتباس دیکھئے:

''افوہ......! کتنا خوبصورت منظر ہے۔ کمپارٹمنٹ کے اندر دیکھتے دیکھتے ہم باہر دیکھنا بھول گئے۔ شاہِ مشرق نے آگ کی ردا اوڑھ لی ہے۔ حدِ نظر تک منظر شنگرفی ہے مگر منظر ہم سے ناراض ہے۔ ہم اسے اپنی آنکھوں میں بھرنے کی فکر میں ہیں اور وہ پیچھے کی طرف دوڑ رہا ہے۔ پرندوں کے غول کتنے منظّم ہیں جیسے آسمان پر Military Tato ہو رہا ہے۔''(۱۳)

انشائیہ نگار زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو اہمیت دیتی ہے اور اپنے تجسس اور طرزِ اظہار سے انہیں

انوکھی غیر معمولی اور دوامی بنا دیتی ہیں۔ یہ قمر جمالی کا سب سے بڑا وصف ہے۔

محشر بپا کرے گی یہ پیاز کی ڈلی

قمر جمالی کا تیسرا انشائیہ ''محشر بپا کرے گی یہ پیاز کی ڈلی'' کے عنوان کے تحت ہے۔ اس انشائیہ میں انہوں نے عصرِ حاضر کے ایک اہم مسئلہ کو موضوع بنایا ہے۔ پیاز ہندوستان میں بہت بڑی تعداد میں خریدی جانے والی سبزی ہے جس کی بڑھتی قیمت کے سبب عوام کا ایک بڑا طبقہ پریشان ہے۔ معاشی اعتبار سے ہندوستانی عوام کی بڑی تعداد غریب ہے۔ اس لئے روزمرہ استعمال کی چیزوں کی بڑھتی قیمت سے یقیناً ایک عام آدمی ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اس انشائیے میں اس مسئلے کو انہوں نے پیش کیا ہے۔

انشائیہ نگار کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ یعنی مسائل کو سمجھانے کے لئے بزرگوں کے اقوال اور مشہور ومقبول اشعار کا سہارا لیتا ہے۔

قمر جمالی کے یہاں بھی یہ خصوصیات ملتی ہے۔ انہوں نے اس انشائیے میں مشہور ومقبول اشعار کا سہارا لے کر اپنے مدعا کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً اس انشائیے میں انہوں نے اپنے درد کا بیان ایک شعر کے ذریعے شگفتہ انداز میں کیا ہے:

> ''کل ہماری بیٹی کی سالگرہ تھی۔ کام کرتے کرتے ہمارا دایاں پاؤں اس قدر درد کرنے لگا تھا کہ بے اختیار ہماری پلکیں آبگینوں سے مزین ہوگئیں اور ہماری زبان پر مولانائے روم کا شعر آ گیا:
>
> گر نبود نالۂ نے را اثر
> نے جہاں را پر نکردے از شکر
>
> ترجمہ: گر نہ ہوتا نالۂ نے میں اثر نے سے کب دنیا کو سکتی شکر)'' (۱۴)

زیرِنظر انشائیہ میں مصنفہ نے اپنے ہی اسلاف کے ذکر پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے جذبات واحساسات کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ جس سے ان کے ذاتی تجربات وکیفیات پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ مصنف کو خدا تعالیٰ نے خاندانی ورثے میں جو درد دیا ہے جس کو وہ خدا کی مصلحت سمجھتی ہیں اور وہ اپنے اس درد کو بھلانے کے لئے مولانا روم کے اشعار کے سہارے خود کو تسلی دیتی اور خوش ہوتی نظر آتی ہیں۔ مگر وہ اپنے خاندانی ورثے کی پردہ داری کو بہت

سلیقے سے چھپاتی نظر آتی ہیں کیوں کہ کسی کے آگے اپنی تکلیف کا اظہار کرنا خلاف طبیعت سمجھتی ہیں۔قمر جمالی کی انشائیوں میں بات سے بات پیدا کرنے کی خصوصیت ملتی ہے۔انہوں نے درد کا بیان کرتے ہوئے آنسووؤں کا ذکر کیا ہے۔پھر وہ بھر آنہوں کا ذکر چھیڑتے ہوئے ٹھرا شراب کا ذکر کیا ہے مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ آنسو بھی عجیب مشروب ہے۔اس کے دو قطروں میں ہی اتنا نشہ ہوجاتا ہے کہ حلق بند(Choak) ہوجاتا ہے۔الفاظ منھ سے باہر نہیں نکلتے ،الٹے اندر ہی احتجاج کرنے لگتے ہیں۔ہم اس لئے خاموش رہنے پر ترجیح دیتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے خدا کا شکر کرتے ہیں اور دل ہی دل میں دست دعاء پھیلا دیتے ہیں۔''(۱۵)

اس انشایئے میں طنز و مزاح کی خصوصیت ملتی ہے۔طنز کے ساتھ مزاح کا ہلکا پھلکا انداز بھی دکھائی دیتا ہے۔قمر جمالی،طنز و مزاح کے سہارے اپنے خیالات و تاثرات اظہار بڑے ہی انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہوں جس میں اپنی بیٹی کی سالگرہ پر اس کی سہیلیاں انہیں گفٹ دیتی ہیں:

''پھر......یہ گفٹ پیک؟

یہ تو عالم بیداری میں ہماری گود میں رکھا گیا ہے۔ہم کیسے چوکتے......؟

پھر بھی......

لپک کر پیک بچوں والی حرکت ہے۔

اس سے ہماری بزرگی مار کھا سکتی ہے۔اس لئے ہم نے اپنی بیٹی کی طرف اس طرح دیکھا گویا کہ اسے حکم دے رہے ہیں۔

پھر کیا تھا......سب مل کر ٹوٹ پڑے اس ڈبے پر کاغذ پرزے ہوگیا۔کارٹون کا منھ کھولا گیا۔

اندر جھانک کر دیکھا۔ہمارا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔اندر جگمگ جگمگ کرتی ترمیذی پیاز کی ڈلیاں چمک رہی تھیں۔

"HAY"

ایک زوردار شور اٹھا اور تالیوں کی گونج میں ایک نہایت خوبصورت چمک دار پیاز کی ڈلی ہماری ہتھیلی پر رکھی گئی۔

حیرت،استعجاب سے ہمارا منھ کھلا رہ گیا۔

''ہائے اللہ............! پیاز............!!

''کیوں آنٹی......ٹھیک نہیں ہے کیا......؟

کسی نے پوچھا ''کیوں آنٹی ٹھیک نہیں ہے کیا؟'' کسی نے پوچھا۔

''نہیں وہ بات نہیں۔مگر ایسا بھی کیا کہ گفٹ میں پیاز دی جائے۔......''!!(۱۶)

مختصراً یہ کہ زیرِنظر انشائیہ میں قمر جمالی نے اپنی بیٹی کی سالگرہ پر اُن کی سہیلیوں کی طرف سے چونکا دینے والے تحفے کی بات کی ہے۔اس کی سہیلیاں تحفے میں بجائے سوٹ کے پیاز لاتی ہیں اور یہ تاویل پیش کرتی ہیں کہ پیاز آج کل بہت مہنگی ہوگئی ہے۔اس کی مہنگائی حکومت کا تختہ پلٹ سکتی ہے۔مزید براں پیاز کو صحت کے لئے مفید اور آنے والے وقتوں میں اسے قومی نشان بننے کی بھی پیش کش کرتی ہیں۔مختصر یہ کہ مصنفہ کے خلاف ایسا تحفہ انہیں حیرانی میں ڈال دیتا ہے اور وہ تحفے کی اہمیت وافادیت پر تحفہ لانے والوں کی تاویلیں خاموشی سے سنتی ہے۔بالآخر وہ پیاز کو عورت کی عصمت وعفت کے محافظ کے طور پر پیش کیا ہے۔الغرض اس انشائیہ میں پس پردہ ملک ہندوستان میں عام ضرورت کی اشیا کی بڑھتی مہنگائی اور آئے دن عورت کے ساتھ ہونے والے شرم ناک حادثات پر چوٹ کرتے ہوئے حکومت اور سماج کے باشعور لوگوں کی مجرمانہ خاموشی کو بے نقاب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔غرض قمر جمالی نے علامتی انداز اپنا کر اسے صفحہ قرطاس پر رقم کرلیا۔

زبان سنبھال کے

قمر جمالی نے ایک اور انشائیہ ''زبان سنبھال کے'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔یہ انشائیہ ۳۱/اگست ۲۰۱۴ء کو تخلیق کیا گیا۔جو روز نامہ سیاست (ادبی ایڈیشن) میں ۲/نومبر ۲۰۱۴ء کو شائع ہوا۔قمر جمالی نے اس انشایئے میں تحفظ زبان اور تحفظ تلفظ کو موضوع بحث بنایا ہے۔موصوفہ نے اس مختصر انشایئے میں وقت کے ادیبوں، شاعروں اور تمام اُردو داں طبقے سے تحفظ زبان اور تحفظ تلفظ کی پرزور اپیل کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''ہر لفظ کا اپنا ایک محل، ایک مکاں ہوتا ہے۔جسے موقع اور بے محل نقل مکانی سے عبارت کھردری ہوجاتی ہے۔''(۱۷)

زبان کے غلط استعمال اور تلفظ کی کوتاہیوں سے فن کار کی عبارت منسلک ہوجاتی ہے۔قمر جمالی تحفظ زبان کے بارے میں لب کشائی کرنے کو ایک طرف سے اپنا فرض سمجھتی ہے تو دوسری طرف اس کام کو آتشِ نمرود میں کودنے

کے مترادف قرار دیتی ہے جس میں اپناہی کلیجہ جلنے کا ہی اندیشہ رہتا ہے۔موصوفہ نے اس انشائیے میں تلفظ، لفظ کا محل اور افکا نیت محاورے وغیرہ پر بات کرتے ہوئے ان کے صحیح استعمال کو اُجاگر کیا ہے۔ بعدازاں تلفظ پر بات کرتے ہوئے انہوں نے اُردو کے اوّلین لوگوں کی عرق ریزی اور غیر جانبداری کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''معتقدین نے نہایت عرق ریزی اور غیر جانبداری سے اس کی صورت کشی کی اور لفظوں کو تحریری، تقریری اور صوتی اعتبار سے نطق بخشا۔ درحقیقت لفظوں کا صوتی پیرہن ہی اس کا تلفظ ہے۔''(۱۸)

مزید انہوں نے محاروں کے استعمال اور اس کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے علماء وادباءاور بزرگوں کی محبت سے فیض اٹھانے کی بھی ترغیب دی ہے وہ اس ضمن میں اپنا حال بیان کرتے ہوئے اور اپنی بات کو مزید مستحکم بنانے کے لئے ایک حدیث شریف کو پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

''تمہارے اوپر لازم ہے علمائے کرام کی مجالس میں بیٹھو اور تم داناؤں کی باتیں سنو۔اللہ تعالیٰ کی حکمت ودانائی سے مردہ دلوں کو اس طرح زندہ کرتا ہے جس طرح کہ بارش کے برسنے سے مردہ زمین کو زندہ کردیا جاتا ہے۔''(۱۹)

بالآخر وہ پھر زبان اور الفاظ کا موقع ومحل کے مطابق بولنا اور لکھنا ہی زبان کی خوبصورتی قرار دیتی ہے۔

اللہ میاں کے نام ایک خط

انشائیہ بعنوان ''اللہ میاں کے نام ایک خط'' اکیسویں صدی یعنی موجودہ صدی کی معروف مصنفہ قمر جمالی کا تخلیق کردہ ہے۔انشائیہ کے بغور مطالعے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کو سپردقلم کرنے کا قصہ مصنفہ کے یہاں ملک ہندوستان وطنِ عزیز کی موجودہ سیاسی اور سماجی مکدورآمیز فضا کا ایک عکس پیش کرنا ہی محرک اس انشائیہ کے وجود کا سبب بنا ہے۔

بلاشبہ نوجوان نسل کسی بھی قوم ومذہب کا سب سے قیمتی متاع اور بیش قیمت وگراں قدر سرمایہ ہوتی ہے جو اس قوم ومذہب کے مشن کو لے کر آگے بڑھتی ہے اور ہر دور میں نئی قوت، نئی حرارت، نئی تازگی، نئی امنگ، نئے جوش، نئے ولولے اور نئے جذبے عطا کرتی ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کے ہر انقلاب میں نوجوان طبقے نے سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔

قمر جمالی نے اسی تاریخ اور علامہ اقبال کے ایک شعر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دل میں احساسِ محرومی اور احساسِ زیاں کے معدوم ہوجانے کے بعد کی قوم کا بے حس ہونا کو پیش کر کے ہندوستان عوام کی موجودہ دہشت کو پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد ہندوستان میں اقلیتوں (Minorties) پر ہوئے ظلم وستم دور کا اظہار کرتے ہوئے مصنفہ نے ہندوستان میں اقلیتی طبقہ کے مخالف قوانین جیسے NPR, NRC, CAA کا ذکر کر کے موجودہ نفرت آمیز اور فرقہ وارانہ سیاسی قیادت کو بے نقاب کیا ہے۔

ملک کے مخالف اور فساد برپا کرنے والے قوانین کو قمر جمالی صاحبہ نے آگ کے شعلوں سے تعبیر کیا ہے۔

ان قوانین کے مطابق پیش کئے جانے والے ثبوتوں کو مصنفہ نے ایک دھوکے اور فریب سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔

صدیوں کے مکینوں سے ان کی جائے پیدائش طلب کرنا موجودہ حکومت کی اخلاقیات سے گری حرکت اور منفی سوچ کے سوا کچھ نہیں۔

قمر جمالی اس انشائیہ میں اپنی قوم یعنی ہندوستان کی بڑے اقلیت مسلمانوں سے ایک شکوہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ ہم بے حس ہو چکے ہیں اور جاگنے میں دیر کرنے کا ہم کو نتیجہ مل رہا ہے۔

مصنفہ نے خشونت سنگھ کی کتاب ''The End of India'' نامی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہم کو جگانے کا کام پہلے سپردِ قلم ہو چکا ہے۔لیکن ہم نے اس سے چشم پوشی کی ہوئی ہے۔

اس کے بعد مالکِ کائنات سے اپنا اور اپنی قوم کا گلہ ایک خط کے طور پر لکھتی ہیں کہ اے ربِّ کائنات اصل بادشاہت تو تیری ہے۔تو بخوبی جانتا ہے۔ہم اس سرزمین میں پیدا ہوئے اور اس ملک میں پلے بڑھے اور اب یہ وقت آن پڑا ہے کہ اپنی شہرت کو ثابت کریں۔یہ سب تو تجھ سے چھپا نہیں ہے۔

مزید اس انشائیہ میں ہندوستانیوں پر انگریزوں کا تسلط اور پھر ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی اور اس کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کا لاثانی کردار کو پیش کرتے ہوئے آزادی وطن اور آئین (Constitution) کا قائم ہونے کا مقصد اور اس میں دیئے گئے بنیادی حقوق کی بازیافت کا ذکر کرتی ہیں۔

ہندوستانی آئین کے Premble میں موجود جمہوریت ،سالمیت ، مذہب کی برابری،عوامی حکومت و قوانین کی بالادستی اور بنیادی حقوق کا تحفظ کا ذکر کرتے ہوئے پھر NPR, NRC, CAA کو متحیر آئین (Constitution) ثابت کرنے کی ایک سعی کرتی ہیں۔اس لئے کہ یہ مذہب کی بنیاد پر بنائے ہوئے قوانین ہیں

جو اقلیت کو کچلنے کا کام کرنے میں پیش پیش رہیں گے۔

مثلاً انہوں نے موجودہ سیاست کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ ہندوستان بننے میں سب کا خون شامل ہے جس کے متعلق راحت اندوریؔ کا ایک شعر پیش کرتے ہوئے اپنے خیالات ونظریات کا اظہار یوں کرتی ہے کہ:

''اس دستور کو مرتب کرنے میں ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کے (۳۸۹) تین سونواسی اراکین جو (۹۵) پنچانوے ریاستوں سے متعلق تھے۔ کی مساعی، دن رات کی محنتیں اور خون پسینہ شامل ہے۔

سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں
کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے
(راحت اندوریؔ)

نہ تمہارا، نہ ہمارا، یہ ملک ہم سب کا ہے۔ اسے ہم نے مل کر بنایا ہے یہاں کی جمہوریہ نہ تمہاری نہ ہماری بلکہ

"Democracy of the people for the people and my the peole"

ہے۔ اس کی سالمیت Solidarity کو برقرار رکھنے کی سب نے ملکر قسم کھائی تھی اور عہد ہند ہیں۔'' (۲۰)

آخر وہ اللہ کی جانب رجوع کرتی ہوئی مصنفہ دستِ سوال دراز کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ ربِّ دو جہاں ہماری دعاؤں کو قبول کر اور ہمیں اس آفت سے نجات دلا۔

مختصر یہ کہ اس انشایئے میں مصنفہ نے ہندوستان میں اقلیتوں پر ہوئے طرح طرح کے مظالم کو اللہ کے حضور میں ایک خط کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس انشایئے کی سب سے بڑی تخصیص یہ ہے کہ ہندوستانی عوام کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہوئے اپنے جذبات وتاثرات کا اظہار برملا انداز میں کیا ہے۔ جس سے قمر جمالی کی وسعت علم، علمی بصیرت، آمیز خیالات ونظریات اور قوتِ فکر کے ساتھ موجودہ سیاست کے ظلم وستم پر اپنے قلم کے تئیں سوالات اٹھانے والی ایک حساس ادیبہ نظر آتی ہیں اور وہ ایک تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فریضہ کو بخوبی انجام دیا ہے۔

زندگی تیری عنایات......اُف!
(جھروکا زندگی کا)

قمر جمالی کا ایک انشائیہ ''زندگی تیری عنایات......اُف'' (جھروکا زندگی کا) کے عنوان کے تحت ہے۔اس میں نے اپنی زندگی کی انفرادی و اجتماعی روداد حیات، بچپن اور بچپن میں پیش آنے والے اہم واقعات اور سرکاری خدمات اور سرکاری ملازمت کے دوران رونما ہونے والے واقعات، تلخ شیریں تجربات و مشاہدات، حاجت مند اور غریب عوام طبقے کی ان کے تئیں شفقت و محبت اور ان کی خلوص پر خصوصی توجہ کے ساتھ تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اپنے خاندانی لوگوں کی اخلاقی قدریں و محبتیں، جمالیاتی نقطۂ نظر سے زندگی حسین وجمیل بنانے کا خیال اور پاکیزہ وروحانی ترقی کا نصب العین کو پیش کیا ہے۔

قمر جمالی ک تحریروں سے علم ہوتا ہے کہ انہیں کہانیاں لکھنا اور کہانیاں بننا جس کو وہ اپنا مشغلہ اور ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہوئے جسے وہ ایک مقدس وراثت اور ایک صالح عمل بھی مانتی ہیں۔انہوں نے اس انشائیہ کا آغاز ''سورۃ الاعراف'' کی آیت سے کیا ہے اور اس انشائیہ میں قرآن حکیم کی واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ قرآنِ پاک میں ایسی بے شمار کہانیاں موجود ہیں جو ہمیں سچائی اور صداقت کا ثبوت دیتے ہیں۔جس کے مطالعے سے ہم عبرت و نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔

مصنفہ نے اس انشائیہ میں غیر رسمی انداز اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگی کا ایک جھروکہ کھولنے کی کوشش کی ہے اور اپنی زندگی میں شخصیت کی عمارت کو تعمیر کرنے کے لئے اپنے اندر حق و صداقت کو آزماتے ہوئے وہ آخر میں لکھنے کا فیصلہ کر لیتی ہیں اور اپنے اظہارِ جذبات کی ایک ترنگ کو ذاتی تجربات کے ساتھ ساتھ حزن و ملال کی ایک ہلکی سی جھلک کو انہوں نے کہانیاں لکھ کر اپنی زندگی کی رودادِ حیات کو اپنے قلم کے ذریعے سے اس کو مہر کرنے کی کوشش کی ہے۔جس کے سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''قلم تھاما تو محسوس ہوا زندگی تو ایک کتاب ہے، کتاب نصیحت، واقعات و حادثات کی دستاویز، جن میں درج حادثات منفی بھی ہیں اور مثبت بھی، میں نے جب انہی بصری اور صوری توانائی کو اجاگر کرنے اور ان کے گزرے لمحوں کو پکڑنے کی کوشش کی تو کچھ بھی ہاتھ نہ لگا اُلٹا زندگی منظر در منظر (A Scenario of Paradoxes) کی طرح

نظروں کے سامنے سے پھسلنے لگی اور ایک دبیز پردہ آنکھوں کے آگے پھیل گیا۔ میں نے قلم کی نوک سے جب حیات کے اس پردے کو ہٹانے کی کوشش کی تو لگا میری زندگی کے پردے تو کسی زندان کی دیواروں کی طرح مضبوط ہیں۔ زندگی اتنی مسطور ہے کہ کوئی روزن نظر نہ آیا۔ اکثر سنتے آئے ہیں کہ زندگی کے اوراق مجتمع کرنے کی کوشش کرو تو یادوں کی یلغار سنبھلنے نہیں دیتی۔ میری معاملہ تو الٹا نکلا، یہ کیا......زندگی تھی...... یا کوئی خواب تھا دیوانے کا......!! اب بھی ہے شکر الحمدللہ! جب تک حیات ہے، زندگی بھی ہے۔ مگر......

ع سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

بہت تگ ودو کے بعد کچھ کچھ نظر آیا تو میں نے فوراً قلم تھام لیا۔ میں نے جب اس کا روزانِ رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں، ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ مگر......غلامی پاؤں سے لپٹی ہوئی تھی۔'' (۲۱)

اس اقتباس سے علم ہوتا ہے کہ مصنفہ نے بھی کئی ایسے واقعات ومشاہدات کا تجربہ کیا ہے جس سے مصنفہ کے قلم سے یہ الفاظ غیر رسمی تحریر ہوئے ہیں۔

قمر جمالی نے اس انشائیہ میں اپنے بچپن کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ کھیلنے کی عمر میں کھیلی نہیں بلکہ غربت نے انہیں دبوچ لیا تھا۔ پھر وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے تحصیل دار کے عہدہ پر سرفراز ہوئی تو جس سے ان کے دل میں غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنے کے لئے بہت مراعات اور جذبۂ صادق کا جو جنون تھا وہ نصب العین بن گیا۔ بہتر یہ کہ وہ عوام کے حق میں کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ وہ ایک اسکیم کے تحت اپنی سرکاری ذمہ داریوں کو پُرخلوص جذبۂ خدمت کے ساتھ انجام دیا ہے۔ جس کی جھلک کا ایک نظارہ ملاحظہ ہوں:

''میں نے ایک سو چالیس (۱۴۰) ایکڑ اراضی دولت مند کسانوں سے سرکاری داموں پر خریدی تا کہ غریب اور بے زمین کسانوں میں بانٹی جاسکے۔ اس کی Land Assignment act کے تحت قانونی گنجائش ہے۔ مگر یہ بڑا جوکھم کا کام ہے۔ اس لئے ہمارے بیشتر وافسروں نے اس پروویژن Provision کی طرف سے آنکھیں موندھی رکھنے میں ہی عافیت سمجھی۔ میں نے جب دیکھا کہ دیہی علاقوں میں غریبوں کو غریب ہی رکھنے پر خاصی توجہ دی جاتی ہے تو میں اس چکرویو کو توڑنے کی درپے

ہوگئی۔To prick the Ice میں نے یہ بیڑا اٹھایا اور اسے کامیابی سے ہمکنار کر کے
ہی دم لیا۔
مگر......ایسا کرنے سے اپوزیشن کو بڑا نقصان ہوا۔ کیوں کہ اس طرح اس وقت کی
رولنگ پارٹی مضبوط ہوتی گئی جس کا ووٹ بنک پر خاصا اثر پڑا۔''(۲۲)

مصنفہ کے نظریات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ نے دلیر و نڈر رہ کر بہت چابک دستی اور منطقی استدلال سے کام لیتے ہوئے عوام کے تئیں اپنی جذبہ خدمات کو انجام دیں ہیں۔

مزید اس انشائیہ میں انہوں نے ان کے ایک باورچی کا ذکر کیا ہے۔جس کی محبت قمر جمالی کے تئیں بہت عزیز تھی اس واقعہ کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ جس سے ان کے اسلوب میں رنگ، جدّت وندرت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے پرتو کا دخل بھی نظر آتا ہے اور ان کے اسلوب میں شخصیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے اس لئے ان کی اسلوب کو ان کی شخصیت کا آئینہ قرار دیا جاسکتا۔مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''نوراللہ سیدھا سادا دیہاتی آدمی تھا، کبھی کبھی وہ بڑا اُکھڑا اُکھڑا سا لگتا، کبھی زور زور
سے اونٹنے لگتا اور بڑبڑاتا۔''یہ خوب اِچ ہوالیوَ۔نواب صاحب کا دسترخوان! روز پانچ
کلو چاول پکتیں اور تحصیلدارنی اماں کھاتیں سو کیا......دال بھاجی۔مرغی لادوں بولے تو
نکو بولتیں۔ارے خود نہیں کھائیں گے تو دوسروں کو کھلائیں گے کیا......! آج تک نہیں
دیکھا ایسا تحصیلدار''
دراصل وہ روز مجھ سے پوچھتا،''اماں! مرغی لاؤں؟''
ایک دن میں نے کہہ دیا''ہاں لاؤ!''
پھر کیا تھا......تھوڑی دیر میں کا والکار آٹھ دس دیسی مرغی پکڑ لائے۔
''ارے یہ کیا......؟ کوئی دعوت کر رہے ہو نوراللہ؟''
''رہنے دو! آپ کے لئے اِچ ہے کیا کھانے وٗالے؟ بھ......''
(بہت) ہیں کھانے والے۔کبھی تو اُنا (انہیں) بھی اچھا کھانا کھانا چاہئے نا......''
میں سمجھ گئی۔ یہ مرغی میرے پیسوں سے نہیں آئے بلکہ میرے نام پر جمع کئے ہوئے ہیں۔
میں نے منع کیا۔
''دنیا میں نئیں سو آپ کو اِچ دیکھا ایسی تحصیلدارنی۔سوکھی موکھی۔ نہ کھاتیں...... نہ

کھانے دیتیں۔''

میں ہنسنے لگتی تو وہ بھی مسکرا دیتا۔ میرے لئے ان کی محبت بہت عزیز تھی۔ مجھے زبردستی وقت پر کھانا کھلاتے۔ میری چائے کا وقت پر خیال رکھتے۔''(۲۳)

اس انشائیہ کے مطالعہ کے بعد قمر جمالی کی اسلوب میں محض الفاظ جادوگری نظر آتی ہے بلکہ اس میں طرزِ اظہار کی جدت، خیالات کی ندرت، الفاظ کی ترتیب کا حسن سلیقہ، ذہانت، رعنائی اور سلاست بالخصوص ان کا دکنی لہجہ جیسی خصوصیات نے اس انشائیہ میں ایک خاص امتیاز پیدا کر دیا ہے۔

قمر جمالی جہاں سرکاری خدمات انجام دے رہی تھیں وہیں ان کے خلاف اپوزیشن کے دلوں کے اندر چنگاریاں زور پکڑ رہی تھی۔ لیکن قمر جمالی اللہ پر شاکر تھی۔ قمر جمالی کی اس انشائیہ میں مختلف الجہات اوصاف نظر آتے ہیں جن کے مشاہدات، ذاتی تجربات اور شخصی رجحانات سے متعلق ہیں۔ جس میں انہوں نے معلومات نہیں بلکہ محض وہ واقعات کے اندراج اور تاثرات سے کام لیتی ہیں۔ غرض اس انشائیہ میں قمر جمالی کی زباں و بیاں کی ندرت وکمال، رمزیت وتہہ داری، اسلوب اور اپنی طبعی ذوق وشوق سے تحریر میں رنگارنگی، شگفتگی، رعنائی، مزاج شائستگی کا ایک دریا سمو دیا ہے۔

الغرض قمر جمالی ایک بہترین انشائیہ نگار ہیں۔ حساس ادیب میں یقیناً ایک اچھے ادیب کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ قمر جمالی اپنے عصر کے حالات سے باخبر ہے۔ سماج کے بعض اہم مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ ان مسائل پر بڑی گہرائی سے غور وفکر کرتی ہیں اور قاری کو بھی ان مسائل کے بارے میں سوچنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

قمر جمالی انسانی اور معاشرتی زندگی کے پیچ وخم کو اپنے انشائیوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں طنز کا نشتر بھی اور ظرافت کی چاشنی بھی ہے۔ وہ جس مسئلے کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتی ہیں بغیر کسی تلخی کے مسائل تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے۔ قمر جمالی کا اختصاص رہا ہے کہ انہوں نے جہاں سماجی، معاشی، اقتصادی، قومی سیاسی صورتِ حال پر انشائیے قلم بند کئے وہیں ادبی صورت حال کو بھی ہدف کا نشانہ بنایا ہے۔

قمر جمالی کے تعلق سے یہ کہا جائے گا کہ انہوں نے اپنے انشائیوں کے لئے مواد علم وادب سیاست ومعاشرت کے میدان سے حاصل کیا ہے۔ زمانے کے نامساعد حالات جن سے انسانی زندگی پریشانیوں کا سامنا کر رہی ہے۔ اس سلسلے سے بھی باتیں کی ہیں۔

ان کے انشائیے غیر رسمیت اور بے تکلفی کے باوصف بڑے منضبط ہوتے ہیں اور قاری کو فنی تکمیل کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیوں میں کسی مرکزی بات سے ضمنی باتیں نکال کر اس کا تانا بانا بنتی ہیں۔

قمر جمالی نے جس موضوع پر بھی انشائیے لکھے ہیں وہ ان کے ذہنی، فکری اور جذباتی ردِعمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر انشائیہ ان کے شخصی تجربے اور مشاہدے کا حاصل ہوتا ہے۔ ان کی اپنی زندگی کی مختلف الجہاد، انشائیوں میں کشادگی کا باعث بنتی ہے اور ان کی تخلیقی جوہر نے انشائیے کو نیا زاویۂ منظر عطا کیا ہے۔ وہ اپنے دلچسپ اور انوکھے تجربے میں قاری کو شریک ہی نہیں کرتی بلکہ اسے اپنا ہم خیال بنا لیتی ہیں۔

''زندگی تیری عنایات اُف'' قمر جمالی کا ایک ایسا انشائیہ ہے جس میں انہوں نے اپنے اندر چھپے ہوئے ایسے تعجب خیز پہلوؤں کی طرف اشارہ وانکشاف کیا ہے کہ قاری ان کے تجربے اور مشاہدے میں شریک ہو کر مسرت محسوس کرتا ہے۔ ان کے تمام انشائیے اپنی انفرادیت کے باعث قابل توجہ ہیں۔ اور اپنے انشائیوں کے ذریعے کسی نہ کسی صداقت کا اظہار کرتی ہیں۔ بلکہ غور و فکر کی دعوت بھی دیتی ہیں۔

قمر جمالی اپنے اندر انوکھے تجربے اور مشاہدے کو تخلیقی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ اس لئے ہم ان کے انشائیوں میں فطرتِ انسانی کو تاریخی، سماجی، سیاسی، مذہبی اور ثقافتی پس منظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح ان کے انشائیے ہمیں زندگی کی عام سطح سے پلٹو کر کے زندگی کو وسیع اور کشادہ تناظر میں دیکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

ان کے انشائیوں میں زندگی کی نئ پرتیں، نئے پہلو، نئے گوشے اور نئے زاویے نمایاں ہیں ان کا ہر انشائیہ زندگی کے کسی نہ کسی بڑے اہم مسئلے کی طرف لطیف انداز میں اشارہ کرتا ہے۔

قمر جمالی کی انشائیہ نگاری میں جن چیزوں سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ وہ پس بذلہ سنجی حاضر جوابی اور شگفتہ بیانی، قمر جمالی کے ان ہی خوبیوں نے ان کے خون میں چمک اور نکھار پیدا کیئے۔

قمر جمالی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معمولی مضمون کو بھی نہایت دلکش اور مؤثر انداز میں بنا کر پیش کرتی ہیں۔ ان کی زبان میں سادہ، شگفتہ اور شیریں ہونے کی وجہ سے قبول عام حاصل کر چکی ہے۔ ان کے انشائیوں میں جو جدت اور شوخی کے وہ ان کا وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا معاشرے کی اصلاح کے لئے قمر جمالی نے انشائیے کو ذریعہ بنایا ہے۔ جس میں وہ کامیاب بھی ہوئی۔ ان کے انشائیے صرف تبسم نہیں بلکہ تفکر کی دعوت بھی دیتے نظر آتے ہیں۔

قمر جمالی کے انشائیوں کی سب سے بڑی تخصیص ان کا اسلوب بیان ہے۔ انھوں نے تشبیہات واستعارات سے اپنے انشائیوں کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ زبان وبیاں پر قدرت اور انشائیہ نگاری کے حسن پر دسترس کے باعث بلاشبہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے انشایئے صنفِ انشائیہ نگاری میں اہمیت کے حامل ہیں۔

ھ) تحقیقی وتنقیدی مضامین

دکنی فکشن نگاروں میں قمر جمالی ایک معروف نام ہے۔ وہ گذشتہ کئی برسوں سے کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ ان کے ہاں کثرت سے تخلیقی جذبہ پایا جاتا ہے۔ ان کے اندر چھپے فنکار نے محض افسانہ نگاری پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ اظہار کی دوسری جہتیں بھی تلاش کیں۔ یہی وجہ ہے کہ قمر جمالی کے یہاں ہمیں افسانوں کے علاوہ ڈرامے اور دیگر اصناف بھی ملتے ہیں۔ تاہم افسانہ ان کی اساسی شناخت مگر افسانوں کے بعد دیگر اصناف کے مقابلے ان کے ہاں مضامین کی کثرت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے جتنے مضامین لکھے ہیں ان کی نوعیت تحقیقی وتنقیدی وتعارفی ہے۔ یہ مضامین کسی نہ کسی رسالے یا اخبار میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کے دو تحقیقی وتنقیدی مضامین کے مجموعے بھی منظر عام پر آکر ادبی دنیا سے خراج وتحسین بھی وصول کر چکے ہیں۔ قمر جمالی کے مضامین کے مجموعوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں مجموعہ ''نوارِ ادب'' میں شامل مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں ان کے تبصروں اور دیباچوں کا مجموعہ ''انعکاس'' میں شامل منتخب مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے۔

نوارِ ادب (مضامین کا مجموعہ)

قمر جمالی کا مضامین کا مجموعہ ''نوارِ ادب ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی اشاعت روشان پرنٹرس دہلی سے کی گئی ہے۔ تزئین وترتیب محمود حامد صاحب نے کیا ہے اور اس کا سرورق ان کے داماد محمد کامران خاں نے تیار کیا ہے۔ کتاب کا انتساب قمر جمالی نے اپنی منجھلی بہن طاہرہ المعروف نجمہ کے نام معنون کیا ہے۔ جس کے بعد خط وکتابت میں جگن ناتھ آزاد کے ایک خط کے ساتھ ایک تازہ غیر مطبوعہ غزل انھوں نے شمارہ، ''تناظر'' کی نذر کیا ہے اور بلراج ورما نے تناظر کی رسم اجراء رونمائی کے لئے محبت بھری پیار اور دعائیں قمر جمالی کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ قمر جمالی نے پیش لفظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ فارسی ادب عالیہ کے تحت انھوں نے جو کچھ لکھا ہے جس کو وہ اپنے مطالعے کا نچوڑ بتاتی ہیں کیوں کہ تصوف کے موضوع پر قلم بند کرنا سخت مشکل و درپیش مسئلہ ہے جب

کہ تحقیق تو خونِ جگر مانگتی ہے۔

اس کتاب میں کل (۲۳) مضامین شامل ہیں۔مضامین کا مجموعہ نواحِ ادب کی تبویب انہوں نے پانچ زمروں کے تحت کی ہے۔

پہلا زمرہ ''فارسی ادب عالیہ'' کے تحت ہے۔جس میں انہوں نے فارسی ادب کے ابتدائی دور کے چند معروف ومشہور قابلِ قدر شخصیات پر قلم بند کی ہے اور انہوں نے مختلف دلائل واقعات کی روشنی میں چند صوفیاء کرام پر جو تحقیقی مضامین لکھے ہیں جن میں ان کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے عہد کا پس منظر اور ان کی شخصیت اور ان کی عظمت وجلال ومقام ومرتبہ کا ذکر اور ان کی خدمات وغیرہ کی تفصیلات فراہم کرتے ہوئے مختلف تذکروں کے حوالے سے ان کے صوفی بننے کے وجوہات اور ان کی کرامات کا ذکر کیا ہے۔جو صوفیوں اور اولیاء کرام سے منسوب ہیں۔ان صوفیان کرام کا دور پرُ آشوب دور نہیں تھا ایسی صورتِ حال میں انہوں نے جس میں ایک مثالی انسان کی طرح زیست کرتے ہوئے انہوں نے اپنے افکار واعمال کے ذریعے آدمی کو انسان بنانے کی سعی کی۔اسے حسن عمل، صبر وتحمل، رواداری اور روشن خیالی، انسان دوستی اور انسانیت کا درس دیا۔

دوسرا زمرہ گوشۂ راج بہادر گوڑ پر لکھے مضامین کا انتخاب ہے۔جس میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب کی شاعری، سیاسی وسماجی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔انہوں نے کتاب کے پیش لفظ میں گوڑ صاحب سے ان کا کیا رشتہ رہا جس کے تعلق سے وہ اپنے جذبات وکیفیات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''مجھے فخر ہے کہ وہ مجھے بیٹی کی طرح عزیز رکھتے تھے۔آج بھی یاد کرتی ہوں تو اس رشتے کے تقدس کے آگے میرا سر جھک جاتا ہے۔میں نے گوڑ صاحب سے انسانیت کے عملی معنٰی سمجھے ہیں۔اسلام کے اصولوں پر عمل آوری سیکھی۔سچ بولنا تو میں نے اپنے والد محترم سے سیکھا اور اس پر سختی سے کاربند رہنا ڈاکٹر گوڑ سے سیکھا۔''(۲۴)

تیسرا زمرہ ''شخصیات'' کے عنوان سے قائم ہے۔جس میں انہوں نے انھیں لوگوں کو شامل کیا ہے جن کی شخصیت قابلِ قبول ہو۔موضوع بحث شخصیات میں وہ ان قدروں کو تلاش کرتی ہیں جن کی وہ طرفدار اور ان شخصیات سے وہ متاثر ہوتی ہے۔ان کی نظر میں انسانیت کے حسن اور اس کے عظمت ورفعت کی شناسا ہیں۔

چوتھا گوشہ ''ترقی پسند تحریک'' کے عنوان سے قائم ہے۔جس کے تحت انہوں نے ترقی پسند تحریک کا آغاز

وارتقاء، اور ترقی پسند اردو غزل میں سماجی سروکار، ترقی پسند تحریک اور حیدرآباد کی ترقی پسند خواتین افسانہ نگار کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ اس زمرے کے تحت انہوں نے اپنے تاثرات کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ترقی پسند تحریک کی بدولت میرے قلم کو راہ ملی۔ جس سے میرا چالیس سالہ ساتھ ہے۔ میں ترقی پسند تھی، رہوں گی حالانکہ میں نے اپنے افسانوں میں تجریدی تجربے کئے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ ترقی پسند تحریک تجربات میں مانع نہیں ہوتی کیوں کہ تجربے ہی اذہان کو روشنی بخشتے ہیں۔'' (۲۵)

پانچواں گوشہ ''ادبی مطالعے'' عنوان کے تحت ہے۔ اس زمرے میں شامل تمام مضامین ان کے مطالعے کے زیر اثر تحریر کئے گئے مضامین ہیں۔ ادبی مطالعے میں شامل شخصیات میں ان کی شخصیت اور ان کی سیاسی، سماجی وادبی، صحافتی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

بالآخر قمر جمالی نے اس کتاب کی تکمیل میں جو شخصیتیں شامل حال رہی ہیں ان تمام مددگارں کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا ہے۔ غرض قمر جمالی کا مضامین کا مجموعہ نواحِ ادب میں شامل تمام مضامین قمر جمالی کی تخلیقی حسّیت کی وضاحت کرتے ہیں۔

مجموعہ ''نواحِ ادب'' میں شامل مضامین کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

فارسی ادب عالیہ سے

- ☆ شیخ فریدالدین عطارؒ، طباعت روزنامہ منصف، ۲۱/جولائی ۲۰۰۷ء
- ☆ حکیم ناصر خسرو، روزنامہ منصف، ۱۶/اگست ۲۰۰۷ء
- ☆ حسین منصور بن منصور حلاّج، روزنامہ منصف ۲۰/ستمبر ۲۰۰۷ء
- ☆ مولانا جلال الدین بلخی الرومیؒ، روزنامہ اعتماد (حیدرآباد) ۲۴/مارچ ۲۰۰۸ء/ ۳۱ مارچ ۲۰۰۸ء (دو اقساط میں)
- ☆ صوفی سرمد شہیدؒ، روزنامہ منصف، حیدرآباد، ۱۲/فروری ۲۰۰۹ء
- ☆ حضرت شمس تبریزؒ، روزنامہ منصف، ۲۵/فروری ۲۰۱۰ء

گوشۂ راج بہادر گوڑ:

☆ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور بہادر شاہ ظفر، روزنامہ سیاست (حیدرآباد)، مارچ ۱۹۹۱ءبرائے سال ۱۹۹۰ء

☆ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: ایک شخصیت منثور مثّلثی، سہ ماہی اردو اب، شمارہ نمبر ۴ تا ۲ برائے سال ۱۹۹۳ء، انجمن ترقی ہند، دہلی

☆ مردِ آہن ۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، مجاہد اردو ۲۰۱۰ء، غالب انسٹی ٹیوٹ، غالب مارگ، دہلی

☆ آہ! راج انکل (وفیہ) بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، ماہنامہ قومی زبان، نومبر ۲۰۱۱ء

شخصی مضامین:

☆ بلقیس علاء الدین......ایک تعارف، تخلیق ۱۸/دسمبر ۱۹۹۷ء

☆ ڈاکٹر عزیز بانو......استادِ فارسی دانشگاہ عثمانیہ، ۵/ستمبر ۲۰۰۸ء

☆ ڈاکٹر عینی حسن، سادگی، ذہانت اور اخلاص کا پیکر، ۲۲/جنوری ۲۰۱۱ء

☆ سرہنگ دکن ۔ مخدوم، روزنامہ سیاست، ۲۶/فروری ۲۰۱۱ء

☆ محترمہ نجمہ نکہت میری یادوں کے صحیفے میں، سیاست حیدرآباد، ۱۹/نومبر ۲۰۱۳ء

ترقی پسند تحریک

☆ ترقی پسند تحریک اور حیدرآباد کی ترقی پسند خواتین افسانہ نگار، ماہنامہ آج کل، مارچ ۲۰۱۶ء

☆ ترقی پسند اردو غزل میں سماجی سروکار، 'ششماہی ادب وثقافت'، رفریڈجنرل (MANNU)، شمارہ ۲/مارچ ۲۰۱۶ء

☆ ترقی پسند تحریک کیا ہے، ماہنامہ قومی زبان، اگست ۲۰۱۶ء

ادبی مطالعے

☆ ماس میڈیا میں عورت کا رول اور ریڈیو ڈرامہ میں خواتین کا حصہ (AIR) کے حوالے سے مشمولہ نواحِ ادب ۲۰۱۶ء

☆ مکتوبات نذیر فتح پوری بنام سلطان اختر ۔ ایک مطالعہ، مشمولہ نواح ادب، ۲۰۱۶ء

☆ اُردو ڈرامہ اور منجو قمر کی خدمات، ماہنامہ قومی زبان، اکتوبر ۲۰۱۳ء

☆ مولانا آزاد۔صحافتی زندگی کے آئینے میں، ۲۵/مارچ ۲۰۱۴ء

☆ فریدہ زین کا تخلیقی سفر۔فسانے سے حقیقت تک، ماہنامہ سب رس، مئی ۲۰۱۴ء

ان مضامین کا یہاں تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

فارسی ادب عالیہ سے

شیخ فریدالدین عطارؒ

فارسی دراصل علم ادیان ہے اور تصوف بچپن ہی سے قمر جمالی کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ کیونکہ ان کے گھر کا ماحول بھی کچھ مذہبی رہا ہے بالخصوص ان کی ماں کی پرورش۔ اِسی دلچسپی نے انہیں فارسی ادب کے چند معروف و بلند اور قابل قدر شخصیات پر قلم بند کی ہے۔قمر جمالی کا مضامین کا مجموعہ نواحِ ادب میں کل (23) مضامین شامل ہیں پہلا مضمون ''شیخ فرید الدین عطارؒ'' کے عنوان سے ہے یہ مضمون 18/مئی 2007 کو لکھا گیا جو 21/جولائی 2007 کو روز نامہ منصف حیدرآباد سے شائع ہوا۔ یہ مضمون شیخ فریدالدین عطارؒ کی شخصیت اور خدمات پر نہایت ہی اہم ہے۔اس مضمون سے ان کی تحقیقی نظر اور تنقیدی شعور کا علم ہوتا ہے۔انہوں نے مختلف دلائل اور واقعات کی روشنی میں تصوف کا تعارف اور اہل تصوف کے عقائد ونظریات کے بارے میں مختلف الرائے پیش کرتے ہوئے عطآر کے عہد، ان کی ولادت، ان کے والدین، ان کے خاندانی پیشے ان کے بچپن اور شاعری سے دلچسپی، ان کے بیرونی ممالک کی سیاحت وغیرہ کی تفصیلات فراہم کرتے ہوئے مختلف تذکروں کے حوالے سے عطا کی زندگی اور شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔قمر جمالی ایک جگہ ان کے صوفی بننے کی وجوہات بتاتے ہوئے ان کی شخصیت کے متعلق یوں لکھتی ہیں:

> ''عطآر بڑی پُر اسرار شخصیت کے مالک رہے بچپن ہی سے انہیں صوفیوں، درویشوں سے بڑا خاص لگاؤ رہا۔اور ان کے ارشادات وفرمودات سے نہ صرف مستفیض ہوئے بلکہ اپنی تصنیفات میں بھی ان کا برملا اظہار کرتے۔ چنانچہ ان کی منظوم ومشہور تصنیفات میں ان کے اکتساب کا عکس نظر آتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ بعض محققین کبرویہ سلسلے سے ان کی نسبت بتاتے ہیں تو بعض سلسلۂ اویسیۂ سے مگر حقائق اس بات کی طرف اشارہ

کرتے ہیں کہ وہ اپنی طبعی میلان اور ذاتی شوق کی وجہ سے صوفیوں اور مشائخوں سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کے اقوال واحوال کو اپنی تصنیفات میں درلاتے تھے۔ لہٰذا ان کی مستند کتابوں کے مطالعے سے یہ بات جیسا کہ وہ خود سمجھتے ہیں کہ وہ اہل طریقت صوفی ہیں اور سالک ہیں ثابت نہیں ہوتی۔ پر بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عطاؔر نے سکول کی اُس منزل تک سفر طے کیا تھا جہاں عارف کہلانے میں کوئی حیل وحجت نہیں رہتی۔''(۲۶)

موصوفہ نے اس مضمون میں شیخ فریدالدین عطاؔر کے جوانی کا ذکر بھی کیا ہے جس سے ہمیں عطاؔر کی براہِ راست طریقت ومعرفتِ الٰہی کا پتہ چلتا ہے۔ الغرض عطاؔر زیادہ تر اپنی جوانی کا وقت علوم ومعارف کی تحصیل، کسبِ علم، مشائخوں کی خدمت، عارفوں کی تلاش میں ساری زندگی گزاری بلکہ تمام طریق عرفان میں سلوک کی سیر کرتے رہے اور عشق الٰہی میں جلتے رہے، بالآخر وہ مقامِ ارشاد پر فائز ہوئے جس بناء پر وہ اہل دل کا کعبہ کہلائے۔ اس کے علاوہ عطارؒ مصر، دمشق، ترکستان، ہندوستان، مکہ وغیرہ کی سیاحت کی اور سالک کہلائے۔ قمر جمالی اپنے مضمون میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عطارؒ نے ایک بار جو سالک کی شریعت اختیار کی تو عمر بھر تلاش حق میں کوشاں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء عرفان کے امام جلال الدین رومیؒ انہیں اپنا بزرگ وپیشوا مانتے تھے اور خود کو عطارؒ کے سامنے ہیچ اور شاعری میں ان کا غلام سمجھتے تھے۔ ایک مقام پر مولانا رومیؒ نے عطاؔر کی بزرگی کا اس طرح اعتراف کیا ہے جس کے متعلق قمر جمالی یوں رقمطراز ہیں:

''عشق کے ساتوں شہر (منطق الطیر میں پیش کردہ عرفان کی سات وادیوں کی طرف اشارہ ہے عطار گھوم آئے ہیں اور ہم ابھی ایک کوچہ (گلی) کے موڑ پر ہی ہیں۔ ایک اور مقام پر کہتے ہیں۔ میں وہ ملاّئے رومی ہوں کہ میری بات سے شکر (یعنی۔ شکر کی مٹھاس) ٹپکتی ہے لیکن میں (یعنی شاعری میں) میں شیخ عطاؔر کا غلام ہوں۔''(۲۷)

آگے قمر جمالی نے شیخ عطارؒ کی حکایات کا تجزیہ کیا ہے اُن کی حکایات کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''عطاؔر بڑے زود قلم تھے۔ ان کی تحریر نہایت رواں اور فکر نہایت بلند پایہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے منظوم ومنثور کئی یادگار تصنیفیں چھوڑی ہیں۔''(۲۸)

عطار کی تصانیف کے سلسلے میں بعض ناقدین نے انہیں تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور ان کی چند مثنویوں کو عطار کے نام سے منسوب بھی نہیں کرتے اور ان پر بسیار گوئی کا طعنہ بھی کسا گیا، اس طعنے سے شیخ فریدالدین عطارؒ کی دل آزاری ہوئی تو انہوں نے اس تنقید کا جواب بھی دیا ہے۔ شیخ نے جو دعویٰ کیا ہے جس کے متعلق قمر جمالی ان کی تصانیف وشاعری کے سلسلے میں تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> ''یہ حقیقت ہے کہ شیخ کے دعوے کے مطابق اُن کی توجہ صرف معانی ومفاہیم کی طرف ہی رہی۔ انہوں نے اپنی تمام تصانیف میں صوفیانہ مسائل پر ہی توجہ دی حتیٰ کہ ادنیٰ معنی پر بھی انہوں نے تغزل اور فصاحت کو قربان کر دیا اور شعریت سے خالی شعر کہہ گئے۔'' (۲۹)

مزید انہوں نے عطارؒ کی جو تصانیف باقی نہیں رہیں جس پر افسوس کا اظہار خیال بھی کیا ہے اور ان کی تصانیف کے متعلق جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے اس کے ذمہ دار خود شیخ کو ٹھہراتے ہوئے ان کی مستقل مزاجی اور اسالیب میں بے پناہ اتار چڑھاؤ نے محققین کو تذبذب میں ڈالنا یہ عطارؒ کی دماغی اڑان قرار دیا ہے۔

بالآخر انہوں نے ان کی تاریخ وفات سپرد خاکی کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے شیخ عطارؒ کی موت کو ایک حکایت سے منسوب کیا ہے۔ جسے قمر جمالی نے آسان اور عام فہم زبان وانداز میں بیان کرتے ہوئے اس واقعہ کو داستان طرازی کا نام دیا ہے۔ مزید انہوں نے اُن واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جو دوسرے اولیاء اللہ مثلاً مصنور بن ہلاح اور حبیب نجار وغیرہ کی موت کے بارے میں جو بہت سے افسانے مشہور ہیں اسی طرح عطار کی موت کا واقعہ کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ شمشیر، آگ، خنجر کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا کیوں کہ وہ حقیقت میں موت پا کر بھی وہ ایسے مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں موت وحیات ان کے دستِ قدرت میں ہے۔ مختصراً یہ کہ اس مضمون میں شیخ فریدالدین عطارؒ کی زندگی اور شخصیت کے متعلق مختلف تذکروں کے حوالے سے اُن کرامات کا ذکر کیا ہے جو صوفیوں اور اولیاء کرام سے منسوب ہیں۔ اُسی طرح فریدالدین عطارؒ کی ذات سے بھی کئی کرامات منسوب ہیں جو عوامی ذوق پر مشتمل ہیں۔

حکیم ناصر خسرو

اسمٰعیلیہ (باطنی) فرقے کا مبلّغ شاعر

قمر جمالی کا ایک مضمون ''حکیم ناصر خسرو اسمٰعیلیہ باطنی فرقے کا مبلّغ شاعر'' کے عنوان کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ یہ مضمون 25/جولائی 2007ء میں لکھا گیا جو روزنامہ منصف میں 16/اگست 2007ء کو شائع ہوا۔ اس مضمون کی ابتداء میں قمر جمالی نے خدا کی ذات اور اس کی تمام صفات و کمالات کا ذکر پیش کرتے ہوئے حکیم ناصر خسرو نے قرآنِ شریف کی آیات و کلمات کی روشنی میں مرنے سے قبل اپنے بھائی خواجہ ابوسعید سے جو وصیّت کی بعد وصیت ناصر خسرو نے ایک لمبی مناجات شروع کی تھی جس کو انہوں نے نہایت ہی دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ بعد ازاں انہوں نے حکیم ناصر خسرو کا تعارف پیش کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ نام ناصرین خسرو کنیت ابومعین الدین اور القاب متعدد بعض تذکرہ نویس انہیں ناصر شاہ بعض سلطان بعض انہیں حجت کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی حکیم ناصر خسرو کی مقام پیدائش کے متعلق جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے جس کی وضاحت بھی کی ہے۔ نیز انہوں نے خواجہ الطاف حسین حالؔی اور خود ناصر خسرو کے مطابق ناصر کا وطن بلخ، خراساں، مگر ڈاکٹر رضا زادہ شفق اور پروفیسر ایڈورڈ براؤن کے مطابق ناصر خسرو 'مرؤ' کے قصبے قبادیان میں پیدا ہوئے۔ اور ان کا سلسلۂ نسب ساتویں پشت سے حضرت امام موسیٰ رضا سے ملتا ہے۔ مختصراً یہ کہ قمر جمالی نے مختلف دلائل واقعات کی روشنی میں ناصر خسرو کا تعارف، سلسلۂ نسب اور ان کے عہد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس دور کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات کا ذکر کیا ہے۔ ناصر خسرو کا زمانہ جو محمود غزنوی کے دورِ حکومت کا مشہور دور یعنی پانچواں سال تھا جو سیاسی اور سماجی اعتبار سے سابق صورتِ حال پستی سے گزر رہا تھا۔ ایسے حالات میں محمود غزنوی کا دین اس کا ذہنی رجحان مذہبی جھکاؤ کے اعتبار سے کمزور ہو رہا تھا اور وہ باطنی مذہب کی تبلیغ کا سخت مخالف بھی رہا ہے۔ اس سلسلے میں حکیم ناصر خسرو کی عہد کے پس منظر کے متعلق ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> یہ زمانہ محمود غزنوی کے مشہور دورِ حکومت کا پانچوں سال تھا جو سیاسی اور سماجی اعتبار سے انحطاط سے گزر رہا تھا۔ ایک طرف یمین الدولہ محمود کابل، ملتا اور بھاطیہ میں پورے جاہ وجلال کے ساتھ لشکر کشی میں مصروف تھا تو دوسری طرف خراسان کے علاقے میں باطنی اپنے خفیہ دین کی تبلیغ میں مصروف تھے ایک طرف کرامی اپنے مذہب کی اشاعت کے

لئے کوشاں تھے۔ کرامیوں اور اشعریوں کی باہمی نزاع اور اہل سنت وصوفیا کی چپقلش کے باعث حکمت ومعرفت سے لگاؤ رکھنے والا کوئی بھی شخص اس کشمکش اور جنگ وجدال سے محفوظ نہ تھا۔ خود محمود غزنوی کا دربار حنفی، شافعی، کرامی اور اشعری رقابتوں کا مرکز بن گیا تھا۔ ان تنازعوں میں خود محمود غزنوی کا مذہبی جھکاؤ ہلکورے کھا رہا تھا۔ وہ کبھی حنفی مسلک کی طرف راغب ہوتا تو کبھی شافعی۔ ہاں نیشاپور میں صوفیائے کرام کی تعلیمات خصوصاً ابوسعیدؒ سے کبھی کبھی اپنی طرف راغب کرتا۔ مگر 'باطنی' مذہب کی تبلیغ کا وہ ہمیشہ سے سخت مخالف رہا۔''(۳۰)

مزید انہوں نے ناصر خسرو کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم پر روشنی ڈالی ہے۔ ناصر خسرو بچپن ہی سے بے حد ذہین تھے۔ 9 سال کی عمر میں ہی حافظ قرآن، اور 14 سال کی عمر میں انہوں نے علم و ادب، فقہ، تفسیر اور حدیث کا درس بھی شروع کیا اور قرآن شریف کی تکمیل کے لئے انہوں نے تین سو تفسیریں اور امام شیبانی کتاب جامع کبیر، اور سیر کبیر بھی پڑھی۔ اس کے بعد وہ فلسفہ یونان کی طرف راغب ہوئے۔ ناصر جب 32 سال کے ہوئے تو دوسرے آسمانی صحیفوں، منطق الٰہی، طب وریاضت اور علم روحانیت، علم تسخیر اور طلسمات کی طرف متوجہ ہوئے اس طرح انہوں نے 44 سال کی عمر میں ایک عدیم النظیر حکیم، فلسفی، عالم، مناظر اور شاعر بن گئے۔

مختصراً یہ کہ قمر جمالی نے ان کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم، حصول دینی تعلیم وتربیت اور تعلیمی ترقی کے منازل، درس وتکمیل اور انکے فلسفۂ حیات پر روشنی ڈالی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں ناصر خسرو کے بچپن اور ان کے والد ماجد کے متعلق زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہوتی ہیں مگر قمر جمالی نے ناصر کی تکمیل علوم کی فہرست دیکھ کر یہ اندازہ لگایا ہے کہ خسرو ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی بدولت وہ اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ تکمیل درس کرتے رہے۔ ناصر کے بچپن کے متعلق مزید انہوں نے روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کا بھی اظہار کیا ہے جب خراساں میں قحط کا ایک وقعہ پیش آیا تو اس وقت ناصر کی عمر 7 سال کی تھی یہ وہ واقعات ہیں جو زبان زد خاص وعام رہیں جس کو ناصر سنتے رہے اور خلش کی اس روداد کو دل سے محسوس کرتے رہے اور اس کو ذہن میں محفوظ رکھتے گئے۔ درد سے نجات اور مفلسی کا تدارک ان کے لئے تکلیف دہ چیزیں بن گئیں۔ لہٰذا قمر جمالی نے ناصر خسرو کے بچپن کا ایک ہولناک قحط کا واقعہ پیش کیا ہے جس کو انہوں نے دردناک انداز میں بیان کرتے ہوئے اختصار سے کام لیا ہے ملاحظہ ہوں:

''بقول عتبیٰ یہ حال تھا کہ لوگ رات کی تاریکی میں سڑکوں اور رہگزاروں پر گھات لگا کر

بیٹھتے اور آنے جانے والوں کا اغوا کر لیتے اور ان کے گوشت سے اپنے پشت سے چپکے
ہوئے پیٹ کی آگ بجھاتے۔ اس قحط کے بعد جو وبا پھیلی تو سارے خراسان کو اپنی
لپیٹ میں لے لیا۔ یہ وبا جس شہر بھی گئی موت کا پیغام بن گئی۔'' (۳۱)

حکیم ناصر خسرو نے اپنے سفر نامے میں ایک مقام پر خود اپنی امیرانہ شان کے بارے میں لکھا ہے جس پر روشنی ڈالتے ہوئے قمر جمالی اپنی تنقیدی خیالات کا اظہار کرتی ہیں کہ شاید یہی وجہ ہوگی کہ ازل سے آخر تک ناصر خسرو کی زندگی عہد بچپن کی طرح اُن کی عالم جوانی بھی عیش وعشرت میں بسر کی چنانچہ قمر جمالی نے حکیم ناصر خسرو کی آمرانہ شان کی متعلق خود ان ہی کی زبانی الفاظ کو پیش کیا ہے ملاحظہ کریں:

''میں جس گھوڑے پر سوار ہوتا تھا، اس کی چال سے ہرن بھی شرمندہ تھا اور زین کا نمدہ ایسا رنگین
تھا جس کے سامنے تخت طاؤس کے نقش ونگار بھی کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔'' (۳۲)

مزید اس مضمون میں ناصر خسرو کی شہرت وصلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر کو مختلف زبانوں پر دسترس حاصل تھا اور وہ نوجوانی میں محرّری کے کام میں مہارت بھی حاصل کر لی تھی اور ناصر بھی عنفوان شباب میں شہری چمک سے متاثر ہو کر شان وشوکت کی طلب میں دربار شاہی کا رُخ کیا پھر وہ سلاطین، غزنویہ اور سلجوقی، باللہ فاطمی درباروں سے وابستہ ہو کر مستوفی الملک، تعلق دار کے عہدوں ہر فائز ہوئے بعد میں ناصر کو خلیفہ سے بیعت کا شرف حاصل ہوا وغیرہ کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کا شراب نوشی ترک کرنے اور حج بیت اللہ کا قصد کرنے اور تعلقہ دار کے عہدے سے استعفیٰ دینے اور ان کے سیاحت کے آغاز پر روشنی ڈالی ہے اور انہوں نے ناصر خسرو کی شخصیت کے متعلق اپنی تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ناصر خسرو کی شخصیت کا سب سے اہم اور عجیب پہلوان کا نظریۂ دین ومذہب کو قرار دیا ہے کیوں کہ حکیم ناصر خسرو کئی مختلف مسلکوں سے وابستہ رہے پھر بدلتے وقت اور رجحانات کے مطابق وہ اپنا مسلک بدلتے رہے جس بنا پر قمر جمالی نے ناصر خسرو کو اسمٰعیلیہ (باطنی) فرقے کا مبلغ شاعر قرار دیتے ہوئے ان کے مسلک بدلتے رہنے کے وجوہات کو بیان کرتی ہوئی وہ لکھتی ہیں:

''مجمع الصفحاء کی روایت کے مطابق ناصر خسرو سیاحت سے پہلے اثنائے عشری شیعہ تھا
لیکن چونکہ سلجوقی سلاطین حنفی مذہب کے پیرو کار تھے اس لئے ناصر نے تقیہ سے کام لیا،
لیکن ناصر جیسے عظیم المرتب فلسفی کے لئے یہ بات اس کے شایان شان نہیں تھی کہ وہ تقیہ

سے کام لے، کیوں کہ تقیہ نفس کا فریب ہے اور اخلاقی جرأت کے خلاف بھی ایک ٹھوس حقیقت تو یہ بھی ہے کہ واپسی مصر کے بعد ناصر خسرو نہ حنفی تھا اور نہ خالص شیعہ بلکہ وہ ٹھیٹ باطنی تھا۔اسمٰعیلہ فرقہ کے لوگ اپنے عقائد کو چھپاتے ہیں۔اس لئے وہ باطنی کہلاتے ہیں دراصل باطنی اسمٰعیلیہ ،شیعہ مذہب کا ایک فرقہ ہے جس کے متقدمین اب بھی شام، ایران ،افغانستان ،ترکستان ، برصغیر پاک وہند اور مشرقی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ یہ گروہ امام جعفر صادق کے بعد امامت کے حقدار انکے بڑے بیٹے اسماعیل کو سمجھتا ہے۔ابتداء میں یہ فرقہ زیادہ اہمیت کا حامل نہ تھا مگر تیسری صدی ہجری کے بعد انہوں نے خاص عقائد وضع کر لئے۔''(۳۳)

بعدازاں ناصر کا مصر سے واپسی کے بعد بلخ سے خراساں کی طرف کوچ کرنا اور باطنی مسلک کی کھلے عام میں تبلیغ کرنے پر سلجوقی سلاطین کے عتاب کا شکار ہونا ، پھر مجبوراً خراساں سے روپوش ہونا اور روپوشی کے دور میں انہوں نے اسمٰعیلیہ فرقے کی بنیادی مسائل پر ایک بیش بہا ''زادالمسافرین'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ پھر بدخشاں کے پہاڑی قصبے یمانمیں وارد ہوکر جہاں انہوں نے جس طرح کی عجلت کی زندگی گزاری اور جو طرح طرح کی سختیاں جھیلی اس کا ذکر کرتے ہوئے ان کی نثری تصانیف اوران کی شاعری وغیرہ کی تفصیلات فراہم کرتے ہوئے ان کے مقام ومرتبہ کو پرُ اسلوب انداز میں یوں بیان کرتی ہیں:

''حکیم ناصر خسرو وبلاشبہ ایک عدیم النظیر فلسفی اور ادیب تھا جو علم کی مختلف جہات پر دسترس رکھتا تھا۔ وہ بیک وقت ادیب تھا ،فلسفی بھی ، سائنس داں بھی ضخیم بھی ، مذہبی عقائد کا مبلغ بھی ، بہترین شاعر بھی اور شاعر مشرق علامہ اقبال ناصر خسرو کی شاعری کے معترف تھے۔''(۳۴)

بالآخر انہوں نے ناصر کی قبر کی زیارت کے لئے دور دراز ملکوں سے شام کی قبر پر آنے اور نذر چڑھانے کے متعلق اپنی معلومات قلم بند کی ہیں۔ زیر نظر مضمون کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قمر جمالی جس موضوع پر بھی روشنی ڈالتی ہیں اُس کی وضاحت صراحت کے ساتھ مدلل انداز میں اپنی بات کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

حسین منصور بن مصنور حلاّجؒ

قمر جمالی نے ایک تحقیقی مضمون ''حسین بن منصور حلاج کے عنوان کے نام سے لکھا۔ یہ مضمون 25/اگست 2007 میں لکھا گیا جو روز نامہ منصف میں 20/ستمبر 2007 کو شائع ہوا۔ اس مضمون کی ابتداء میں انہوں نے نہایت ہی دلچسپ انداز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُس واقعہ کو پیش کیا ہے جس طرح سے وہ خدا سے ہم کلام ہوئے اور حلاّج کہلائے اسی طرح منصور حلاّج کا تعارف پیش کرتے ہوئے اور وہ جس رموزِ نہاں کا انکشاف کیا جس کی بنا پر وہ حلاّج کہلائے۔ اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے۔

شیخ فریدالدین عطاؔر نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الاولیاء میں حضرت حسین بن منصور حلاج کا تعارف پیش کیا ہے جس کے متعلق قمر جمالی یوں لکھتی ہیں۔

> ''مجھے تو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ لوگ درخت سے انی انا اللہ کی صدا کو جائز قرار دیتے ہیں مگر یہی کلمہ جب حسین بن منصور کے حلق سے نکلتا ہے تو خلاف شرع بتاتے ہیں۔'' (۳۵)

حسن بن منصور حلاّج خطاب کے نام سے نوازے جانے کے متعلق وجہ بیان کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

> ''نام حسین، ابن منصور، حلاّج خطاب جس کی وجہ تسمیہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ آپ روئی کے ذخیرے پر سے گزرے اور عجیب انداز سے اشارہ کیا کہ روئی خود بخود دُھنک گئی۔ تب سے حلاج کہلائے۔'' (۳۶)

اس مضمون میں منصور حلاّج کے بیرونی ممالک کا سفر اور آپ نے متعدد بزرگانِ دین سے فیض حاصل کرنے اور حضرت یعقوب اقطع کی صاحبزادی سے نکاح کرنے کے ذکر پر روشنی پڑتی ہے۔ بعد ازاں وہ جنید بغدادی سے خفا ہو کر تستر پہنچنا۔ ادھر عمر و بن عثمان کے طرز عمل سے آپ نے صوفیانہ لباس ترک کر کے اہل دنیا کا لباس اختیار کرنا اور اہل فارس انہیں حلاّج اسرار کے لقب سے نوازے جانے کے بعد آپ نے بصرہ رخ کرتے ہوئے دوبارہ صوفیاء کرام کا لباس اختیار کر کے مکہ معظّمہ کے سفر کے دوران بے شمار صوفیاء کرام سے ملاقات کے بعد پھر چین پہنچ کر لوگوں کو وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

قمر جمالی مزید اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ منصور حلاّج کی مکہ معظّمہ میں جب دوبارہ واپسی ہوئی تو

آپ میں اس درجہ تغیر پیدا ہوا کہ آپ کا کلام لوگوں کی فہم سے باہر ہوگیا اور وہ جن مما لک میں جاتے لوگ آپ کو وہاں سے نکال دیتے تھے جس کی وجہ سے انہیں کئی طرح کی صعوبتیں سہنی پڑی وغیرہ کی تفصیلات فراہم کرتے ہوئے قمر جمالی ان کی عبادت وریاضت کے عالم پر روشنی ڈالی ہے اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:

''اب تک میرا کوئی مسلک نہیں ہے لیکن تمام مذاہب میں جو مشکل ترین چیزیں ہیں انہیں میں نے اختیار کرلیا ہے اور پچاس برس میں ایک ہزار سال کی نمازیں ادا کرچکا ہوں اور ہر نماز کے لئے غسل کو ضروری تصور کیا ہے۔''(۳۷)

آگے انہوں نے حسین بن منصور حلاّج، عبادت وریاضت کے دور میں جس طرح کی زندگی گزاری ہے اس سے متعلق وہ ایک واقعے کے ذریعے یوں پیش کرتی ہے ملاحظہ فرمائیں۔

''عبادت وریاضت کے دور میں آپ مسلسل ایک ہی گڈری میں زندگی بسر کرتے رہے۔لوگوں کے اصرار پر آپ نے گڈری اتاری تو اس میں تین رتی برابر جوئیں نکلیں اور آپ کے قریب ایک بچھو دیکھ کر آپ کے مرید نے اُسے مارنے کی کوشش کی تو فرمایا''اس کو مت مارو کیوں کہ بارہ (۱۲) برس سے یہ میرے ساتھ ہے۔''(۳۸)

زیرِ نظر مضمون میں مضمون نگار نے مختلف واقعات کی روشنی میں منصور حلاّج کے کرامتوں کا ذکر بیان کرتے ہوئے حسین بن منصور حلاّج کے ارشادات بیان کی ہے جو خود ہی اپنی جگہ اتنے معنی خیز اور سخت نفس کی تردید اور روح کی پرورش کرنے والے تھے جنہیں عام ذہن مشکل سے ہی قبول کرسکتا ہے۔زیرِ نظر مضمون کے مطالعہ کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ منصور حلاّج کی عبادتوں کا یہ عالم تھا کہ آپ پر کشف کی کیفیت طاری رہتی، اگر چہ وہ خود کو ظاہر کرنے کے خلاف تھے پھر بھی کبھی کبھی کرامتوں کے اظہار کو روک نہ سکے۔آپ کشف کی حالت میں ''حق حق انا الحق'' کہہ گئے۔یہ کلمہ کفر تھا۔آپ پر کشف کی سولی کا فتویٰ صادر ہوگیا۔چنانچہ علماء کی ایک جماعت خلیفہ ابن منصور سے سخت ناراض ہوئی اور انہیں ایک سال قید میں محبوس رکھا گیا۔قید کے بعد تعمیل حکم میں آپ کو قید خانے سے باہر لایا جانا اور کوڑے لگائے جانے پر بھی حلاّج کا انتہائی صبر وتحمل سے پیش آنا، پھر لوگوں نے آپ کے مخالفین

اور متبعین کے متعلق سوالات پیش کئے جانے پر مسرور کے ساتھ جوابات دینا وغیرہ کی معلومات کا جائزہ قمر جمالی مختلف تذکروں کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے ان کی شہادت کا ذکر جونہایت ہی دردناک تھا جس پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے اپنے خیالات وتاثرات کا اظہار کیا ہے۔

جب منصور حلاّج کی آنکھیں نکال کر زبان قطع کرنے کا ارادہ کیا گیا تو آپ نے کچھ بات کہہ لینے درخواست کی جسکے مطالعہ کے بعد منصور حلاّج کے صبر وشکر کا مقام مزین تھا جس پر روشنی پڑتی ہے ملاحظہ کیجئے۔

''اے اللہ! میرے ہاتھ تیری راہ میں قطع کر دیئے گئے۔آنکھیں نکال لی گئیں
اوراب سر بھی کاٹ دیا جائے گا لیکن میں تیرا شکر گذار ہوں کہ تو نے مجھے
ثابت قدم رکھا میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ ان سب لوگوں کو بھی وہی مہلت
عطا فرما جو مجھے عطا کی ہے۔''(۳۹)

قمر جمالی زیر نظر مضمون میں منصور حلاّج کی حیات اُس سالک کی عشق کو پیش کیا ہے جو اللہ کی راہ میں فنا ہوئے اور جیتے جی اپنے آپ کو عشق الٰہی میں جلا کر راکھ کر دیا اس کے بعد حلاج کی شہرت ایک عظیم صوفی اور شہید عشق کی حیثیت سے مشہور ہوئی۔الغرض اس مکمل مضمون میں قمر جمالی نے منصور حلاّج کا تعارف وتذکرہ،حلاّج کہنے کی وجہ،اناالحق،عشق الٰہی،عشق اور سولی،دوستی وصبر کا مفہوم اور آپ کی عاجزی آپ کی کرامات وارشادات کو مدلل انداز میں بیان کیا ہے جسے پڑھ کر قاری نہ صرف نصیحت حاصل کرتا ہے بلکہ متاثر بھی نظر آتا ہے۔

مولانا جلال الدین بلخی الرومیؒ

قمر جمالی کا ایک مضمون ''مولانا جلال الدین بلخی الرومیؒ'' کے عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے۔جونہایت ہی اہم ہے۔یہ مضمون روز نامہ اعتماد(حیدرآباد)24/مارچ2008اور31مارچ2008 کو دوقسطوں میں شائع ہوا ہے۔قمر جمالی نے فارسی ادب کے قابل قدر وبلند اونچے مقام رکھنے والے جن چند اہم شخصیتوں پر روشنی ڈالی ہے ان میں مولانا رومیؒ بھی فارسی کے سب سے نمایاں صوفیانہ شاعر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

اس مضمون کا آغاز قمر جمالی نے بہت ہی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔قمر جمالی اس مضمون میں جلال الدین رومیؒ کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے والد سلطان العلماء بہاء الدین کو اپنے بیٹے مولانا رومی سے بے انتہا محبت

اوران کی عظمت و برزگی کا ذکر کرتے ہوئے جلا الدین رومیؒ کے حق میں ان کے والد نے جو پیشن گوئی کی ہے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ شیخ فریدالدین عطارؒ نے جس فلسفے کو پیش کیا ہے۔ مولانا رومیؒ کی ولادت اور ان کے والد سلطان العلماء بہاالدین کی شخصیت اور آپ کا وسیع حلقہ احباب ومتقدمین کے ساتھ تدریس وفتویٰ کی مسند پر فائز ہونا اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سلطان العلماء کا لقب عطا ہونا اور سلطان العلماء کے اس عہد کے حالات اور رومیؒ کا پانچ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ بلخ سے ہجرت کر کے نیشا پور اور بغداد کے راستے حجاز روانہ ہونے کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ مزید انہوں نے رومیؒ کے عہد کے حالات کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے حسب ونسب، خاندان، مولانا کے آبا واجداد اوران کے بزرگوں کے ذاتی اکتسابی وکمالات کا ذکر کیا ہے۔

خود مولانا بہاءالدین نے جلال الدین کے حسب ونسب کے تعلق سے جو کچھ کہا ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں:

> ''میرا بیٹا نسل بزرگ سے ہے اور بادشاہ اصل سے ہے۔ اس کی ولایت با صلابت ہے اس کی نانی شمس الدین سرخسی کی بیٹی تھیں جن کا نسب ماں کی جانب سے حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ میری والدہ خوارزم شاہ والی بلخ کی دختر تھیں۔ اور میرے دادا احمد الخطسی کی والدہ بھی بادشاہ بلخ کی لڑکی تھیں۔'' (۴۰)

آگے قمر جمالی نے حضرت بہاءالدین کا تعارف پیش کرتے ہوئے ایک واقعہ کے ذریعے بہاءالدین کی علم وفضل کی کیفیت کا ذکر کیا ہے اوران کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی عظمت وجلال مقام ومرتبہ کا اظہار کرتے ہوئے اوران کے اسلاف کا ذکر اوران کے فرزند مولانا رومیؒ کی ابتدائی تعلیم، ترکِ وطن، رومیؒ کا عقد، اوران کے اولاد کا ذکر کرتے ہوئے رومی کے والد سلطان العلماء بہاالدین کی وفات پر روشنی ڈالی ہے اوران کی وفات بعد مولانا جلال الدین رومیؒ آپ کے سلسلہ درس وتدریس کو جاری رکھنا اور مولانا برہان الدین کے مرید ہونا اور اپنے والد ماجد کے بعد مراتب سلوک آپ کے ساتھ طے کئے گئے معلومات کو فراہم کیا گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ ان کی وفات کے بعد رومیؒ دمشق پہنچ کر مدرسہ مقدسیہ میں قیام کیا اور تحصیل علم میں مشغول ہوئے اور یہیں سے مولانا کی

شاعری کا آغاز بھی ہوااور ساتھ ہی مولانا شمس تبریزیؒ سے پہلی ملاقات کے ذکر پر رشنی ڈالتے ہوئے مولانا رومیؒ اور شمس تبریزی کے ملاقات کے متعلق کو مختلف دلائل وروایات کی روشنی میں معلومات فراہم کراتے ہوئے ان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

ایک مقام پر قمر جمالی مولانا جلال الدین رومی کے بچپن کے قوتِ روحانی اور عالم ملکوت کی سیر کے متعلق ایک واقعہ کو نہایت دلکش اور پر اسلوب انداز میں بیان کیا ہے جس کے مطالعے کے بعد ہمیں مولانا رومیؒ کی کرامات کا علم ہوتا ہے مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''مولانا کی عمر ہنوز چھ برس تھی کہ ایک جمعہ کو آپ بلخ میں اکابر شہر کے لڑکوں کے ساتھ کوٹھے پر سیر کر رہے تھے کہ ایک لڑکے نے کہا'' آؤ اس چھت پر سے دوسرے چھت پر کودیں......''

مولانا نے ہنس کر کہا۔

''یہ تو کتے، بلی اور دوسرے جانور بھی کر سکتے ہیں اور قوتِ روحانی ہے تو آسمان پر چلو اور منازلِ ملکوت کی سیر کرو۔ یہ کہتے ہی نظروں سے غائب ہوگئے۔ لڑکے چلانے لگے آپ پھر ظاہر ہو گئے اور فرمایا۔

جس وقت میں تم سے باتیں کر رہا تھا سبز قبا والوں کی ایک جماعت مجھے تمہارے درمیان سے اٹھالے گئی۔ بروجِ آسماں اور عجائب عالم روحانی کی سیر کروائی۔ جب تمہارے چلانے کی آواز پہنچی تو مجھے پھر یہاں پہنچادیا ۔''(۴۱)

قمر جمالی نے اس مضمون میں حضرت شمس تبریزی اور مولانا جلال الدین کی ملاقات کے ذکر کے متعلق کئی مختلف روایتیں رقم کی ہیں جن میں سے ایک روایت مولانا کے خلف اکبر سلطان ولی نے مولانا کی شمس تبریزیؒ سے ملاقات کا ذکر کو''رباب نامہ'' میں بیان کیا ہے۔جس میں دونوں کے درمیان سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہتا ہے

۔

غرض ان تمام روایات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قونیہ میں مولانا سے شمس تبریزی کی ملاقات

خداوند کے حکم سے بڑی نرالے انداز میں ہوئی جس نے مولانا کی زندگی یکسر بدل کر رکھ دی۔

فارسی ادب کے دوسرے صوفیانہ اور صوفی شاعروں کی طرح رومیؒ کی شاعری بھی محبت کی بات کرتی ہے جو دنیا کو متاثر کرتی ہے۔ رومی کی تعلیمات قرآنی آیات میں ان اصولوں کا بھی اظہار کرتی ہیں جن کا خلاصہ شمس الدین تبریزیؒ نے پیش گوئی کی رہنمائی کے نچوڑ کے طور پر کیا ہے۔

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ جب دونوں کی صحبتیں گرم ہوئیں تو مولانا نے ہر بات میں شمس تبریزی کی اتباع کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے مولانا کے مریدوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ حضرت شمس تبریزیؒ ان لوگوں کی گستاخیوں پر تحمل کرتے رہے مگر جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا تو وہ خاموشی کے ساتھ قونیہ نکل گئے۔ حضرت کے غائب ہو جانے کے بعد مولانا ان کی تلاش میں لگ گئے۔ اب مولانا کی حالت متغیر ہونی شروع ہوئی۔ مولانا نے حضرت شمس تبریزیؒ کی فراق میں کثرت سے نہایت ہی دل دوز غزلیں کہیں۔ مولانا کے اضطراب کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی جھوٹ بھی کہہ دیتا کہ اُس نے حضرت کو دیکھا ہے تو اس وقت ان کے ہاں جو کچھ بھی ہوتا وہ اُسے دے دیتے۔ آخر کار انہوں نے ڈھونڈنے کی راہ نکالی دمشق کا سفر کیا مگر دمشق میں بھی حضرت کا کچھ پتہ نہ چلا تو وہ قونیہ کا خیال لے کر واپس لوٹے جس کے متعلق قمر جمالی نے یوں قلم بند کیا ہے:

> ''میں خود عین شمس ہوں۔ شمس کی جستجو کیا تھی، درحقیقت خود اپنی ہی جستجو کر رہا تھا۔''(۴۲)

مزید یہ کہ مولانا کے آخری زمانہ میں طبیعت میں اضمحلال بڑھا۔ مولانا کے ایام علالت میں شہر کے تمام افراد و شیوخ عیادت کو آئے۔ عین انتقال کے قریب اپنے مریدوں کو جو نصیحت فرمائی وہ ''نفحات الانس'' کے حوالے سے ایک اقتباس پیش کیا ہے چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

> ''میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ سراً و علانیتہً خدا سے ڈرتے رہو، کھانے، سونے اور گفتگو میں کمی کرو، گناہوں سے دور رہو۔ روزے رکھو، شہوتوں کو ہمیشہ ترک کرتے رہو۔ ہر طرح کے لوگوں کی جفاؤں کو برداشت کرو۔ نادانوں اور عاصیوں کی ہم نشینی چھوڑ دو، نیکیوں اور بزرگوں سے مصاحبت رکھو، بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے اور بہترین کلام وہ ہے جو قل

ودل ہو۔تمام تعریف وتوصیف خدائے واحد ذوالجلال کے لئے ہے اوراُس
پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام۔'' (۴۳)

بالآخر قمر جمالی نے مولانا جلال الدین رومیؒ کے انتقال کی تاریخ وفات اوران کی تجہیز وتکفین پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے ہمارے معلومات میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب مولانا کو غسل دینے کے بعد جنازے کو باہر لایا گیا تو ہر قوم وملت کے لوگوں پر جو اضطراب کا عالم گزرا مولانا کے متعلق ان کے نظریات پر روشنی ڈالی ہے چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

''ہم نے انبیائے سابقین کی حقیقت کوانہیں کے بیان سے سمجھا۔اولیائے اکمل کی
روش کوانہیں سے جانا۔ اگر وہ مسلمانوں کے لئے محمد وقت تھے تو ہمارے لئے
موسائے وقت اورعیسائے زماں تھے۔مسلمان جس درجہ ان سے محبّ ومخلص ہیں
ہم اس سے زیادہ ہیں۔'' (۴۴)

الحاصل یہ کہ قمر جمالی اس مضمون میں جلال الدین رومیؒ کے اسلاف کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے مولانا کی حیات کاملہ، روحانی قوت وکرامات اورآپ کا شجرۂ اسنادِ خرقہ اور مولانا کی شمس تبریزیؒ سے ملاقات کے ذکر پر روشنی ڈالی ہے۔مکمل مضمون کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مصنفہ نے اس مضمون میں زیادہ تر مولانا رومیؒ اور حضرت شمس تبریزؒ کی صحبت وملاقات کے تذکروں پر زور دیا ہے۔شمس تبریزیؒ زیادہ مراتب کے خواہاں کی تلاش میں اللہ کے حکم سے انہیں جلال الدین رومی کی محبت نصیب ہوئی جس کے شکرانہ میں انہوں نے اپنے 'سر' کو اللہ کی راہ میں پیش کیا ادھر مولانا حضرت کی صحبت میں اتنے منزلیں طے کئے جن کی صحبت سے مولانا درحقیت خود انہی کی جستجو کو تلاش کرلی اور مزید اس مضمون میں مولانا رومیؒ کی زندگی کے حقیقی واقعات کو سامنے رکھ کر ان میں سے چند ایسے واقعات وروایات کا انتخاب کیا جو موضوع کی سیرت کو واضح طور پر پیش کرسکیں۔

الغرض اس طویل مضمون کے مطالعے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قمر جمالی کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور وہ اپنی بات کو زمانے کے تقاضے کے اعتبار سے پیش کرنے اور سمجھانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

صوفی سرمد شہیدؒ

قمر جمالی کا ایک اور مضمون ''صوفی سرمد شہید'' عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ۱۹؍مئی ۲۰۰۸ء کو تخلیق کیا گیا جو روز نامہ مصنف (حیدرآباد) میں ۱۲؍فروری ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک طویل مضمون ہے۔ قمر جمالی نے اس مضمون کی ابتداء میں موسیٰ علیہ السلام کی حیات اور ان کے بے عیب ہونے کے متعلق ایک واقعہ کو قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں نہایت ہی دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں انھوں نے صوفی سرمد شہید کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے فلسفۂ حیات پر روشنی ڈالی ہے چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

> ''صوفی سرمد نے جس فلسفہ حیات کو جیا ہے اُس فلسفے میں میں اور کو جسم و بے جسمی، لباس و برہنگی کا تصور شامل ہی نہ تھا کیوں کہ سرمد کے آگے تو فلسفہ ہمہ اوست تھا جو تصوف کا بنیادی تصور ہے۔'' (۴۵)

قمر جمالی صوفی سرمد شہید کی ولادت اور انتقال کی تاریخ کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کرتے ہوئے اس عہد کے پس منظر کو بیان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اقتباس ملاحظہ ہوں۔

> ''سرمد کی تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں۔ ہاں سن شہادت ۱۰۷۲ھ مطابق ۱۶۶۷ء تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آفتاب اسلام عالم ارض پر ہر طرف اپنا نور بکھیر رہا تھا۔ اس نورِ تجلّی نے جسم وجان اور ملّت وقوم کے امتیازات کو خس وخاشاک کی طرح بہا دیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب احرارِ قریش اور قائے حبش، بطحا و یثرب اور عجم و فرنگ، تاجدار داغستان اور بادہ نشین عرب سب یکساں طور پر فیضیاب ہو رہے تھے۔ اسی فیض عام کی ایک نمایاں نظیر صوفی سرمد شہید بھی تھے۔'' (۴۶)

زیر نظر مضمون میں قمر جمالی نے صوفی سرمد کے خاندان اور ان کی تعلیم و تربیت پر روشنی ڈلی ہے۔ بعد ازاں صوفی سرمد تجارت کی غرض سے ہندوستان کا رخ کیا پھر وہ ہندوستان آنے کے بعد ایک ہندو لڑکے کی چشمِ کافر کا شکار ہوئے جس نے سرمد کی دنیا الٹ کر رکھ دی۔ سرمد کی اس عشق کی دیوانگی کے متعلق مراۃ الخیال کے مصنف علی شیر

نے جو کچھ لکھا ہے مولانا آزاد علی شیر کے خیالات سے اکتفاءنہیں کرتے جس پر روشنی ڈالتے ہوئے قمر جمالی یوں رقمطراز ہیں:

''علی شیر کو کیا خبر کہ دنیا میں ایسے ترازو بھی ہیں جن کے ایک پلے میں دیوانگی رکھ دی جائے تو دوسرا پلہ تمام عالم کی ہوشیار رکھنے سے بھی نہیں جھک سکتا ۔''(۴۷)

سرمد کی شہادت کا سانحہ(۱۶۵۹ء) عہد عالمگیری کا ایک یادگار المیہ ہے۔قمر جمالی نے اس مضمون میں صوفی سرمد کے داستانِ شہادت کی کیا وجوہات رہیں اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔الغرض اس مضمون کے مطالعے کے بعد یہ وجوہات آشکار ہوتی ہیں کہ صوفی سرمد جب جوش جنوں میں پھرتے ہوئے شاہجہاں آباد(دہلی) پہنچے تو انہیں داراشکوہ کی مصاحبت نصیب ہوئی۔صوفی سرمد علم وفن کے یکتائے زمانہ،حقیقت شناس،ذی علم،حلیم الطبع شخص تھے ۔اورنگ زیب عالمگیر کے ہم عصر اور داراشکوہ کے پیرومرشد تھے وہ اپنے دور کے مجذوب تھے،قوم کے یہودی تھے لیکن بعد میں انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔دیکھتے ہی دیکھتے سارا شاہجہاں آباد آپ کا معتقد ہوگیا اورسلطان داراشکوہ بھی ابتداء ہی سے درویشوں اورصوفیوں کی صحبت میں رہا کرتا تھا،اسلئے اس نے بھی سرؔمد جیسے مجانین کی صحبت کو ہوش والوں کی مجلس پر ترجیح دی۔غرض کہ سرؔمد داراشکوہ کی صحبت میں رہنے لگےاور داراشکوہ کو بھی سرمد سے کمال عقیدت تھی۔اورنگ زیب عالمگیر کو سرمد اور داراشکوہ کی مصاحبت آنکھوں میں کھٹکنے لگی اور وہ ان کے خلاف موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔پھر شاہجہاں کی علالت اور داراشکوہ کی نیابت نے عالمگیری اداروں کے ظہور کا سامان کردیا اورایک عرصہ کی شورش وخون ریزی کے بعد ۱۶۵۹ میں اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو داراشکوہ اوراس کے ہمنشیں معتوب ہوئے مگر جو بھی سرؔمد کے ساتھ شاہجہاں آباد میں رہ گئے وہ سب اورنگزیب کے غیض وغضب کا شکار ہوئے ۔غرض کہ بیشتر تذکرہ نویسیوں کی روشنی میں قمر جمالی نے سرؔمد کی شہادت کی ایک بڑی وجہ ان کی ایک رباعی قرار دیا ہے۔غرض اس رباعی کو جُبّہ پوشیوں نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج جسمانی سے انکار پر محمول کیا اور سرمد پر کفر کا فتویٰ عائد کردیا لیکن اصل بات یہ ہے کہ عالمگیر کی نظروں میں تو سرؔمد کا سب سے بڑا جرم داراشکوہ کی معیت تھی۔اوروہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔دراصل بات یہ ہے کہ ایشیا میں ہمیشہ سے پالٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہےاور ہزاروں خورنریزیاں جو پولٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں انہیں وہ مذہب کی چادر اُٹھا کر

چھپایا گیا ہے۔ جب کوئی بہانہ ملے تو عریانی و برہنگی کو خلاف شرع بنیاد قرار دیا اور مذکورہ بالا رباعی سے نتیجہ نکالا کہ معراج جسمانی کا منکر ہے۔ ملا قوی اس زمانہ میں قاضی القضاۃ تھے۔ عالمگیر نے انہیں سرمد کے پاس بھیجا کہ برہنگی وجہ دریافت کریں، سرمد نے برجستہ جواب دیا کہ کیا کروں شیطان قوی ہے اور فی البدیہہ ایک رباعی پڑھی۔ ملا صاحب برہم ہوئے اور برہم ہونے کی بات ہی تھی کیوں کہ اسلام کی توہین نہیں کی گئی ،مگر خود انکے وجود اسلام عبارت کی سخت اہانت ہوئی۔ یعنی ان کا نام نامی شیطان کا وصف قرار پایا۔ بہرکیف عالمگیر کی عاقبت اندیشوں نے صرف اس بہانے کو کافی نہیں سمجھا کیونکہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ سرمد کوئی معمولی انسان نہیں ہے اس لئے جب تک کوئی قوی بہانہ ہاتھ نہ آجائے۔ تب تک اس ارادے کو ملتوی رکھنا چاہئے۔

سرمد کی تقدیر میں جنون عشق کے ہاتھوں شہید ہونا لکھا تھا اور پھر خود سرمؔد نے اس کی طلب بھی کی تھی۔ بالآخر اتفاق رائے سے یہ تجویز طے ہوئی کہ سرمد کو مجلس میں بلایا جائے الغرض سرمؔد کو مجلس میں طلب کی گئی اور برہنگی کے متعلق سوال و جواب کیا گیا اس کا جواب سرمد پہلے دے چکے تھے اس لئے وہ چپ رہے۔ قمر جمالی نے مجمع عام کی مزید تفصیل والا داغستانی کی روایت نقل کرتے ہوئے صوفی سرمد کی شہادت کی داستان کو بیان کیا ہے۔

خلاصہ گفتگو یہ کہ اورنگ زیب نے داراشکوہ اور سرمد کے خلاف موقع کی تلاش میں رہنا پھر جن کا عالمگیری غیض و غضب کا شکار ہونا، سرمؔد نے ایک ایسی رباعی کہی جس کی وجہ سے ان کی رباعی کو خلاف شرع مانا گیا اور ان پر کفر کا فتویٰ عائد کردگیا یہی ساری چیزیں سرمؔد کی شہادت کی وجہ بنی۔

قمر جمالی نے مختلف روایات کی روشنی میں مزید یہ بھی لکھا ہے کہ صوفی سرمؔد نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کلمہ طیبہ لا الٰہ سے آگے پڑھا ہی نہیں ہے مگر شہادت کے بعد لوگوں نے سنا ہے کہ سر کشتہ سے تین بار ''الا اللہ'' کی صدا بلند ہوئی۔ جس کے متعلق قمر جالی اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار بھی کیا ہے کہ موجودہ زمانے میں ایسی باتوں پر یقین بہت ہی مشکل ہے۔ تصوف کی دنیا میں ایسے کئی واقعات گزر چکے ہیں جن پر ایمان لانا ناگزیر ہے۔ الغرض بظاہر تو داستانِ سرمد ختم ہوئی مگر حقیت میں یہ ختم نہ ہونے والی دستان عشق ہے۔ صوفی سرمد کو شہید ہوئے کئی صدیاں گزر گئیں لیکن شہید سرمد آج بھی زیارت گاہ کے لئے خاص و عام ہے۔

بالآخر سرمد کی شہادت کے بعد اورنگزیب کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے کئی سال حکومت کی لیکن خون سرمد نے اورنگ زیب سے اس کا چین وقرار چھین لیا تھا پھر وہ کبھی چین سے

سونہ سکا اوراس کو آنکھیں بند کرتے ہی سرمد کی شکل سامنے نظر آتی جس کی وجہ سے پریشان ہوا کرتا تھا بالآخر پریشانی کے عالم میں اورنگ زیب کے مرشد قلبہ کے بشارت دینے پرخلد آباد میں زین الدین شیرازی کی مزار پر پہنچا وہاں ایک خادم عالمگیر کو ایک کمبل عطا کی جس کے سرتاپا اوڑھنے سے عالمگیر کو چین کی نیند آنے لگی۔ خدا تعالیٰ کی مرضی دیکھئے کہ موت کا وقت آیا بھی تو غریب الوطنی میں۔ پھر انتقال کے بعد اورنگ زیب کو اس کی وصیت کے مطابق خلد آباد میں ہی دفن کیا گیا۔

مضمون صوفی سرمد شہید ہمارے علم میں مزید اضافے کا باعث بنتا ہے کیوں کہ قمر جمالی نے شہر خلد آباد کا پہلا تاریخی نام ''روضہ'' بتایا ہے چونکہ اورنگ زیب کا نام خلد اشیانی تھا عالمگیر کو وہاں دفن کیا گیا تو اسی مناسبت سے روضہ کا نام خلد آباد رکھا گیا ہے۔

الغرض صوفی سرمد کی یہ شہادت داستان دراصل 'الا اللہ'' جو شریعت کے برخلاف تھی تکمیل کو پہنچی اس مضمون کے مکمل مطالعے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مضمون قمر جمالی کی تحقیقی طریقہ کار کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

حضرت شمس تبریزؒ

قمر جمالی نے ایک مضمون ''حضرت شمس تبریزؒ'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ مضمون ۲۵ دسمبر ۲۰۰۷ء کو تخلیق کیا گیا جو روز نامہ ''منصف'' میں ۲۵ رفروری ۲۰۱۰ء کو شائع ہوا۔ اس مضمون کی ابتداء انہوں نے اس جملے سے کیا ہے کہ ہر نبی کے لئے ایک ابوبکر لازم ہے، یہاں ابوبکر محبت وایثار کا استعارہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ یعنی ایثار وقربانی کا عظیم پیکر مانے جاتے ہیں دراصل بات یہ ہے کہ افضل البشر بعد الانبیاء، خلیفہ اوّل وجانشین مصطفیٰ امت مصطفویہ کے ہادی ورہبر، ملت اسلامیہ کے ماتھے کے حسین جھومر، عاشق اکبر، امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فضائل ومناقب اوران کی مدح وثنا کا کیا کہنا آپؓ اپنے صدق وصفا اور محبت حسب خدا کے بعد آپ اس قدر جامع الکلمات اور جمع الفضائل ہیں کہ انبیاء علیہ السلام کے بعد تمام انسانوں میں سب سے افضل واعلیٰ مانے جاتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ کے سوا کوئی بھی محبوب خدا کا یاد وفادار ورفیق غمگسار پیش تھا اور واقعی آپؓ نے صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے جاں نثار ثابت ہوئے کہ وفاداری جاں نثاری کی انتہائی منزل بیان کرنے کے وقت آپ کا نام مبارک ضرب المثل بن گیا ہے۔ چنانچہ قمر جمالی نے پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیقؓ کے درمیان جو ایثار ومحبت ہے جس

کوانھوں نے امرحیات اور رمزحیات قرار دیا ہے غرض اسی طرح شمس تبریزیؒ کا ذکر مولانا جلال الدین رومیؒ کے بغیر ناممکن قرار دیتے ہوئے ان دونوں کی صحبتوں کو امرِ حیات کے نام سے منسوب کیا ہے۔ نیز قمر جمالی شمس تبریزؒ کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس عہد کے پس منظر کو اجاگر کیا ہے ملاحظہ ہوں:

''حسن بن صباح نے جب ۴۸۳ھجری مطابق ۱۰۹۰ء میں قلعہ الموت پر قبضہ کر کے فرقہ اسمٰعیلیہ کی بنیاد مستحکم کی تو خود اپنے بیٹوں کو عدم اطاعت کے جرم میں قتل کر ڈالا ۔ اور ایک کیا(Kiya) بزرگ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ ایک روایت کے مطابق اسی کیا بزرگ کی چوتھی پشت سے جلال الدین ۶۰۷ھجری مطابق ۱۲۱۰ء میں منصب امامت پر فائز ہوا۔ مگر اس نے اپنے بزرگوں کے طریق عبادت کو ترک کر کے صحیح اسلامی عقائد اختیار کیا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت شمس الدین اسی جلال الدین تو مسلمان کے فرزند تھے۔''(۴۸)

قمر جمالی پھر اس کے بعد مختلف دلائل واقعات کی روشنی میں شمس تبریزؒ کی ولادت ان کے والدین، ان کے خاندانی پیشے اور ان کے بچپن و پرورش، تحصیل علم کی غرض سے تبریز کا روانہ ہونا، پھر علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے متعدد بزرگانِ دین سے فیض حاصل کیا اور صحرانوردی کی طرف مائل ہونے کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے شمس تبریزیؒ کی مولانا جلال الدین رومی سے پہلی ملاقات کا ذکر ایک واقعے کے ذریعے بڑے دلنشیں پیرائے میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں کہ:

''ایک روز شمس تبریزی نے میدانِ دمشق میں مولانا کو سیر کرتا ہوا دیکھ لیا۔ ایک عجیب الہیئت شخص کو سیاہ نمدہ پہنے گھومتا دیکھ کر مولانا بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ ٹہلتے ٹہلتے مولانا جب شمس تبریزی کے قریب پہنچے تو آپ نے اچانک مولانا کے ہاتھ کہ بوسہ دیا۔

اور کہا............

''صراف عالم اوریاب''

(ترجمہ اللہ کی ذات نے مجھے پالیا)

جب تک مولانا ادھر متوجہ ہوتے آپ لوگوں کے ہجوم سے غائب ہو گئے۔ بعد ازاں لوگوں نے بتایا کہ وہ شمس تبریزی تھے۔ یہی شمس تبریزی کی مولانا رومی سے پہلی ملاقات تھی۔ اس دوران جلال الدین رومی کے پیر و مرشد سید برہان الدین ترمذی کا انتقال ہو گیا اور مولانا واپس قونیہ لوٹ گئے۔" (۴۹)

ایک اور تصنیف "نفحات الانس" میں شمس تبریزی اور مولانا کی ملاقات کی دو روایتیں ہیں۔ ایک تو بہ ادنیٰ تغیر وہی سپہ سالار اور افلاک والی اور دوسری بعضے گفتہ اندر کی قید کے ساتھ یوں کہ جن کی ملاقات کے ذکر کے متعلق ایک اور مقام پر وہ لکھتی ہیں:

"جب شمس تبریزی قونیہ پہنچے اور مولانا کی مجلس میں وارد ہوئی تو اس وقت مولانا ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور چند کتابیں سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ شمس تبریزی نے مولانا رومی سے پوچھا............ یہ کتابیں ہیں؟ مولانا نے جواب دیا یہ قیل وقال ہیں آپ کو اس سے کیا کام ہے......؟ شمس تبریزی نے نہایت سرعت سے تمام کتابیں اٹھا کر پانی میں ڈال دیں۔ مولانا سخت رنجیدہ ہوئے اور فرمایا یہ کیا کیا...... اس میں میرے والد کے بعض فوائد تھے جواب نہیں مل سکے۔ شمس تبریزی نے ہاتھ بڑھا کر ایک ایک کتاب حوض سے باہر نکال کر رکھ دی کتابوں پر پانی کا کوئی اثر نہ تھا۔

مولانا نے پوچھا................. یہ کیا راز ہے؟

شمس تبریزی نے جواب دیا........... "ذوق وحال ہے آپ کو اس سے مطلب؟" (۵۰)

قمر جمالی نے اس مضمون میں متعدد تصانیف کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے شمس تبریزیؒ اور مولانا روم کی ملاقات کے متعلق مختلف روایات بیان کی ہیں۔ الغرض ان تمام روایتوں سے یہ معلوم ہوتا کہ قونیہ میں مولانا شمس تبریزی کی ملاقات جب دونوں کی صحبتیں گرم ہوئیں۔ مولانا نے ہر بات میں شمس تبریزی کا اتباع شروع کیا۔ اس حد تک کہ حضرت شمس سے ملاقات کے بعد مولانا رومی نے درس وتدریس واعظ گوئی سب ترک کر دی جس سے آپ کے مرید بدظن ہو گئے۔

آپ کے مریدوں نے مولانا کی اس حالت کی ذمہ دار شمس تبریزیؒ کو ٹھہرایا۔ غرض سب کے سب ان

کے دشمن ہو گئے ۔شمس تبریزی مولانا سے محبت وعقیدت کی وجہ سے لوگوں کی گستاخیوں کو برداشت کرتے رہے ۔مگر معاملہ جب حد سے تجاوز کر گیا تو انہوں نے ایک خاموشی کے ساتھ قونیہ نکل گئے ۔الغرض قمر جمالی اپنے خیالات کو ترتیب ومربوط انداز میں بیان کرتے ہوئے شمس تبریزی کے متعلق مولانا کے مریدان کے خیالات کو پیش کیا ہے ملاحظہ کریں:

''ہم نے اپنی زندگی حضرت پر قربان کردی ۔اب ایک بے نام ونسب شخص آیا اور مولانا کی سب سے الگ کر گیا۔آپ کی صورت تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی ۔درس وتدریس وعظ وتذکیر سب ختم ہوگئی ۔ضرور یہ کوئی ساحر ہے ورنہ اس کی کیا ہستی ایک پہاڑ کو یوں تنکے کی طرح بہالے جائے ۔'' (۵۱)

قمر جمالی اس مضمون کے آخر میں مولانا کی شمس تبریزؒ سے جدائی کے عالم میں دنیا سے منہ موڑ لینے، یہاں تک کہ اصحاب صدق ووفا بھی مولانا کی صحبت سے محروم ہونا پھر مولانا کی یہ حالت دیکھ کر شمس واپس قونیہ لوٹتے ہیں جس پر مولانا کی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے شمس تبریزی سے آپ کے مریدوں کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شہادت کا ذکر یوں بیان کرتی ہے ۔حضرت سلطان ولد (فرزند مولانا رومی) سے روایت ہے کہ ایک رات وہ مولانا کے ساتھ بیٹھے تھے کہ باہر کسی نے آواز دی ۔شمس فوراً اٹھ گئے اور مولانا سے کہا:

''مجھے قتل کرنے کے لئے بلاتے ہیں ۔کہتے ہیں سات نا اہل اس کا ہر متعدد تھے اور تاک میں لگے تھے موقع پا کر چھری چلائی ۔شمس نے ایک زور کا نعرہ مارا کہ سب بے ہوش ہوگئے ۔جب ہوش میں آئے تو دہلیز پر چند قطرے خون کے سوا کچھ نہ تھا۔اس کے بعد آپ کا کہیں پتہ نہ چلا ۔شمس تبریزی نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا کیا۔عشق میں سر کی قیمت ادا کی ۔نہ مرکے رسوا ہوئے نہ غرق دریا رہا چھ سو سال بعد (غالبًا) غالب نے یہ مصرعہ لکھا۔

نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔'' (۵۲)

غرض قمر جمالی نے اس مکمل مضمون میں شمس تبریزی اور مولانا رومی کی محبت وعقیدت کا ذکر اور شمس تبریزی جیسے صوفی سالک کی کرامات کو مختلف روایات کے ذریعے مختلف اندز میں پیش کیا ہے ۔

گوشہ راج بہادر شاہ گوڑ:

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور بہادر شاہ ظفر سال ۱۹۹۰ء

قمر جمالی نے تین مضامین راج بہادر گوڑ کی شخصیت پر لکھے ہیں جن کے مطالعے سے ان کے حالاتِ زندگی اوران کی ادبی خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔ان میں سے ایک مضمون ''ڈاکٹر راج بہادگوڑ اور بہادر شاہ ظفر سال ۱۹۹۰ء'' کے عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ۱۸/مارچ ۱۹۹۱ء کو لکھا گیا جو روز نامہ سیاست مارچ ۱۹۹۱ء کو شائع ہوا۔قمر جمالی اس مضمون کو ابتداء میں راج بہادر گوڑ کو ان کی ادبی خدمات کے لیے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ ملنے پر اپنی خوشی کا اظہار محبت وعقیدت واحترام اور پرُخلوص جذبہ کے ساتھ ان سے جو شخصی مراسم رہے ہیں جس کو وہ فیض احمد فیض کے اشعار کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ رات کا اندھیرا ابھی باقی ہے لیکن کچھ سحر کے رنگ سے منّور ہو گئے ہمارا خون ان میں جلتا ہے یا ہمارے دل وجاں محفل میں کچھ چراغ جلے تو ہیں جس سے گوڑ صاحب کے تئیں قمر جمالی کے شدید احساسات کا پتہ چلتا ہے۔

مزید انہوں نے گوڑ صاحب کے متعلق اپنے خیالات کو پیش کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو ایک عام انسان اور اپنے نظریہ کو ایک عام نظریہ سمجھتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ راج بہادر گوڑ ان کے خیالات سے متفق نہیں ہو سکے کیونکہ وہ اپنی ذات کے لئے صلہ اور جزا پر ایمان نہیں رکھتے۔اسی بات کو قمر جمالی آگے بڑھاتے ہوئے فن اور فنکار کے شخصی خدمات کے متعلق جو ایقان رکھتی ہیں اس کو وہ دلنشیں پیرائے میں بیان کیا ہے۔ملاحظہ کریں۔

> ''میرا ایقان ہے کہ کسی فنکار کو فن یا اس کی شخصی خدمات کا اعتراف اس کی اپنی
> زندگی میں ہو تو وہ اعتراف اتنا ہی افضل ہوگا جتنی جوانی کی عبادت۔'' (۵۳)

قمر جمالی زیرِ نظر مضمون میں بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ بہادر شاہ ظفر ایوارڈ جو غالباً پچیس ہزار (25000) روپۓ نقد، ایک شال اور ایک توصیف نامہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں قمر جمالی بالخصوص اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اردو ادب کی خدمات میں شمالی ہند کے مقالے شہر حیدر آباد کے رہنے والے مسابقتی دوڑ میں آج تک پیچھے گردانے جاتے ہیں۔مگر مصنفہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ بالخصوص وہ راج بہادر گوڑ صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ گوڑ صاحب شہر حیدر آباد سے تعلق رکھنے

والوں میں سے ہیں اورانہوں نے آج یہ کر دکھایا ہے کہ دکن کے ادیب دانشور اپنا سر اونچا کرتے ہوئے فخر محسوس کر سکتے ہیں۔ بلکہ شمالی ہند کے مقابلے دکن کے دانشوروں نے بھی اردو ادب کے فروغ میں جو خدمات انجام دیں ہیں انہیں کونظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ آج راج بہادر گوڑ صاحب نے اس تادیبی امتیاز کو یکسر مٹادیا ہے اس لئے انہیں اس رسم امتیاز شکن کے محرک اول کے طور پر بھی جانے جاسکتے ہیں مزید انہوں نے اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے شمالی ہند کے نظریات وروایات کا اظہار کیا ہے جو اہل دکن کے خلاف روا رکھے گئے۔اس حقیقت کا اظہار وہ پر شکوہ لہجہ میں بیان کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

''یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا راز ہے جو کھلے عام سب پر عیاں ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے اس زیادتی کا اظہار کسی نے اونچی آواز میں نہ کیا ہو۔تاریخ گواہ ہے کہ شاہانِ زماں نے بھی اسی روایات کو برقرار رکھا اور جب بھی آسمانِ دکن کی پیشانی پر کسی ستارے کو چمکتا ہوا محسوس کیا کہ شمال سے کسی اور کو لاکر داغ دیا گیا۔ یہ تو بس ایک ایسی حقیقت ہے جس کے آشکار کرنے میں تکلف ہوتا تو برداشت کرنے میں تکلیف۔''
(۵۴)

قمر جمالی نے اس مضمون میں ڈاکٹر گوڑ صاحب کو دکن کا نمائندہ قرار دیتے ہوئے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو دلچسپ انداز میں بیان کرتی ہوئی گوڑ صاحب اردو زبان سے جو بے پناہ محبت ہے اس کا اظہار کرتی ہیں اور ساتھ ہی ان کی ولادت تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت پر لکھتے وقت ان کی حلیہ نگاری بھی کی ہے راج بہادر گوڑ کا حلیہ پیش کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی جادو وجگاتی اوصاف ستھری، مشفق شخصیت مگر کبھی دوٹک اور روکھی پھیکی بھی جب بات حق اور انصاف پر اتر آتی ہے سامنے والے کو یوں موہ لیتی ہے کہ گھنٹوں ساتھ رہ کے نکل آ ؤ تب بھی دامن دل کا کنارہ وہیں کہیں اٹکا رہ جاتا ہے اور یادوں کے کنج سے نکلے ایک ہلکے سے ہوا کے جھونکے سے کھینچنے لگتا ہے۔''(۵۵)

قمر جمالی اردو سے راج بہادر گوڑ کا رشتہ محبوبانہ قرار دیتے ہوئے گوڑ صاحب کا مزاج اوران کی بلند کرداری کے ایک پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''میں نے تو اکثر ایسا دیکھا ہے کہ کسی نے کتاب نذر کی کہ دو گھنٹوں کے اندر اندر کتاب

ختم بھی ہو جاتی ہے اور اس کی ضروری حواشی بھی ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی زیر تبصرہ کتاب کے خالق کو یا تو فون پر اطلاع دی جاتی ہے یا پھر خط لکھ کر مطمئن کیا جاتا ہے کہ جنگی نقشہ تیار ہو گیا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا اپنا مزاج ہے جسے ہم ان کی بلند کرداری کا ایک پہلو تصور کر سکتے ہیں۔'' (۵۶)

قمر جمالی کے گوڑ صاحب سے شخصی مراسم رہے ہیں ان کی شخصیت سے وہ مکمل واقفیت رکھتی ہیں۔ ان کی شخصیت میں محبت وشفقت کے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی ملنساری پر روشنی ڈالتے ہوئے ظفر ایوارڈ ملنے پر راج بہادر گوڑ صاحب سے ملاقات اور ملاقات سے ابھرنے والے تاثرات اخلاص وحمیت اور اپنائیت کی تعریف ایک واقع کے حوالے سے پیش کیا ہے چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

''جب میں ان کے گھر گئی وہ اپنے کامریڈس میں گھرے ہوئے تھے۔ کچھ وقت مجھے بھی دیا۔ پوچھا پتہ ہے یہ انعام کیا ہے؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ خود ہی بتانے لگے کہ پچیس ہزار روپئے نقد۔ انہوں نے پچیس ہزار پر زور دے کر کہا تو مجھے حیرت ہوئی کہ جس نے ساری عمر جد و جہد کی ان کے لئے یہ کوئی گراں قدر صلہ تو نہیں۔ میرے دل میں خیال آیا ہی تھا کہ انہوں نے تاڑ لیا اور کہنے لگے۔ میں اس میں سے کچھ رقم اپنا فرض ادا کرنے کے لئے استعمال کروں گا اور باقی ضرورت مندوں کے لئے ہے۔ تجھے بھی کچھ ضرورت ہے تو بتانا۔ انہوں نے ضرورت پر زور دے کر اس طرح کہا کہ جیسے لفظ ضرورت کا مفہوم سمجھا رہے ہوں۔ میں حیرت سے بت بنی کھڑی رہی۔ جس آدمی کے لئے کبھی کبھی دس روپئے بھی رقم ہے اگر وہ یہ کہے کہ اتنی بڑی رقم کی مجھے کیا ضرورت! تو قناعت صبر و رضا کی اس حد تک پہنچ کر انسان مومن، مسلمان، مجاہد...... یا پھر صرف مرد پتہ نہیں کن کن ناموں سے پکارا جاتا ہے۔'' (۵۷)

بالآخر قمر جمالی نے راج بہادر گوڑ صاحب کے مردِ مومن، مسلمان ان مجاہد کے ناموں سے یاد کرتے ہوئے ان کے متعلق اقبالؔ کے ایک شعر کی مثال دیتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ قمر جمالی کی نظر میں راج بہادر گوڑ صاحب ان آزاد لوگوں میں سے ہیں جن میں سے چنگاری کو لے کر زمانہ سورج بنا دیتا ہے۔ وہ دیکھنے میں سر د سامان

اور نا چیز سے ہوتے ہیں مگر عشق الہٰی کی حرارت سے ان کی چنگاری آفتاب کی حرارت پیدا کر لیتی ہے یعنی کچھ سامان ظاہری نہ رکھتے ہوئے بھی وہ سب کچھ رکھتے ہیں۔ زمانے اور اشیائے زمانہ ان کے تابع ہوتی ہیں۔ بالآخر مصنفہ نے مضمون کا اختتام ان الفاظ میں کیا ہے کہ سچ تو یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند۔ نئی دہلی نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب کے نام بہادر شاہ ظفر ایوارڈ برائے سال ۱۹۹۵ء کا اعلان کر کے ان پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ انجمن نے اپنی آبرو بڑھالی ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: ایک شخصیت منشورِ مثلثی:

قمر جمالی نے ایک مضمون ''ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: ایک شخصیت منشور مثلثی'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ مضمون ۲۶ ر جون ۱۹۹۱ء کو لکھا گیا۔ سہ ماہی اردو ادب، شمارہ ستمبر راج برائے سال ۱۹۹۳ء، انجمن ترقی اردو ہند دہلی سے شائع ہوا۔ زیر نظر مضمون میں دکن کی تہذیب و تاریخ اور راج بہادر گوڑ کی شخصیت و خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شہر حیدر آباد بھارت کی ریاست تلنگانہ کا دارالحکومت اور صوبہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ شہر حیدر آباد اپنی بیش بہا خصوصیت کی بناء پر ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔ ابتداء ہی سے یہ شہر اپنی منفرد زبانوں، تہذیبوں، تمدنوں اور ثقافتوں کا مرکز بنا رہا۔ مختلف تہذیبوں کا سنگم کہلائے جانے والا یہ شہر کبھی اپنے ہیرے جواہرات کی وجہ سے مشہور رہے۔ تاہم اسے موتیوں کے شہر کے خطاب بھی حاصل ہے۔ قمر جمالی اس مضمون کی ابتداء میں دکن کی تہذیب کو پُر اسلوب انداز میں بیان کرتے ہوئے شہر حیدر آباد، فرخندہ بنیاد کی امین گنگا و جمنی تہذیب کی تاریخ مرتب کرنے والوں میں بیسویں صدی اوائل کے چند مشہور و معروف دانشور، ادیب شاعر، سخن ور، سخن فہمیوں کے نام گنوائے ہیں جن میں راج بہادر گوڈ اہم ہیں اسی کڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے قمر جمالی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو ارضِ دکن کی گنگا و جمنی تہذیب کا نمک کا کنکر کے نام سے منسوب کرتے ہوئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے دکن کی تہذیب و تاریخ میں جو حصہ ادا کیا ہے جس کا تعارف کرواتے ہوئے گوڑ صاحب کی شخصیت کی اہم خصوصیات کی بناء پر انہیں منشور مثلثی کے لقب سے یاد کیا ہے۔ لہٰذا قمر جمالی راج بہادر گوڑ صاحب کی شخصیت و سراپا بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی قد آور شخصیت اسم با مسمیٰ ہے اونچا قد، تیکھے نقوش، چھریرہ بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، قید و بند کی صعوبتیں سہنے کے باوجود چہرے

کی وہ بے داغ رنگت ،سفید کرتا یا پاجامہ یا پھر شیروانی اور ہاتھ میں آبنوسی
چھڑی میں ان کی شخصیت بڑی جاذب نظر معلوم ہوتی ہے۔ادبی جائزہ کے
پبلشر جناب بشیر احمد صاحب انہیں جادو جگاتی شخصیت کہا تو مجھے لگا کہ ڈاکٹر
گوڑ کے سراپا کو سراہنے کے لئے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی ترکیب نہیں
ہوسکتی۔''(۵۸)

اردو کے ایک بے باک ترجمان جنہوں نے اپنے کئی تقاریر میں اردو کو اردو کی بقاکے فروغ کے لئے آگاہ کرتے رہے اور خود بھی اس کی بقاوفروغ کے لئے ممکن کوششیں کیں اور جنوبی بھارت میں اردو زبان کو فروغ دینے کے لئے ہر وہ اقدامات کرتے رہے اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی تحریک کو ادب سے تعلق رکھنے والے ہر انسان کو آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے جو انہوں نے اردو کو بقاوفروغ کے لئے چلائے اور اردو داں دانشوروں سے اردو کی بقاوفروغ کے لئے ان سے اپیل کرتے ہوئے انہوں نے اپنے آخری دنوں میں اردو تعلیمی ٹرسٹ کو تین لاکھ روپئے کا عطیہ دے کر اردو کی بقاوفروغ کے لئے اپنا آخری پیغام بھی دیا ہے۔

الغرض قمر جمالی راج بہادر گوڑ صاحب کی شخصیت کے پہلوؤں کا ذکر دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہوئے گوڑ صاحب کا اردو زبان اور دکنی تہذیب سے جو لگاؤ ومحبت ہے اور اردو زبان وادب کا حقوق کی بحالی کے لئے جو خدمات انجام دیں ہیں اس کا جائزہ پیش کیا ہے جس کے مطالعے کے بعد راج بہادر گوڑ کی سیرت عادات واطوار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

''اردو زبان اور دکنی تہذیب سے ڈاکٹر گوڑ کا رشتہ مادری یا پدری ہو کہ نہ ہو
عاشقانہ ضرور ہے کیوں کہ بسا اوقات جب بھی چلے جائیں آپ انہیں اپنی
محبوبہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر پائیں گے خواہ وہ کسی ادیب پر مضمون لکھ
رہے ہوں کہ کسی کتاب پر تنقیدی مقالہ، کسی مزدور مسئلہ کی سوزن گری ہو کہ
انتظامیہ کے خلاف رپورٹ حتی کہ تفریح طبع کے لئے بھی فیضؔ، حسرتؔ، کیفیؔ،
مخدومؔ یا پھر غالب کی کشیدہ شراب دوآتشہ کو گھونٹ در گھونٹ نہیں بلکہ قدح
در قدح پی رہے ہوتے ہیں اردو ضرورت، اردو تفریح، اردو کھانا اردو پینا اور

یہاں تک کہ اوڑھنا بچھونا بھی۔ اردو سے والہانہ عشق کا نتیجہ ہے کہ موجودہ نظام میں اردو کے ساتھ جو انصافی کی جارہی ہے اسے وہ محض محسوس کرکے چپ نہیں رہ سکے بلکہ انجام وعواقب کی پرواہ کئے بغیر انہوں نے اردو کے حقوق کی بحالی کے لئے ہمیشہ اپنی آواز اونچی رکھی اور بحیثیت رکن گجرال کمیشن اردو کو اس کا جائز حق دلانے کی حتی المقدور کوشش کی۔''(۵۹)

اس لئے بھارت کے ہر شہری کو چاہئے کہ اردو کی بقاء وفروغ کے لئے اپنے حصے کی ذمہ داری کو نبھانا چاہئے کیونکہ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ یہ بھارت کی گنگا وجمنی ثقافت وتہذیب جو بھارت کے تمام شہری کو آپس میں جوڑے رکھنے، امن وامان کو برقرار رکھنے کا کام کرتی ہے اور بھارت کی ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ جیسا کہ راج بہادر گوڑ ایک ایسی گراں قدر شخصیت ہے جو تا حیات اردو ہال انجمن ترقی اردو اور اس سے وابستہ اداروں کی خدمت کی۔ اردو گوڑ صاحب کی مادری زبان تھی اور معشوق دلنواز بھی۔

اردو زبان کی ناز برداریاں ڈاکٹر گوڑ کو زندہ رہنے کا ایک خوبصورت بہانہ بھی تھی۔ گوڑ صاحب کو اردو سے جو والہانہ عشق ہے جس کی قمر جمالی نے انگریزی کے ایک مشہور محقق جانسن کی مثال پیش کرتے ہوئے راج بہادر گوڑ کو ایک آبشار سے تعبیر کیا ہے۔ قمر جمالی ایک مضمون ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور بہادر شاہ ظفر ۱۹۹۵ء طبع شدہ روزنامہ سیاست مورخہ یکم اپریل ۱۹۹۱ء کا ایک فقرہ کو دہرایا ہے۔ جس کے متعلق وہ لکھتی ہیں:

''جس طرح انگریزی کے مشہور محقق ودانشور ڈاکٹر جانسن کو ان کی میلی کچلی کنٹوپ اور کھلے گریبان کے ہاؤس کوٹ میں ملبوس، کتابوں کی انبار کے پیچھے دبکے بیٹھے رہنے کی وجہ سے انہیں A lion in the den کہا گیا تھا، اسی طرح آگے پیچھے دائیں بائیں گھومنے والی کرسی پر کتابوں کی انبار کے پیچھے دبکے بیٹھے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو ہم ایک ایسے آبشار سے تعبیر کرسکتے ہیں جو نہایت اونچائی سے گر رہا ہے اور زمین پر قدِ آدم تک اطراف میں اپنی ٹھنڈک بکھیر رہا ہے۔''(۶۰)

قمر جمالی گوڑ صاحب کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے زبان وبیان کی شگفتگی وبزلہ سنجی ،ان کے مضامین کی خصوصیات اور ان کے طرز تحریر کے متعلق گوڑ صاحب کا ہی ایک مضمون ''جیلانی بانو کی کہانیاں

میرے تاثرات'' کے ذریعے بیان کرتی ہیں ملاحظہ کیجئے:

''یہ ممکن تھا کہ جیلانی بانو نے اپنی نانی سے کہانی سن کر یہ تسلیم کرلیا ہو کے راون کے دس سر تھے اور وہ سیتا کو اڑن کھٹولے پر اڑا لے گیا تھا، لیکن یہی کہانی جیلانی کی زبانی ان کی نواسی سنے گی تو بول اٹھے گی............گپ مت مارو نانی جان! کہیں کسی کے دس سر بھی ہوئے ہیں جیلانی بانو کی نانی نے جس فضا میں آنکھ کھولی تھی، اس وقت انسانی معلومات کا جو اوسط معیار تھا۔ ماحول جن مسائل سے پٹا پڑا تھا اور جن آرزؤں کے سہارے انسانوں کا کارواں اس وقت بڑھ رہا تھا۔ یہ سب جیلانی بانو کی نواسیوں کے لئے اجنبی قدریں ہوگی ۔اس وقت نئے مسائل ہوں گے، نئے معیار ہوں گے، نئی آرزوئیں، نئی امیدیں ہوں گی، جن سے کہانی اپنا مواد، اپنا کس بل حاصل کرے گی۔''(۶۱)

الغرض اس مضمون کا مطالعے کے بعد راج بہادر گوڑ صاحب کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی ۔جس سے قمر جمالی کی علمی بصریت وتحقیقی نظر کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور وہ گوڑ صاحب پر تحقیق وتنقیدی روشنی ڈالتے ہوئے غیر جانب داری سے کام لیا ہے۔

مردِ آہن ۔ڈاکٹر راج بہادر گوڑ:

قمر جمالی نے ایک مضمون ''مردِ آہن ۔ڈاکٹر راج بہادر گوڑ'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے ۔ یہ مضمون ۱۲/ مارچ ۲۰۱۰ء کو تخلیق کیا گیا ہے جو در کتاب ''مجاہد اردو راج بہادر گوڑ، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم کے زیر اہتمام ۲۰۱۰ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ، غالب مارگ دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ قومی زبان اردو اکادمی تلنگانہ سے جولائی ۲۰۲۱ء میں شائع ہوا ہے ۔زیرنظر مضمون میں قمر جمالی نے راج بہادر گوڑ کی شخصیت حالاتِ زندگی اور ان کی ادبی سیاسی وسماجی پر روشنی ڈالی ہے۔

مضمون کی ابتداء میں قمر جمالی نے مسلمانوں کی عظمت ورفعت اور مقام ومرتبہ کا اظہار کرتی ہیں کہ

ہندوستان پر مسلمانوں نے صرف زمینوں پر ہی نہیں بلکہ دلوں پر بھی حکمرانی کی ہے اور ہم ہندوستان میں بس کر ہندوستانی ہو گئے اگر ہم سے کہا جائے کہ واپس لوٹ جاؤ تو جائیں گے کہاں اور جائیں بھی کیوں؟ ہندوستان میں جینے کا حق مسلمانوں کو بھی ہے یہ سوال موجودہ حکمران سے احتجاج کرتی نظر آتی ہیں۔ بعدازاں انہوں نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے اپنے ذاتی مراسم کا ذکر کرتے ہوئے ان سے کی گئی ایک ملاقات کے واقعہ کا ذکر کیا ہے جو کہ مکالماتی انداز میں ہے جس میں اس بات پر زور دی گئی کہ خدا کو اس کے مخصوص طبقے تک محدود کرنا کس حد تک ٹھیک ہے اس مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہوئے قمر جمالی نے راج بہادر گوڑ کی شخصیت کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ وہ یوں رقم طراز ہیں:

''یہ ہمارا اور راج انکل کا شخصی رشتہ ہے، ان کے ادبی، سیاسی یا ٹریڈ یونین ازم کے کسی بھی رشتے سے الگ، بلند و ماوریٰ،

ابھی ہم سنبھل کر بیٹھے بھی نہ تھے کہ انہوں نے پوچھا۔

''اچھا یہ بتا تو 'اللہ حافظ، والی ہے یا 'خدا حافظ' والی۔''

''دونوں میں کیا فرق ہے انکل؟ ہم نے پوچھا۔

''تب ہی تو کہہ رہا ہوں۔ جب کوئی فرق نہیں ہے تو خدا کو مخصوص طبقے تک محدود کیوں کرتے ہو! خدا رب العالمین ہے۔ رب المسلمین نہیں۔''

''جی انکل''

اس میں انکار کی گنجائش کہاں تھی

''آج پارلیمنٹ میں 'اقلیت' پر بات ہو رہی ہے۔ ہندو پورے ایودھیا شہر کو مندر بنانے کی فکر میں ہیں۔ ہندو ہندوؤں کے مفاد پر اور مسلمان، مسلمانوں کے مفاد پر بات کر رہے ہیں''

پھر۔ میں کہاں جاؤں!!

میں نہ ہندو ہوں اور نہ مسلمان۔

میں کیا کروں، کس سے بات کروں!!!

ہم گم صم کھڑے ایک ٹک راج انکل کے مشفق چہرے کو دیکھ رہے تھے جس پر
محبت اور شفقت کا ایک والہانہ سمندر موجزن تھا۔ حادثہ میں ایک آنکھ کھودینے
کے باوجود ان کا چہرہ اتنا ہی خوبصورت بلکہ اور زیادہ پرنور ہو گیا تھا۔
''چہرہ شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔''
ہم سوچ رہے تھے کہ جس شخص کا چہرہ اتنا پرنور، آواز میں اتنا یقین اور اظہار
میں اتنی محبت ہے وہ شخص صرف ہندو۔
یا پھر مسلمان کیسے ہوسکتا ہے۔''(۶۲)

۱۹۴۰ء سے گوڑ صاحب ٹریڈ یونین ازم سے وابستہ رہے مگر حیدر آباد میں ٹریڈ یونین کانگریس کے داغ بیل این ایم جوشی کے ہاتھوں، ۱۶/اگست ۱۹۴۶ء کے جھرہ کمپاؤند میں سکندرآباد میں پڑی تو مخدوم محی الدین کو صدر اور راج بہادر گوڑ صاحب کو معتمد عمومی مقرر کیا گیا۔ الغرض ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب اپنی سیاسی زندگی میں جن ٹریڈ یونین سے وابستہ رہ کر جو خدمات انجام دیں ہیں جس کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر گوڑ انتظامیہ کے دانشوروں سے جو رویہ اختیار کیا تھا جس کی بدولت ٹریڈ یونین قائدین کی طرف سے انہیں ٹریڈ یونین تحریک کے ''بھیشم پتاما' کے لقب سے نوازا گیا جس کو وہ مختلف دلائل کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے تلنگانہ کے مسلح جدوجہد کے سلسلے میں انہیں ایک منفرد شخصیت و کردار قرار دیتے ہوئے مختلف آراونظریات کے خیالات کو پیش کیا ہے جس کے متعلق جناب سید محمود حامد صاحب کا نظریہ پیش کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''ہندوستان کو جہد بسیار کے بعد آزادی تو مل گئی لیکن اسے بھرپور بنانا، اسے منصفانہ رخ دینا، اس کے تحت ذرائع وشمار پیداوار کا عاجلانہ ڈھنگ سے تقسیم کرنا، یہ سب کچھ باقی تھا اور اس میں بہت کچھ اب بھی باقی ہے۔ راج بہادر ان بے تاب ارواح میں سے ہیں جو سفر سے جی لگاتی ہیں اور منزل سے نہیں گھبراتی ہیں۔ انہیں ایک لمحہ بھی اس میں شک نہیں ہوا کہ آزادی مقصد نہیں ذریعہ ہے۔ ذریعہ سماجی اور معاشی انصافیوں، سماجی نابرابریوں کو دور کرنے کا چنانچہ انہوں نے ٹھان لی کہ سرمایہ داروں کے ہاتھوں سماج کے ساتھ جو

زیادتیاں ہورہی ہیں ان پر روک لگائیں گے۔ جدید صنعت نے دست دولت
آفرین کو جس طرح کچلا اور کچل رہی ہے۔ راج بہادر نے اس کے خلاف
جہاد کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔''(۶۳)

مختصراً کہ قمر جمالی نے ڈاکٹر راج بہادر کی شخصیت، سیاسی وسماجی خدمات پر جو تین مضامین تحریر کئے ہیں جس کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ یادوں کا خزانہ بڑھتا رہتا ہے اوران یادوں کے درمیان اپنے وجود پر بھی کچھ اعتبار بڑھنے لگتا ہے۔ بالخصوص وہ یادیں جو ایسے لوگوں کے تعلق سے زندہ رہتی ہیں جنہوں نے اپنے عہد میں اپنے ملک، اپنی تہذیب اور اپنی دنیا کو بدلنے کی تمنا میں جان کی بازی لگادی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بھی انہیں شخصیتوں میں سے ایک اہم شخصیت ہیں۔ ایک باعمل دانشور اور عوامی جدوجہد کے ایک دلیر رہنما کے شب وروز کی سرگرمیوں کے تحت حیدرآباد دکن میں آزادی کے بعد اردو تحریک کو نہ صرف زندہ رکھنے کی کوشش کی بلکہ اس کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا رکھنے کی بھی کوشش کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے آزادی کو مقصد نہیں بلکہ اس کو اپنا ذریعہ بنالیا تھا اس سلسلے میں مزدوروں، کسانوں، طالب علموں، ادیبوں کو متحرک کرنے کا کام میں بھی وہ مصروف تھے اور تلنگانہ میں انقلاب اور انقلابی حکومت کے قیام کی جدوجہد ہر چند کہ ہنگامی تھی مگر وہ اس دور کی مسلح بغاوت کے سربراہ گوڑ صاحب کے ساتھ ساتھ مخدوم محی الدین کا نام آنا بھی لازم ہے۔ کیونکہ وہ دونوں اپنے عہد کے سپہ سالار تھے جو کچھ اس راہ میں انہوں نے جھیلا وہ آزادی کے یادگار دنوں کی یاد دلاتا ہے۔ قمر جمالی نے زیر نظر مضمون میں راج بہادر گوڑ صاحب اور مخدوم محی الدین کی دوستی ومحبت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مکمل مضمون کے مطالعے کے بعد اس بات کا علم ہوتا ہے کہ راج بہادر گوڑ صاحب کو اپنی ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کے بعد اگر وہ کسی سے جی جان سے محبت کرتے ہیں تو وہ مخدوم صاحب ہی ہیں اور مخدوم سے دوستی اور محبت کا حق انہوں نے خوب نبھایا بھی ہے کیوں کہ آپ نے تینوں مضامین کے مجموعوں میں کل پانچ مضامین مخدوم محی الدین سے دوستی کے متعلق لکھئے گئے ہیں۔ ان کا تیسرا مجموعہ ''ادبی تناظر'' میں مخدوم سے ان کے جذباتی لگاؤ کا وہ خود اپنے ایک مضمون میں اعتراف بھی کیا ہے جس پر قمر جمالی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''مخدوم سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی اور کن حالات میں ہوئی تھی، یہ بتانا
مشکل ہے۔ مخدوم ہماری زندگی میں کچھ اس طرح بس گئے تھے کہ یہ یاد ہی

نہیں آتا کہ ان کے بغیر بھی زندگی گزری۔ مخدوم کیا تھے؟ یوں لگتا تھا مقناطیس
کی ایک لاٹ کھڑی ہے۔بس کشش ہی کشش ہمہ تن کشش۔''(۶۴)

مزید انہوں نے مخدوم محی الدین کی سیاسی اور شاعرانہ شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔عوام کی انقلابی جدوجہد میں شرکت انہیں مردِ آہن بنا دیتی ہے مگر علیحدگی میں انسان کی غریبی، غلامی ان کے دکھ درد کے بارے میں سوچ کر ان کا دل مردِ آہن سے موم بن جاتا ہے۔جس کو انہوں نے مخدوم کی شاعری کا مرکزی خیال قرار دیا ہے اور وہ قلم کو تلوار اور تلوار کو قلم میں تبدیل کر دینے کے ہنر سے واقف ہیں۔اس لئے ان کے ہاں انقلابی مزدور تحریک کی مصروفیتیں اور شعری تخلیق کی خلوتیں ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے کے شریک نظر آتے ہیں۔جس بنا پر مخدوم کی سیاسی اور شاعرانہ شخصیت کو تقسیم کیا جا سکتا ہے۔لہٰذا مصنفہ نے یہ باور کرنے کی کوشش کی ہے کہ تلنگانہ جدوجہد کے سلسلے میں راج بہادر گوڑ صاحب جس آئیڈیل ازم کے ساتھ اس کام میں مصروف تھے اسی طرح مخدوم محی الدین صاحب بھی ان کے ساتھ ساتھ رہے جس کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔

قمر جمالی نے بالآخر فیض احمد فیض کے ایک شعر کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی زندگی ایک طرف مجاہد کی زندگی تھی اگرچہ آلام و مصائب دل پر ہزار گزری ہوں مگر دوسری طرف ان کی شریک حیات محترمہ برج رانی گوڑ صاحبہ کا صبر و شکر، ہم خیال و ہم زبان، ہم سفر کا ساتھ اس قدر مطمئن کہ گوڑ صاحب نے ہمیشہ خوشحالی کی زندگی گزاری ہے۔بعد ازاں برج رانی، ایک طویل مدت کے بعد راج بہادر گوڑ کو داغِ مفارقت دے گئیں۔

بالآخر وہ مضمون کا اختتام غالب کے ایک شعر کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس مضمون کا اختتام یہی ختم کرتی ہوں ورنہ بیاض ختم ہو جائیں گے۔لیکن ان کی مدح مکمل نہیں ہوگی۔لہٰذا اس قصہ ناتمام کو یہیں ختم کر دیتی ہیں۔غرض ان تینوں مضامین میں راج بہادر گوڑ کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرنے کی ہے اور گوڑ صاحب سے قمر جمالی کو جو عقیدت و محبت تھی اس کو پیش کرتے ہوئے گوڑ صاحب کے ادبی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ان تینوں مضامین کی سب سے بڑی تخصیص یہ ہے کہ قمر جمالی نے اپنے مخصوص لہجے کے ساتھ دکن کی تہذیب کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ہمیں قمر جمالی کو دکن کی تہذیب سے جو والہانہ محبت ہے اس کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

شخصیات

بلقیس علاء الدین۔ایک تعارف:

قمر جمالی نے ایک شخصی مضمون ''بلقیس علاء الدین۔ایک تعارف'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ مضمون ۱۸ردسمبر۱۹۹۷ء کو تخلیق کیا ہے مگر کسی اخبار ورسالے میں شائع نہیں کیا گیا۔ چونکہ قمر جمالی نے زیر نظر مضمون کو کتاب ''نواحِ ادب'' میں شامل کیا ہے۔ جو۲۰۱۶ء میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔قمر جمالی اس مضمون کا آغاز دلچسپ جملوں میں دُنیا کی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے دنیا میں آنے والی چند ایسی ہستیوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جنہوں نے وقت کے صحیفے پر اپنا نام درج کرنے کی دوش میں ساری زندگی لگا دیتے ہیں۔ مصنفہ بلقیس علاء الدین کو ایک ایسی ہی معتبر شخصیت مانتی ہے۔ان کا خیال ہے کہ لوگ عموماً کتابوں میں زندہ رہنے کی فکر میں ایک عمر لگا دیتے ہیں لیکن بلقیس علاء الدین ایک ایسی منفرد کردار ہے کہ انہوں نے تہذیب کی راہ خصوصاً حیدرآبادی تہذیب کی راہ اختیار کرتے ہوئے وہ حیدرآباد میں ایک دلہن کے روپ میں داخل ہوئیں۔گو کہ بلقیس علاء الدین کو حیدرآباد کی تہذیب سے جو والہانہ محبت ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے ان کا تعارف، ولادت، تعلیم وتربیت، ادبی سفر وتصانیف کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور شادی، علمی فتوحات، اعزازات وغیرہ کا ذکر آسان اور پُر اثر زبان میں بیان کیا ہے۔قمر جمالی بلقیس علاء الدین کا تعارف پیش کرتے ہوئے اوران کی شخصیت کے ایک اہم پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''ڈاکٹر بلقیس علاء الدین انگریزی کی ممتاز و مسلمہ شاعرہ، ادیب اور ڈرامہ نگار ہیں۔بمبئی میں پیدا ہوئیں، وہیں تعلیمی مدارج طے کئے۔طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر کہتی رہیں اور ڈرامہ نگاری سے شغف رہا۔کمسنی میں اپنے بھائی کے ہمراہ اداکاری بھی کیں۔لہٰذا کوئٹہ کے زلزے کی تباہی سے متاثر ہوکر بمبئی کے اوپیرا ہاؤز میں اسٹیج اداکاری کے ذریعہ روپیہ اکٹھا کیا اور بدنصیب متاثرین کی مدد کی۔''(۶۵)

بلقیس علاء الدین کو دکن کی تہذیب بالخصوص قلعہ گولکنڈہ کی مسحور کن کشش نے انہیں اپنا گرویدہ بنالیا اور

انھوں نے سلاطین حیدرآباد پر باقاعدہ تحقیق شروع کی اور حیدرآباد کی ڈرامہ نگاری میں بلقیس علاء الدین کی ڈرامہ نگاری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔لہٰذا ڈرامہ نگاری کے میدان میں انھوں نے جو خدمات انجام دیں اس کے متعلق وہ لکھتی ہیں:

''قطب شاہی بیگمات اور ویمنس کالج ،ان کا پسندیدہ موضوع رہا۔حیدرآباد کے ریذیڈنٹ کیپٹن کرک پیٹرک اور خیر النساء کے مشق کی داستان کو ڈرامے کی صورت میں قلمبند کیا اور ۱۹۷۷ء میں ویمنس کالج کے دربار ہال میں پیش کیا۔قلعہ گولکنڈہ سے دلچسپی نے انھیں چین سے بیٹھنے نہ دیا۔شوق دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا اور آخر کار ۱۹۷۰ء میں سیاحوں کی خاطر قطب شاہی دور کی جھلکیوں پر منحصر ایک پروگرام پیش کیا۔۱۹۷۵ء میں اس پروگرام کو روشنی اور آواز (Light and Sound) کے نام سے قلعہ کے اندر پیش کر کے قلعے کے ویران دربار کو روشنی کا پیرہن اور سناٹوں کو زبان عطا کی ۔۱۹۹۳ء میں اسکاٹ لینڈ میں 'گلاسگو' کے اسٹیج پر جب حیدرآبادی بیگم خیر النساء اور کیپٹن کرک پیٹرک کی داستان عشق پیش کی گئی تو لوگوں نے دانت میں انگلی پکڑ لی۔یہ ڈرامہ بے حد مقبول ہوا اور اس کے کئی شوز پیش کئے گئے۔حیدرآباد کے چار سو سالہ جشن کے موقع پر انھوں نے پہلی صاحب دیوان شاعرہ مہ لقا بائی چندا کی زندگی پر مبنی ڈرامہ رویندر بھارتی تھیٹر میں پیش کیا۔''(۶۶)

مضمون نگار نے بلقیس علاء الدین کی علمی فتوحات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی مشہور کتاب For the love of begum پر Louizan University نے انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔اس کتاب کے سلسلے میں بلقیس نے جن شہروں کا سفر کیا ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک کے ادبی تنظیموں کے توسط سے ملے اعزازی و مذہبی رواداری کا ذکر کیا ہے۔بعد ازاں بلقیس علاء الدین کو اردو زبان سے جو بے انتہا پیار ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے بلقیس علاء الدین حیدرآباد کے کئی سماجی اور ثقافتی اداروں سے وابستہ ہو کر جو خدمات انجام دیں ہیں اس کے متعلق وہ نہایت ہی اختصار سے کام لیتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں:

''بلقیس نے انگریزی میں بچوں کے لئے کئی کتابیں لکھیں جو ڈرامے، نظموں اور کہانیوں پر مبنی ہیں۔ بچوں کے لئے حضرت محمدؐ کی زندگی کے حالات، مہابھارت اور رامائن کے واقعات قلم بند کئے۔بلقیس علاء الدین کو اردو زبان سے بے انتہا پیار ہے۔مگر انہیں اس پیاری زبان پر عبور حاصل نہیں ہے۔ پھر بھی انہوں نے ڈاکٹر بانو طاہرہ سعیدہ کی مدد سے اردو کی غزلوں اور نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور انگریزی کے بین الاقوامی ماہنامہ The Poet میں شائع کروایا اس کے علاوہ بلقیس صاحبہ حیدرآباد کے کئی ایک سماجی اور ثقافتی اداروں سے منسلک ہیں اور حیدرآبادیوں کی خدمت کر رہی ہیں۔'' (٦٧)

ڈاکٹر عینی حسن ....سادگی، ذہانت اور اخلاص کا پیکر:

صدر شعبہ جینٹکس اینڈ مولیکیولر میڈیسن کامنینی ہاسٹل، ایل بی نگر اور پروفیسر آف جینٹکس کامنینی میڈیکل کالج، نارکٹ پلی۔

قمر جمالی کا ایک شخصی مضمون ''ڈاکٹر عینی حسن۔سادگی ذہانت اور اخلاص کا پیکر'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ۲۲؍جنوری ۲۰۱۱ء کو لکھا گیا مگر کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہونے کی تفصیلات دستیاب نہیں ہوئی البتہ اس مضمون کو قمر جمالی نے مضامین کا مجموعہ نواحِ ادب ۲۰۱۶ء جو دہلی سے شائع ہوا ہے جس میں شامل کیا گیا ہے۔اس مضمون کے ابتداء میں انہوں نے اپنے عالمانہ خیالات کا اظہار اتنے پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے کہ جس کے مطالعے کے بعد قاری نہ صرف نصیحت حاصل کرتا ہے بلکہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ ایک انسان میں ایسے وہ کون سے اوصاف کا موجود ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے کسی بھی انسان کی شخصیت کو ''اشراف'' کے زمرے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ان خوبیوں کا ذکر قمر جمالی آسان عام فہم زبان و انداز کا استعمال کرتے ہوئے یوں رقم کرتی ہے:

''دنیا کا بہترین تحفہ جو ایک شخص اوروں کو دے سکتا ہے وہ اس کی اپنی عقل

وفراست، ہنر مندی اور ہمدردی کے ذریعے ان کی ضرورت کے وقت ان کی
مدد کرنا ہے۔"(۶۸)

مصنفہ کا خیال ہے کہ یہ تمام اوصاف ایک انسان کے اندر توارث کے ذریعے منتقل ہوتے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر عینی حسن کے والدین حیدر آباد کے ایک معزز طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ جناب تراب الحسن I.A.S اور ہندوستان کی نامور انشاء پرداز محترمہ نسیمہ تراب الحسن کی پہلی بیٹی رہی ہیں جس بناء پر ڈاکٹر عینی حسن نے بھی اپنے والدین سے نہ صرف صاف ستھری اور بے داغ فطرت پائی بلکہ لوگوں کی مدد کرنا، نرمی، شگفتگی اور اپنے علم و دانش سے اپنے ہم نفسوں کی مدد کرنے کا جذبہ بھی انہوں نے میراث میں پایا ہے۔ چونکہ قمر جمالی ڈاکٹر عینی حسن کو ان ہی اوصافِ حمیدہ سے متصف شخصیت قرار دیا ہے۔ مزید انہوں نے ڈاکٹر عینی حسن کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے عادات وخصائل اور ان کی شخصیت کی سیرت کے مخصوص ومنفرد پہلوؤں کا اظہار دلکش و دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ جس سے قمر جمالی کی جدت وندرت اور خوبی نظر آتی ہے۔ ملاحظہ کریں:

"عام محفلوں میں بالکل سیدھی سادھی ایک عام سی خاتون نہ اپنے علم کا رعب،
نہ دولت کا ٹھسہ اور نہ اپنے عالمی نسب ہونے کا زعم، مگر............ شخصیت میں
وہ دبنگ کے سامنے والا قریب جانے سے پہلے رک کر محاسبہ کر لے۔"(۶۹)

ایک اور مقام پر قمر جمالی نے عینی حسن کی شخصیت کے مختلف اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی خوبیوں کو بہت سلیقے کے ساتھ گنوائے ہیں اور ساتھ ہی ان کا حلیہ کا بیان نہایت ہی خوبصورت و دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے وہ لکھتی ہیں:

"کھڑا ناک نقشہ، گوری رنگت، جو ضرورت سے زیادہ محنت کم خوابی اور کم
راحت کی وجہ سے گندمی مائل ہوگیا ہے۔ سر میں کھچڑی بال، اونچا قد، متناسب
جثہ، چال میں تیزی کے ساتھ ٹھہراؤ............ اپنے گرد وپیش سے چوکنا
اور باخبر، بات کرنے میں پورا اعتماد اور دوسروں کی بات سنتے ہوئے
پورا انہاک جو سنانے والے کو پرسنل انوالومنٹ کی طمانیت دیتا ہے۔
پروفیشنل ایٹی ٹیوڈ Professional Attitude سے مبّرہ، مصیبت زدہ کی

غمخواراورایک ہمدردانسان............عینی حسن۔''(۷۰)

مزیدانہوں نے اس مضمون میں فقیہہ ابواللیث سمرقندی میں اخلاص کے تعلق سے ابوللیث سمرقندی نے بہت اچھی مثال دی ہے اس کا ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابواللیث سمرقندی اخلاص گڈریے سے سیکھنے کی بات کرتے ہیں تو جب کسی نے ان سے سوال کیا کہ حضرت وہ کیسے ، وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ جب گڈریا ،بکریوں اور بھیڑوں کے درمیان نماز پڑھتا ہے تو اس کو تھوڑا سا بھی یہ خیال اس کے ذہن میں نہیں آتا کہ بکریاں اور بھیڑیں جو ہیں اس کی عبادت کی تعریف کریں گی۔اس مثال سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ قمر جمالی نے بھی ڈاکٹر عینی حسن کو اپنے بستے میں ایسا مخلص پایا ہے۔آگے انہوں نے عینی حسن کی ولادت ،ابتدائی اوراعلیٰ تعلیم ،علمی فتوحات پر روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر عینی حسن کی عثمانیہ یونیورسٹی سے (B.S.C)بی۔ایس۔سی اورایم۔ایس۔سی جینٹکس کیا جس کے لئے انہیں ایوارڈس سے نوازا گیا۔ اس کے بعد جینٹکس میں ایکس کروموروس کا دوسرے Endogeneous Hormones کے ساتھ تماس کھانے پر پیدا ہونے والی سوئٹو جینٹکس Cytogenctic تبدیلیاں یعنی (X-cromosomes Reactivation and other cytogenetic Changes with varying endogenous Hormones جوایک انتہائی ادق موضوع پر6سال تک تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے وہ بالآخر 1989ء میں Ph.D کی ڈگری حاصل کی اس کے علاوہ ریسرچ کے دوران ڈاکٹر عینی حسن ہندوستان اور دیگر ممالک یونیورسٹی میں بالترتیب جونیئر اور سینئر ریسرچ فیلو رہی ہیں جس کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر عینی حسن نے نہایت ہی کم عمری میں جو ترقی منزلیں طے کیں ہیں ان کا شمار کرنا قمر جمالی نے اپنے لئے مشکل قرار دیا ہے۔

مزید اس مضمون میں ڈاکٹر عینی حسن کو مختلف موضوعات پر مختلف طبی مقالے اور جرنلس نیشنل اور انٹرنیشنل کانفرس اور سمینار میں پیش کرنے پر انہیں مختلف ایوارڈ سے نوازے جانے پر تفصیلی رشنی ڈالتے ہوئے ان کی نگرانی میں جو طالب علم مختلف موضوعات پر معروف تحقیقات رہیں ہیں اس کا بھی جائزہ لیا ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر عینی حسن کو کامینینی میڈیکل کالج کی پروفیسر نامزد کیا جانا ان کے لئے یہ ایک اوراعزاز کہا ہے۔ بعدازاں وہ ان کی ازدواجی زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس مضمون کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قمر جمالی ڈاکٹر عینی حسن کا پیشہ ان کی سماجی خدمات

اوران کی شخصیت سے بہت متاثر نظر آتی ہیں۔اور وہ Genetics کے موضوع کے متعلق ریسرچ کرنے اور مزید معلومات حاصل کرنے کی تجسس تھی ۔لہٰذا وہ ایک دن ڈاکٹر عینی حسن سے ملنے کے لئے مہاویر ہاسپٹل کے شعبہ جینٹکس پہنچتی ہیں۔دوران گفتگو قمر جمالی نے ڈاکٹر کو عینی حسن کے ساتھ تبادلہ خیال کرتے ہوئے دیکھ کرانہوں نے بھی عینی حسن سے سوال وجواب کا سلسلہ شروع کردیا۔ پہلا سوال جو قمر جمالی نے عینی حسن سے کرتے ہوئے کہا کہ آپ ڈاکٹریٹ کرنے تک ہمیشہ ٹاپر رہیں۔MBBS کرنے کی خواہش کیوں نہیں کی جس کے جواب میں آپ نے ریسرچ کو اپنا Passion بتایا ہے اور جب سلسلہ آگے بڑھتا ہے تو خدا نے انسان کو جس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اوراس پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستان میں اولادنرینہ کی پیدائش کو بڑی مبارک ومسعود مانے جانے اور جن عورتوں کے اولادنرینہ نہیں ہوئی سماج میں انہیں بُرا بھلا کہنے اسی طرح بانجھ عورت کوایک بددعا سے بھی زیادہ متصور کرنے مختصراً یہ کہ بانجھ عورت کے متعلق سماج میں پائی جانے والی برائیوں ونظریات کا اظہار کرتے ہوئے جن افعال کو درست کرنے سے بانجھ پن ختم کیا جاسکتا ہے ان سب کا ذکر کیا گیا ہے ۔ بالآخر جب سوال وجواب کا سلسلہ ختم ہوا تو ڈاکٹر عینی حسن نے قمر جمالی اور تمام ادبی تخلیق کاروں کو نہایت خندہ پیشانی سے ایک پیغام دیا ہے ۔جس کے سننے کے بعد وہ خدا کا شکرادا کرتے ہوئے ایسے نیک کاز کوآگے بڑھانے میں کوشش کرنے کی عزم کے ساتھ وہ وہاں سے نکل آتی ہیں چنانچہ ڈاکٹر عینی حسن نے قمر جمالی کو جو پیغام دیا ہے ان ہی کی زبانی ملاحظہ کریں:۔

> ’’آپ صرف افسانے لکھ کر یہ سمجھ لیتی ہیں کہ قلم کا حق ادا ہو گیا۔ان تمام معاملوں پر قلم اٹھانا بھی آپ کی اور آپ کی جماعت کی ذمہ داری ہے ۔ آپ قلم اٹھایئے ان موضوعات پر ادبی محفلوں میں صرف افسانے پڑھ کر غزل سن کر آہ واہ کرنے کے بجائے کچھ ایسی ہستیوں کو بلایئے جوان موضوعات پر معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔اگر دس میں سے ایک آدمی بھی ان کے لکچر پر عمل کر لے تو سمجھئے کہ آپ خدا کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ گئے۔‘‘(۱۷)

الغرض قمر جمالی نے اس مضمون میں ڈاکٹر عینی حسن کی سادگی ،ذہانت،اخلاص کے پیکروں پر روشنی ڈالتے ہوئے H.G کے موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے۔اس مضمون کا خاص وصف یہ ہے کہ مضمون نگار اور عینی حسن کے درمیان Human-Genetics کے موضوع پر سوال وجواب کا سلسلہ قاری کے معلومات میں مزید اضافہ کرتے

ہوئے قاری کے اندر دلچسپی کو برقرار رکھتی ہے۔

سرہنگِ دکن۔مخدوم:

مخدوم محی الدین کا نام ایک انقلابی اردو شاعر اور ایک سیاسی رہنما دونوں حیثیتوں سے ممتاز اور نمایاں ہے ۔مخدوم محی الدین کی شخصیت اور شاعری پر قمر جمالی نے ایک مضمون ''سرہنگ دکن مخدوم'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ مضمون ۱۸رفروری ۲۰۱۱ء کو لکھا گیا جو روز نامہ سیاست میں ۲۶رفروری ۲۰۱۱ء کو شائع ہوا۔قمر جمالی نے زیرِنظر مضمون کی ابتداء میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مخدوم محی الدین پر لکھنا گویا ان کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ چنانچہ وہ محاروں کا استعمال کرتے ہوئے پُر اسلوب انداز میں اپنی اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''مخدوم پر کچھ لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔اس لئے نہیں کہ اس کی تلاش میں کوہکن کے تیشے کی ضرورت ہے یا کسی ماورائی کیفیت سے ایک اَن جانی ،ان بوجھی شبیہ کھینچ کرلانی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ مخدوم تو ساحل پر پھیلی ریت ہے جس کا ہر ذرّہ آپ ہی دمک رہا ہے اورجسکی دمک کو مزید Define کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''(۷۲)

اس اقتباس سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مخدوم محی الدین انسان ،شاعر ،فلسفی ،مارکسسٹ پروتالتاری ہر طرح سے وہ ایک ممتاز شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔لہٰذا مخدوم کو ایک خانے میں بانٹا نہیں جاسکتا۔مخدوم کی کلی حیثیت کو نظر انداز کرکے ان کی شخصیت کے کسی ایک پہلو سے ان تک پہنچنے کی کوشش کرنا وہ اپنے وقت کو ضائع کرنے کے برابر سمجھتی ہیں۔آگے انہوں نے مخدوم محی الدین کا مختصر تعارف ،مختلف آراء و نظریات کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے جہاد کی مختلف تعریفیں اوراس کو مختلف الصفات انداز میں استعمال کرنے پر روشنی ڈالی ہے۔زیرِنظر مضمون میں قمر جمالی نے مخدوم کی کوششوں کو جہاں بالقلم کا سرہنگ مانتے ہوئے ماوری جہاد کی ایک مبسوط و منظّم تعریف جو جناب شبیر احمد عثمانی قدس سرہ مفسر قرآن نے بیان کی ہے جس کو پیش کرتے ہوئے جہاد کو مخدوم کی شخصیت میں سمجھنے کی کوشش کی ہے مثلاً وہ لکھتی ہیں:

> ''کسی ناپسندیدہ چیز کے دفع کرنے کے لئے انتہائی کوشش اور یہ کوشش کیسی بھی ہوسکتی ہے کبھی زبان سے کبھی ہتھیار سے کبھی نفس امارہ کی شکست سے کبھی مال ومتاع سے اور کبھی عمل صالح سے، مگر ان سب کوششوں میں سب سے بلند اور معتبر کوشش ہے ''جہاد بالقلم'' میں مخدوم کو اس جہاد کا سرہنگ مانتی ہوں۔'' (۷۳)

مصنفہ نے اس مضمون میں مخدوم کی پیدائش اوران کے بچپن کے حالات ان کے ماحول کے اثرات اور ان کی پروش مخدوم کی شخصیت اور مارکسزم کے جدو جہد پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ مختصراً یہ کہ مخدوم کی رفتار، گفتار اور ہر ادا سے ان کے مرد مومن ہونے کا یقین جھلکتا ہے کیوں کہ مخدوم کے گھر کا ماحول مذہبی رہا ہے۔ دراصل یہیں سے مخدوم کے اندر ایک ایسا انسان پرورش پا گیا جسے بعد میں مارکسسٹ کمیونسٹ کا نام دیا گیا۔ قمر جمالی مخدوم کے جدو جہد کا اصل محرک مزدور طبقہ قرار دیتی ہے۔ کیوں کہ لینن کی طرح مخدوم بھی مزدوروں کی یونین بنانے اور انہیں متحرک کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لئے وہ اجتماعی جدو جہد سے مسائل کے حل ڈھونڈنے کے لئے آپ ایک منظّم جنگ کا اعلان کرتے ہیں۔ مگر مخدوم ظلم کے خلاف تلوار کے بجائے قلم کے ذریعہ تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ اس لئے مخدوم نے اپنے قلم کو تلوار بنایا اور ضرورت پڑنے پر تلوار اٹھائی بھی تھی۔ قمر جمالی مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ جب حیدر آباد میں کیمونسٹ پارٹی کا قیام ۱۹۴۰ء میں عمل میں آیا مخدوم اس پارٹی کے رکن ہوئے۔ اس وقت ہندوستانی قومی تحریک زوروں پر تھی اور اس دور کے بالغ نوجوان اسپین کے جنگ سے متاثر تھے تو ایسے حالات میں مخدوم نے پہلی سیاسی نظم ''جنگ'' لکھی تھی۔

زیر نظر مضمون میں قمر جمالی نے نظم 'جنگ' کے چند اشعار کو پیش کیا ہے جس کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مخدوم محی الدین نے اس نظم میں فاشزم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے تباہی و بربادی کی تصویر کھینچی ہے۔

مزید انہوں نے ترقی پسند تحریک کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کا آغاز ہوا۔ یعنی ادب میں ادعائیت کو شامل کیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں منظّم طریقے سے جو تحریک قائم کی گئی ہے وہ تحریک دراصل ادبی اور سیاسی انداز فکر پر مشتمل تھی۔ تحریک کا مقصد بھی انہیں نظریات کی تشہیر کرنا تھا کہ صحت منداشترا کی

نظریات کی ترویج وترسیل ہوسکے۔لہٰذا مخدوم محی الدین پرتحریک کا گہرا اثر رہا ہے۔ان کی نظر ملک کوسرمایہ دارانہ نظام سے پاک کرنے اور پروتالوی طبقے کوحکمرانی کے لئے آمادہ کرتا تھا۔جس کے متعلق انہوں نے نظم ’جہانِ نو‘لکھی اس نظم کے چنداشعارکوقمر جمالی نے زیرِنظرمضمون میں شامل کیا ہے۔اس نظم کا خلاصہ یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ مستقبل اس تاریک ماضی سے مختلف ہوگا۔مخدوم اس نظم میں ایک نئی دنیا کا تصورپیش کرتے ہیں۔اردونظم نگاری میں باغیانہ رنگ اورانقلاب آہنگ پیدا کرنے والوں میں مخدوم محی الدین پیش پیش تھے۔مخدوم کوترقی پسند شعراء میں ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کا آغازعشقیہاورانقلابی جذبات کے ساتھ کیا۔

قمر جمالی نے زیرِنظرمقبول نظم ’’جنگِ آزادی‘‘ کے چنداشعارپیش کئے ہیں جس میں مخدوم نے پروتالتاری طبقے کو باضابطہ اعلانیہ طور پرا کسایا ہے۔اس نظم میں مخدوم کے ہاں صرف ہندوستان کے محنت کش طبقے کی امیدوں کا سرچشمہ ہی نہیں تھا بلکہ ساری دنیا کے محنت کش اورمزدوروں کی آرزوؤں اورخوابوں کا گہوارہ تھا۔قمر جمالی اس نظم کے ذریعے یہ بات آشکارکرنا چاہتی ہے کہ مخدوم اس نظم میں کسی خاص قوم ونسل سے مخاطب نہیں ہوتے ہیں بلکہ ایک عالم گیرانسانیت کےعلم بردار بن جاتے ہیں۔

الغرض قمر جمانی نے ترقی پسندتحریک کے آغاز ومقاصد پرروشنی ڈالتے ہوئے مخدوم کی شاعری میں مارکسزم کے اجزاءکوتلاش کرتے ہوئے ان کے اشعار کے حوالے سے ان کی سیاسی اورادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔آج کے پس منظر میں مخدوم کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اورمخدوم نے جبرواستبداد کے خلاف اورشدت پسندی کے حق میں جوآوازاٹھائی تھی اورقلم کوہتھیار کےطور پراستعمال کرتے ہوئےنظم ’’موت کا گیت‘‘ لکھا ہے۔جس کے متعلق قمر جمالی زیرِنظرمضمون میں نظم ’’موت کا گیت‘‘ کے چنداشعارپیش کئے ہیں قلم کوہتھیار کے طوپراستعمال کئے ہیں۔جس کا خلاصہ یہ کہ مخدوم کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پرانسان نے بہت استحصال کرلیا۔ ہرظلم کوانسانی مقدرقراردے کر انسان نے ایک کھیل جاری رکھا۔وہ کہتے ہیں زمانے کے قلب میں شرارے بھرکردوعالم تباہ کردیں۔اوروہ زلزلوں ،بجلیوں اورآندھیوں سے کہتے ہیں کہ وہ اس کرہ ناپاک کوختم کردیں لیکن بالکل آخری مصرعے میں مخدوم کہتے ہیں کا سہ دہرکومعمورکرم کرڈالیں،وہ چاہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام اورطاقت واقتدار کے ایسے مراکزختم ہوجانے چاہئیں جہاں سےغریبوں پرظلم روارکھا گیا ہے۔دنیا کووہ معمورکرم کرنا چاہتے ہیں۔لہٰذا اس نظم میں مخدوم کا آہنگ اور لہجے کی لے بہت تیز ہےایک انقلابی کیفیت اور جوش نظرآتی ہے۔

مزید انہوں نے مخدوم کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی تنقیدی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ اور مختلف دلائل کی روشنی میں اپنے مطالعہ کو پیش کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا ہے جس کے متعلق وہ یوں رقم کرتی ہیں:

''مخدوم نے جس زمانے میں شاعری کی اُس دور میں انسان کا رویہ جارحانہ تھا۔ پھر شاعر یا ادیب تو قوم کے نقیب ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس دور کی شاعری میں انتہا پسند، موضوع کے انتخاب میں یکسانیت اور لہجے میں خطیبانہ رویہ ملتا ہے۔ ویسے ادب کا مطلب ہمیشہ ہی تعلیمی اور اصطلاحی رہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ شاعری، جنگ میں جوش دلانے کے لئے استعمال ہوتی رہی۔ لہٰذا ترقی پسند شعراء اور ادباء کے پاس ''رجزیہ انداز' اور 'رجزیہ لہجہ' نمایاں نظر آتا ہے کیوں کہ ان تخلیق کاروں کا رجحان ادب برائے غم دوراں تھا۔ نا کہ غم جاناں۔''(۷۴)

زیرِ نظر مضمون میں قمر جمالی نے مخدوم کو مردِ مومن قرار دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ مخدوم میں موجود انسانی خوبیوں کے اوصاف کو بیان کیا ہے اور مخدوم کو جو شہر حیدرآباد سے بے پناہ پیار تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تاریخ وفات، مخدوم کو بڑے صاحبزادے نصرت محی الدین نے اپنے مضمون میں ''جس کو یاد کرتا ہوں'' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں مخدوم کی وفات پر اہل خانہ کو جو رنج وملال پہنچا اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تدفین کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں مجتبیٰ حسین نے بھی مخدوم کی وفات کے منظر کو بڑے دردانگیز پیرائے میں بیان کیا ہے جس پر روشنی ڈالتے ہوئے کسی انٹرویو میں مجتبیٰ حسین نے مخدوم سے دوستی کے متعلق راج بہادر گوڑ سے جو سوال کئے تھے اس کا بیان کرتے ہوئے انھوں نے اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

''ایک مرتبہ اپنے کسی انٹرویو کے دوران میں نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب سے پوچھا'' آپ مخدوم سے اور مخدوم آپ کی ذات سے اس قدر وابستہ رہے کہ دونوں کو الگ کر کے سوچنا مشکل ہے۔ اب مخدوم کی موت کے بعد آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟ ڈاکٹر گوڑ تھوڑی دیر تک خلاء میں گھورتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ گویا ہوئے۔

''مخدوم مرا نہیں'' اس نے دوستی کا حق یوں ادا کیا کہ پورے کا پورا میری روح میں سما گیا اب وہ مجھ میں ہے۔ ورنہ تو مخدوم کے بنا میں مرجاتا۔ واقعی مخدوم مرے نہیں۔ وہ زندہ ہیں ہر غیرت مند انسان کی فکر میں آج بھی ملک ایک بار پھر اُسی موڑ پر آکر کھڑا ہوگیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ وقت کی للکار سنیں۔ مخدوم نے جو جگال بجائی اس کی بازگشت پر کان دھریں۔'' (۷۵)

خلاصہ گفتگو یہ کہ قمر جمالی زیرنظر مضمون سے اس بات سے آشکار کرانا چاہتی ہیں کہ مخدوم کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی اس حقیقت کا مظہر ہے کہ ان کے جذبات، خیالات اور قوتِ ارادی نے اس مسلک کو کلی طور پر قبول کرلیا تھا اور جہاں تک شاعری کا تعلق ہے مخدوم نے اکتسابی فن کے طور پر نہیں اپنایا۔ کیونکہ وہ محض موزوں طبع نہیں تھے بلکہ ان کے فہم وادراک میں آزادی افکار اور بالغ نظری ہی قوم کی نجات دہندہ تھی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مخدوم کا شعری اثاثہ کمیت کے اعتبار سے بے حد مختصر رہا ہے لیکن مخدوم نے اپنی شاعری کے ذریعے عوام کو نہ صرف للکارا ہے بلکہ انہیں ایک جہانِ نو کی بشارت بھی دی ہے۔

محترمہ نجمہ نکہت......میری یادوں کے صحیفے میں:

قمر جمالی نے ایک مضمون ''محترمہ نجمہ نکہت میری یادوں کے صحیفے میں'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ مضمون ۳۰ رستمبر ۲۰۱۳ء کو لکھا گیا جو روزنامہ سیاست میں ۱۹ رنومبر ۲۰۱۳ء کو شائع ہوا ہے۔ زیرنظر مضمون میں قمر جمالی نے محترمہ نجمہ نکہت کی شخصیت وادبی خدمات اور ان کی افسانوی زندگی کے عہد وحالات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ قمر جمالی نے زیرنظر مضمون کی ابتداء میں اس بات کا اعترف کیا ہے کہ افسانہ نگار محترمہ نجمہ نکہت کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ افسانوں کی کلیات بعنوان ''رات کے گزرتے ہی'' محترمہ کے انتقال کے ۱۶ سال بعد شائع کرکے ان کی اولادِ صالح محترمہ ثریا قدوائی اور ہما قدوائی اس کی رسم رونمائی کی ہے۔ لہٰذا قمر جمالی کو یہ کتاب نہ ملنے پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی صحبتوں میں گزری یادوں کے سہارے لکھا ہے۔ بعدازاں انہوں نے نجمہ نکہت کا تعارف پیش کرتے ہوئے ''انگارے'' اور ترقی پسند تحریک کے آغاز پر روشنی ڈالی ہے۔ دسمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعے ''انگارے'' کو ترقی پسند تحریک کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ قمر جمالی نے ترقی پسند تحریک کے زیراثر

جن افسانہ نگاروں نے افسانے لکھ کرتحریک کودوام بخشی ہےان کا تعارف پیش کرتے ہوئے افسانے کی ابتدائی دور میں ۱۹۳۶ءتا۱۹۴۷ء پریم چنداوران کے معاصرین افسانہ نگاروں نے جن جن موضوعات کواپنی کہانیوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہےاوراس دور میں سماجی مسائل وحقیقت نگاری پرزیادہ زور دیا گیا ہےجس کا برملا اظہار زیر مضمون میں ملتا ہے۔ بعدازاں ۱۹۴۸ءتا۱۹۶۰ءکا دورتقسیم ملک اور ہجرت کے کرب نے اردوافسانے کولہولہان کردیا۔اس دور میں فحاشی،تقسیم ملک،ہجرت کے کرب جیسے موضوعات کوافسانوں میں پیش کیا گیا۔۱۹۶۰ءکے بعد کا دورجدیدیت کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ دورقاری کے لئے بڑا آزمائش کا دوررہا کیونکہ اس میں علامتیں کردار بن گئی اورمتن چیستاں ہوگیا اوراس دور میں تکنیک پر بہترین تجربے کئے گئے لہٰذا قمر جمالی اوران کے معاصرین افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں تکنیک کے بہترین تجربوں کے استعمال سے قارئین کے ذہنوں کو جھنجھوڑا اورانہیں مختلف انداز میں سوچنے پرمجبورکیا۔مختصراًیہ کہ اس مضمون میں بیسویں صدی کے اہم تحریکات نے دورِافسانہ نگارمیں جوجوتبدیلیاں پیدا کی ہیں اس پرتفصیلی بحث کرتے ہوئے محترمہ نجمہ نکہت کواس دورکی پیداوارقراردیا ہے۔ اورترقی پسند مصنّفین کے زیراثر نجمہ نکہت نے جوخدمات انجام دیں اس سے متعلق ان کی ذہنی تربیت وخیالات پر قمر جمالی نے روشنی ڈالی ہے چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

''نجمہ باجی کے بہت سےافسانے میں نےترقی پسند مصنّفین کی نشستوں میں سنا ہے اکثر افسانے سوانحی ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں Auto biographical elementsاتنے صاف ہوتے کہ کم ازکم میں توسمجھ ہی لیتی ۔اب مجھے افسانوں کےعنوانات برابریادنہیں رہےمگران کے موضوع اورمتن ذہن نشیں ہیں۔جیسے میرا گھر......حسینی علم''اس افسانے کی ابتداء میں انہوں نےلکھا تھامیرا گھر کاسموپالٹن انڈیا کانمونہ ہے۔اس میں ہرایک کواپنی مرضی سے جینے کاحق ہے۔پھرانہوں نے اپنے گھرحسینی علم کے ہرکمرے کی سیرکروائی۔ ہرفردِخاتون سےملاقات کروایا۔ان کی اچھائیاں اورکمزوریوں کا ذکر یوں کیا جیسے دونوں ہی ان کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ باجی نے جسے بھی چاہا اُسے ان کی خوبیوں خامیوں سمیت چاہا۔ٹوٹ کرچاہنا ان کا شیوہ

تھا۔‘‘(۷۶)

قمر جمالی کے نجمہ نکہت سے دیرینہ مراسم رہے ہیں۔مضمون نگار نے نجمہ نکہت کے شریکِ حیات اوران کی زندگی کے حقائق کو پیش کرتے ہوئے اپنے خیالات کو اتنے پر اثر انداز میں بیان کیا ہے جسے پڑھ کر قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔مثلاًایک اقتباس ملاحظہ ہوں۔

’’باجی دل کھول کر باتیں کرتیں۔اپنے بارے میں اپنی بیٹی ثریا کے بارے میں زندگی کی بہت سی حقائق کا ذکر کرتیں۔اپنے شریک حیات قدوائی صاحب کے بارے میں کہا کرتیں۔وہ جنہوں نے مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا اورانہیں سے میری شادی ہوئی ۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔میں نے بھر پور زندگی جی...... بہت اچھی...........خوش دل......ایک محفوظ حفاظت میں...... محبت سے بھرپور......۔’’باجی...........!واقعی ہسبنڈ اور وائف کی عمر میں اتنا تفاوت بڑے نصیبوں والوں کو ملتا ہے۔اتنا ہونا چاہئے باجی! تاکہ محبت میں تھوڑی سی شفقت وتھوڑی سی سرپرستی بھی شامل ہو.................آپ بڑی نصیبوں والی ہیں۔ورنہ تو پھر......ایک گاڑی کے دو پہئے...... بوجھ دونوں پر برابر...........برابر۔

ورنہ ذراسی الڑکھڑاہٹ سے......زندگی کی گاڑی ڈگمگا کر دھڑام......!!‘‘

’’شریرکہیں کی...........!!

وہ کھکھلا کر ہنس پڑتیں۔

پھر.......... میرے قریب آئیں اورٹھہر ٹھہر کر میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی.......................

’’زندگی ماڈرن آرٹ کی طرح ہے۔بس دور ہی سے خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ جتنا قریب جاؤ........... بھدی........... ناقابل فہم........... مہمّل...........ناقابل سمجھ...........اس لئے سمجھنے سمجھانے کے لئے کچھ بچتا

نہیں ہے۔زندگی کو بس جو جینا ہوتا ہے............جیسے تیسے..................''

وہ پہلے سے زیادہ گمبھیر ہوجاتیں اورمزید خاموش

..................''باجی............!''

میں شرارت سے ان کی آنکھوں میں جھانکتی............

''اُف'' ....''باندھ ٹوٹنے کو ہے............''میں چپ ہوجاتی

وہ مسکراتیں ...... اپنے اندر اٹھتے طوفان کو روکنے کا سلیقہ تو کوئی انہیں سے سیکھے۔''(۷۷)

انھوں نے نجمہ نکہت کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت میں محبت کے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی رحم دلی وملنساری کو قمر جمالی ایک واقعہ کے ذریعہ بیان کرتی ہیں ملاحظہ ہوں:

''نجمہ باجی دل کی اتنی اچھی، سادہ لوح اور ہمدرد تھیں کہ کوئی بھی ان کی اچھائی سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ ایک بار انجمن کی میٹنگ میں آتے ہیں ایک آٹو ڈرائیور نے انہیں ٹھگ لیا کہ اس کی ماں دردزہ میں مبتلا ہے اور اس کے ہاں پیسے نہیں ہیں۔ انہوں نے اُس لڑکے کی ماں کو نہ صرف زچگی خانہ پہنچایا بلکہ اس کی مالی مدد بھی کر دی۔ ایک بار ایک فقیرن کو پیٹ بھر کھانا کھلانے کی غرض سے اسے ہال میں بٹھا کر کھانے لانے اندر گئیں۔ لوٹیں تو فقیرنی باجی کی لائبریری کی ساری کتابیں چرا کر چلتی بنی تھی۔ بعد میں دن بھر کا آٹو ہائر کر کے جناب آتق شاہ صاحب کے ساتھ شہر کی سڑکوں کے کنارے کتابیں بیچنے والوں کے ہاں اپنی کتابیں ڈھونڈتی پھریں کہ ان کتابوں پر بڑے بڑے ادیبوں کے آٹوگرافس تھے۔ ہائے ! کہاں گئے وہ لوگ جن کے اقدار کے آگے سر ازخود ہی جھک جاتے تھے......''(۷۸)

قمر جمالی نے نجمہ نکہت کے افسانوی انداز واسلوب کے بارے میں بیان کرتے ہوئے اپنے خیالات کو ترتیب ومربوط انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ جس کے مطالعے سے قمر جمالی کے اسلوب بیان میں دلکش اور

سادگی کے ساتھ ساتھ خوش آہنگ اوران کی شخصیت کی خارجیت اورداخلیت بھی نظرآتی ہے۔ساتھ ہی مصنفہ کا نجمہ نکہت کے ساتھ جو گہرا تعلق رہاہے اس کا برملا اظہار بھی ملتا ہے اس سلسلے میں اقتباس ملاحظہ ہوں:

''باجی کا افسانہ سنانے کا انداز بہت پیارا تھا۔کردار میں ڈوب جاتیں۔ڈوب کیا حلول کرجاتیں۔اتنا ڈوب کے سناتیں کہ لگتا اب روئیں...... کہ تب روئیں...........افسانہ ختم ہوتا۔لوگ جانے لگتے............تو میں قریب جاتی اور چھیڑنے والے انداز میں کہتی............

''کیوں باجی دل کی کسی بستی سے گذرا ہوا ہے نا؟............!''

وہ بڑے پیار سے میری پیٹھ پر چپت لگاتیں...........مگر قسم لے لو جو آنسو کبھی آنکھ سے ٹپکا ہو.................میں نے انہیں کبھی روتا ہوا نہیں دیکھا۔حالانکہ ایسے بہت مواقع آئے ہیں جن کی میں گواہ ہوں۔''(۷۹)

بالآخر نجمہ نکہت کی بیماری اور انتقال وغیرہ کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے اور اپنا درد بیان کرتی ہوئی کتاب 'رات کے گزرتے ہی' پر کچھ کہہ نہ سکنے پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔

ترقی پسند تحری

ترقی پسند تحریک اور حیدرآباد کی ترقی پسند خواتین افسانہ نگار

قمر جمالی اس مضمون میں ترقی پسند تحریک کا آغاز و پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کے استحکام پر روشنی ڈالتے ہوئے اس وقت انجمن کے اراکین میں جو شخصیتیں شامل تھیں جن میں سے کچھ کے نام گنوائے ہیں۔چونکہ یہ مضمون حیدرآباد کی افسانہ نگار خواتین تک محدود ہے اس لئے یہ مضمون ۱۹۷۹ء سے لے کر آج تک کی افسانہ نگاروں کا احاط کرتا ہے جن میں محترمہ فاطمہ عالم علی خاں،محترمہ بانو طاہرہ سعید (مرحومہ) محترمہ سلطانہ شرف الدین احمد (مرحومہ) محترمہ نجمہ نکہت (مرحومہ) اے۔او۔شاکرہ (مرحومہ) پدم شری جیلانی بانو،محترمہ رفیعہ منظورالامین (مرحومہ) پروفیسر اشرف رفیع،محترمہ سکینہ وسیم عباس،محترمہ لکشمی دیوی راج،محترمہ سرتاج ذکی،محترمہ اودھیش رانی،محترمہ نسیمہ تراب الحسن اور راقم الحروف قمر جمالی شامل ہیں۔

الغرض قمر جمالی نے حیدرآباد کی خواتین افسانہ نگاروں پر تحریک کا کیا اثر رہا جس پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی چند اہم تصانیف کا بیان کیا ہے جو اشترا کی نظریات کے حامل رہے ہیں۔ چنانچہ تحریک کے زیر اثر انسانی تاریخ وتہذیب کا مارکسی نقطہ نظر کے مطابق ادب کی ماہیت اور سماج سے اس کا رشتہ اور زندگی کی ساتھ ادب کا تعلق سمجھنے اور سمجھانے کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔

قمر جمالی مزید اس مضمون میں حیدرآباد کی ترقی پسند جن خواتین افسانہ نگاروں کا جائزہ لیا ہے جس کے مطالعے کے بعد یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حیدرآباد کی افسانہ نگار خواتین نے مرد افسانہ نگاروں کے شانہ بشانہ چل کر اپنی خدمات انجام دیں اور افسانے کے سرمائے میں اضافہ کیا۔ خواتین نے اپنے افسانوں میں انسانیت کی اہمیت، زندگی اور سماج کے بیشمار مسائل پر غور وفکر کی دعوت دی۔ بالخصوص معاشرے کی علت ونقائص کو نمایاں کرنے میں خلوص اور جرأت کا ثبوت دیا۔ ان افسانوں کے مطالعے کے بعد بلا خوف وجھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمام افسانہ نگار خواتین ہر دور میں ظلم اور ناانصافی کو ختم کر کے زندگی کو خوبصورت بنانے کی متمنی رہی ہیں۔ اسی لئے اصلاحِ معاشرہ کی خاطر بھی وہ اس بات پر متفق ہیں کہ معاشرے کی ذہنی اور فکری پسماندگی کو ختم کرنا ضروری سمجھتے ہوئے ہمارے افکار ونظریات اور رویوں میں تبدیلی لانا چاہتی تھیں۔

زیر نظر مضمون میں قمر جمالی ترقی پسند تحریک کے خاتمہ کے متعلق سماج کے جو نظریات رہیں جس پر زور دیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار عالمانہ انداز میں کیا ہے اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''روس کے بکھرنے کے بعد لوگوں نے یہ مان لیا کہ ترقی پسند تحریک کا خاتمہ ہوگیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تحریکیں بنتی ہی ٹوٹنے کے لئے ہیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ افکار ونظریات کا بدلنا ناگزیر ہے اور ٹوٹنا اور بکھرنا ایک فطری عمل ہے۔ کسی بھی معاشرے کی شکست و ریخت سے جو گونج پیدا ہوتی ہے۔ دراصل نئی تہذیب کا بگل وہیں سے بجتا ہے۔ گرنا اور سنبھلنا زندہ قوموں کی علامت ہے۔ ادبی نظریات اور رجحانات بھی معاشرے کا حصہ ہیں۔ ظاہر ہے تبدیلی ناگزیر ہے۔ مگر ترقی پسند فکر کے عوامل میں ایسی استقامت ہے کہ اس کا خاتمہ ناممکن ہے۔ ہماری نظر میں ہر وہ ادیب، شاعر، انشاء پرداز، محقق یا

ناقد جو بنی نوع انسان کی اصلاح پر جٹا ہے............ وہ ترقی پسند ہے۔اب چونکہ ادب کو اس پروپگنڈہ کی ضرورت باقی نہیں رہی جو کبھی کلیشے ، بن کے ابھرا تھا اب ترقی پسند ادب میں پہلا جیسا وہ شور شرابہ اور راست مخاطبت باقی نہیں رہی۔ آج ادب کے تقاضے الگ ہیں اور ادیبوں کے سامنے پہلے سے بھی سوا چیلنجس ہیں۔ آج کا قاری بے حد ذہین ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تسکین کے تقاضے بھی جدا ہیں۔ اور ادیب ہمیشہ عصری تقاضوں کی تکمیل کا پابند رہا ہے۔اس لئے اظہار کے زاویے بدل گئے ہیں۔'' (۸۰)

قمر جمالی نے زیر نظر مضمون میں یہ ثابت کرنے کی جسارت کرتی ہیں کہ ترقی پسند تحریک کا خاتمہ نہیں ہوا ہے۔ بلکہ حیدرآباد کی انجمن ترقی پسند مصنّفین آج بھی زندہ ہے۔ ہاں پہلی جیسی فعال نہیں ہے جس کی کئی وجوہات ہیں۔ مرحلہ درپیش ہوتا ہے تو انجمن متحرک ہوجاتی ہے۔ الغرض سرزمین حیدرآباد کی ترقی پسند خواتین میں قمر جمالی کا شمار ہوتا ہے اور آج بھی وہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ قمر جمالی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اگرچہ انہوں نے ڈرامے، مضامین اور ناول لکھے۔ چنانچہ جب جدید تر نسل کے افسانہ نگاروں کی تاریخ لکھی جائے گی جنہوں نے آٹھویں دہائی میں افسانہ نگاری کو زوال آمادہ ہونے سے بچالیا ہے تو اس میں قمر جمالی کا نام جلی حروفوں میں لکھا جائے گا۔

ترقی پسند اردو غزل میں سماجی سروکار:

ترقی پسند تحریک کے متعلق قمر جمالی نے تین مضامین قلم بند کئے ہیں۔ جن میں سے ایک مضمون ''ترقی پسند اور اردو غزل میں سماجی سروکار'' کے عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ یہ مضمون انہوں نے ۷/ستمبر ۲۰۱۴ء کو تحریر کیا ہے۔ جو ششماہی ''ادب وثقافت'' ریفریڈ جرنل ،مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی شمارہ میں ۲/ مارچ ۲۰۱۶ء کو شائع ہوا۔ زیر نظر مضمون میں قمر جمالی نے ترقی پسند غزل، ترقی پسند غزل میں تغزل اور ترقی پسند شعراء جیسے تین ذیلی عنوانات قائم کئے ہیں۔غزل میں سماجی سروکار مطلب ایسی غزل جس میں سماج یا پھر سماج میں رہنے والے انسانوں کے حوالے سے مضمون باندھا گیا ہے۔ جس میں انہوں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے غزل کی تعریف وہیئت اور

موضوعات اور غزل کی مقبولیت کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے اردو غزل گوئی کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔ مزید انہوں نے اردو شاعری کی ابتداء میں غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں مغل دربار کی شاعری سے لیکر اورنگ زیب دربار سے وابستہ ان تمام شعراء کا ذکر کیا ہے جنہوں نے آسمان شاعری پر تاروں کی جھرمٹ کی طرح تھے اور انہوں نے ایسی شاعری کی کہ تاریخ ادب میں یہ باب ہمیشہ منور رہے گا۔ یہ وہ شعراء تھے جنہوں نے شعری روایات کی پاسداری کی۔ الغرض سترہویں صدی عیسوی سے دکن میں باقاعدہ اردو شاعری کا پتہ چلتا ہے۔ بعدازاں صنف غزل نے ترقی کرتے ہوئے جب بیسویں صدی کے دور میں قدم رکھا تو ایک زبردست تحریک سے متصادم ہوئی جسے ترقی پسند تحریک کا نام دیا گیا۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک نے اردو شعروادب میں بڑی انقلابی تبدیلیاں کیں، ابتداء میں ترقی پسند شعراء غزل کی طرف مائل نہ ہوئے کیونکہ غزل میں انہیں اظہار کا پیرایہ تنگ لگا مگر غزل کی مقبولیت نے انہیں ایک نئے لہجے کے ساتھ غزل کی طرف مائل ہونے اور ان کا سماج کے تئیں عزم یعنی سماج کو بیدارا کرنے کا بیڑہ اٹھایا تو رجعت پسندوں کی طرف سے پورے ترقی پسند ادب پر الزام عائد کیا گیا کہ یہ ادب محض ایک پروپگنڈا ہے وغیرہ کی معلومات فراہم کرتے ہوئے قمر جمالی نے ترقی پسند دور غزل کا پس منظر کو بیان کرتے ہوئے کن وجوہات کی بنا پر شاعر اپنی شاعری میں سماجی سروکار کے مسئلہ کو پیش کرنا اپنی ذمہ داری کو سمجھا جسپر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

> ”ترقی پسند شاعروں نے غزل کو عوامی آواز بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ادب کو کمٹمنٹ سے ایسے جوڑا کہ اب کسی بھی ادیب یا شاعر کا عوامی مسائل سے بچنا ناممکن ہوگیا۔ یہ وہ دور تھا جب ماحول میں اضطراری اور ہیجانی آوازوں کا شور تھا۔ سماجی اور سیاسی اعتبار سے ہنگامے، فرقہ پرست رجحانات، جلسے جلوس، ریلیاں، ہرطرف نعروں کی گونج اور افراتفری کا عالم تھا۔ ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا اور نو مولود ہندوستان نام نہاد آزادی کے زیر اثر درندگی، غارت گری، بھوک مری، کمزور پر زور آور کا غلبہ، سیاسی اور سماجی نابرابری، المختصر عام آدمی ہرطرف سے پستا، کچلتا دکھائی دیتا تھا۔ ان حالات میں شاعر کیسے چپ رہ سکتا تھا!

وہ شعراء جو ترقی پسند، شعراء کے نعروں، بلند آہنگ، پر شور احتجاج کو پسند نہیں
کرتے تھے آہستہ آہستہ وہ بھی ترقی پسند تحریک کے جھنڈے تلے آ گئے اور
یہیں سے شاعری میں سماجی سروکار در آیا۔''(۸۱)

غرض یہ کہ غزل میں روایتی عشق اور تصوف سے ہٹ کر بات کی جا رہی تھی۔مضمون نگار نے زیر نظر مضمون میں اردو شاعری کی ابتدا سے لیکر اکیسوی صدی تک شعرائے غزل نے شاعری میں جن جن موضوعات کو پیش کیا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ غزل کے موضوعات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ بدلتے وقت کے ساتھ موضوعات وافکار اور اظہار میں زمین آسمان کا فرق آ گیا ہے اور شاعری کا محور مجموعی طور پر فرد واحد ہو گیا۔آ گے چل کر حالات میں اتنی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ آدمی پر سے آدمی کا بھروسہ اٹھ گیا اور شاعر تو لوگوں کو نصیحت کرنے اور خطرے سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔جس کے متعلق قمر جمالی کا خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک سے پہلے بھی شاعری میں مقصدیت اور معنویت تھی مگر ترقی پسند تحریک سے پہلے شاعری میں سماجی سروکار کو مرکزی خیال بنا کر پیش کئے جانے کے حقیقت کو اظہار کرتی ہیں مزید وہ کہتی ہیں کہ جس طرح منشی پریم چند سے پہلے نچلے طبقے کا فرد کہانی کا ہیرو نہیں تھا اسی طرح اب صرف پرولتاری محورِ خیال یعنی ادا کار بن جانے اور روایت سے بغاوت کئے جانے پر افسوس کا اظہار خیال کرتے ہوئے وہ آج کے دور کے حالات مثلاً انہوں نے موجودہ سیاست، افلاس اور بھوک مری کی تصویر، مشینی دور میں آج کے انسان کی متعدی کی مثالیں پیش کرتے ہوئے بعنوان'' آج کے دور کا سب سے بڑا المیہ ہے پڑھی لکھی اولاد کا بوڑھے والدین کو تنہا چھوڑ دینا'' جس کی مثال میں ایک شعر پیش کیا ہے ملاحظہ کیجئے:

''بیٹا ہے بہت دور مگر آئے گا جعفر
میت کے اٹھانے میں بڑی دیر لگے گی''
(۸۲)
(رفیق جعفر)

قمر جمالی کے پیش کئے گئے شعر سے آج کے دور کی حقیت کھل کر سامنے آتی ہے۔یہ بات سوفی صد سچ ہے کہ والدین اپنے بچوں کی پرورش کے لئے کیا کچھ کر نہیں گزرتے مگر وہی اولاد جب بڑی ہو جاتی ہے تو ماں باپ

کے ساتھ حسن سلوک خدمت واطاعت کرنا بھول جاتی ہے اوران کی تکالیف وقدر کا انہیں کوئی احساس ہی نہیں رہتا جب وہ کوئی مقام حاصل کر لیتے ہیں تو اپنے ماں باپ کو چھوڑ چھاڑ کر اپنی الگ دنیا بسا لیتے ہیں اور اپنے بوڑھے والدین کو تنہا چھوڑ کر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں والدین بھی یتیموں کی طرف زندگی کاٹ رہے ہوتے ہیں۔لعنت ہے ایسی زندگی مال ودلت، اور ایسے سماج واولاد پر جو والدین کی خدمت کرنے سے دور کر رہی ہیں۔الغرض یہ کہ قمر جمالی نے اس شعر کے حوالے سے اپنے خیالات وتاثرات کو پر اثر زبان میں بیان کرتے ہوئے آج کے دور کے حالات پر اپنا تنقیدی نظریہ پیش کیا ہے۔جسے پڑھ کر قاری نصیحت حاصل کرتا ہے۔

قمر جمالی ترقی پسند غزل میں تغزل کے متعلق اپنا خیال پیش کیا ہے کہ ترقی پسند تغزل ،ترقی پسند شاعری، بلکہ ادب کے دائرے سے باہر کی چیز نہیں ہے۔جبکہ ترقی پسند تغزل میں عصری احساسات کو غزل کی روایت میں سموکر اظہار کیا گیا ہے۔رجعت پسندوں کو یہ فکر لاحق ہوگئی تھی کہ غزل کی ساخت اور ہیئت بدل گئی اور تفریح طبع کی جگہ مقصدیت کو پیش کیا جارہا تھا اور لہجہ وآہنگ بدل جانے پر کہیں غزل سے تغزل خارج ہو جائے۔قمر جمالی مدلل انداز میں اس بات کو پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ یہ ان کی خام خیالی ہے۔مزید انھوں نے چند اہم ترقی پسند شعراء کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے جو ابتدائی دور میں اس تحریک کے بانی مبانی رہے ہیں۔اکیسویں صدی کے ہر دور کا شاعر قمر جمالی کی نظر میں ترقی پسند ہے اور قمر جمالی بھی ترقی پسند تحریک زیر اثر آج بھی وہ اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ابتداء میں جن شعراء نے اس تحریک کو جلا بخشی ہے ان میں جذبی، فیض، مجاز، فراق، جوش، حسرت، شاذ، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، مخدوم، جاںنثار اختر وغیرہ شامل ہیں۔الغرض زیر نظر مضمون میں قمر جمالی نے ترقی پسند غزل گو کی خدمات کا مختصراً جائزہ پیش کیا ہے۔مثلاً یہاں فیضؔ کی شاعری پر قمر جمالی نے جو اظہار خیال کیا ہے جس کے متعلق ایک اقتباس پیش کیا جارہا ہے ملاحظہ کیجیے:

> ”فیض ترقی پسند تحریک کے موقر علمبرداروں میں سے تھے۔ترقی پسند غزل میں فیض کا نام سرسید جیسا ہے۔فیض کے کلام میں انقلاب اور شترا کیت کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔جیل کی چاردیواری نے فیض کی غزلوں کو جلا بخشی۔“(۸۳)

مذکورہ اقتباس سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ قمر جمالی نے ترقی پسند غزل گو فیضؔ کو سرسید سے تشبیہ دی ہے

قمر جمالی کی اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کیونکہ مجروح سلطان پوری نے بھی فیض کو ترقی پسندوں کے میر تقی میر کہا ہے۔ چونکہ قمر جمالی نے فیض احمد فیض کے کلام کے چند اشعار پیش کئے ہیں جس میں انقلاب اور اشتراک کے عناصر موجود ہیں۔ جبکہ فیضؔ کے کلام پر روشنی ڈالی جائے تو ان کی پوری شاعری خلاصہ یہ کہ فیض کی شاعری رومان اور انقلاب کا حسین سنگم ہے فیض کی شاعری میں انگریزی ادب کے ایک خوشگوار اثر، جدید انسان کے ذہن، اور ایشیائی تہذیب کے قابل قدر عناصر کی ایک قوس قزح جلوہ گر ہے۔ فیض کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کے خیالات کی سنجیدگی، شخصیت کا توازن اور شعری اعتدال ہے۔ انھوں نے جس بصیرت افروز احساس، خلوص وفنکارانہ جابکدستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا یہ اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک بالکل نئی چیز تھی اور قابل قدر تھی۔ مختصراً یہ کہ قمر جمالی کے بیان سے اتفاق کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کی فروغ میں فیضؔ کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

خلاصہ گفتگو یہ کہ ترقی پسند تحریک باغیانہ اصولوں اور آدرشوں کے تحت نمو پائی شاعری میں ظاہر ہے کہ عشق ومحبت کی داستانیں تو نہیں تھیں بلکہ باغیانہ خیالات، آزادی کے حصول کی کشمکش، مزدور پرولتاری طبقے کے ساتھ ناانصافی، نابرابری کے خلاف نعرے تھے۔ الغرض قمر جمالی نے زیر مضمون کے ذریعہ اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتی ہیں کہ شاعری میں سماجی سروکار کے عناصر براہِ راست نہیں ملتے مگر پوری شاعری میں سماج اور سماج میں رہنے والے فرد واحد ہی اجتماعی صورت میں شاعری کا مرکز بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جن شعرا نے نظم کے وسیلے سے بڑے ولولہ انداز میں شاعری کی ہے ان کی شاعری میں بغاوت، سیاسی محرکات اور وقت کی پکار نظر آتی تھی قمر جمالی اس موضوع کے ذریعے یہ نکات پیش کرنے کی کوشش کی کہ اس دور میں ضرورت اس بات کی تھی کہ نو جوانوں کے دلوں میں موجود ہ نفرتوں کو دور کرتے ہوئے ایک ایسی شمع روشن کریں جو صحت مند سماج کی تشکیل و پرورش کریں۔ لہٰذا سماجی سروکار بالخصوص جس میں روٹی، کپڑا، اور مکان سے متعلق کوئی بات بالراست نہیں ملے گی۔ اس کی وجہ یہ کہ اس وقت کا شاعر اتنا باغی اور احتجاجی ہو گیا تھا کہ اسے روٹی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی الغرض قمر جمالی ترقی پسند تحریک کے حوالے سے سماج کے ان مسائل کو زیر بحث لایا ہے جس کو ترقی پسند تحریک نے وقتی طور پر نظر انداز کیا۔

ترقی پسند تحریک کیا ہے:

قمر جمالی کا ایک مضمون ''ترقی پسند تحریک کیا ہے'' کے عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ۱۹/ مارچ ۲۰۱۶ء کولکھا گیا جو ماہنامہ قومی زبان میں اگست ۲۰۱۶ء کو شائع ہوا۔قمر جمالی نے زیرِنظر مضمون کی ابتداء میں ادب کی تعریف پیش کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کا پس منظر، آغاز،تحریک کی اہمیت ومقاصد اور افادیت وضرورت کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے کے عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔ بعد ازاں انہوں نے ۱۹۳۷ء میں پنجاب میں ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس کی حمایت میں بنگال کے شہرہ آفاق ادیب رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک پیغام بھیجا۔ یہ پیغام سجاد ظہیر کی روشنائی میں محفوظ ہے جس کو قمر جمالی نے زیرِنظر مضمون میں پیش کرتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں:

> ''خلوت پسندی میری طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔مگر جو بھی ادیب اپنے آپ کو معاشرے سے دور رکھتا ہے وہ انسانوں کو نہیں جان سکتا ۔ الگ تھلگ رہ کر ادیب ان تجربوں سے خود کو محروم کر لیتا ہے جو بہت سے لوگوں سے ملنے جلنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ معاشرے کو جاننا اور سمجھنا اور اسے ترقی کی راہ دکھانے کیلئے ضروری ہے کہ ہم سماج کی نبض پر انگلی رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو سنیں ۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ہماری ہمدردیاں انسانیت کے ساتھ ہوں اور ہم ان کے درد وغم میں شریک ہوں۔
>
> ادیبوں اور شاعروں کو عام انسانوں سے مل جل کر انہیں پہچاننا ہے ۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ زمانہ دراز تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں میں نے بڑی غلطی کی ہے۔اب میں سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ نصیحت کر رہا ہوں ۔ میرے شعور کا تقاضہ ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنا چاہیئے ۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ ناتمام اور نامراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغ حق کی طرح روشن ہے اور

کوئی استدلال اسے بجھانہیں سکتا۔
یادرکھو!تخلیق ادب بڑا جوکھم کا کام ہے۔حق اور جمال کی تلاش کرنا ہےتو پہلے
انا کی کیچلی اتارو۔کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو۔پھر
دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے اور روشنی کتنی سہانی اور پانی کتنا لطیف ہے۔''
(۸۴)

اس اقتباس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ تحریک کا مقصد مروجہ روایات سے انحراف اور نئے رجحانات کا استحکام تھا اور ترویج وترسیل کے ساتھ ادب کمٹمنٹ کو عام کرنا تھا۔ دراصل یہ نظریہ ادب میں صحت مند تصور کا پیغام تھا اس لئے دیکھتے ہی دیکھتے پورا برصغیر اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ بالآخر قمر جمالی نے حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کے استحکام کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کی ہمہ گیریت ومقبولیت پر روشنی ڈالی ہے۔الغرض قمر جمالی نے ترقی پسند تحریک کے نظریات ومقاصد سے بھرپور آگہی رکھتے ہوئے وہ قاری کے معلومات میں مزید اضافہ کرنے اور اس کی وسعت نظر کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ادبی مطالعے

ماس میڈیا میں عورت کا رول، ریڈیو ڈرامہ میں خواتین کا حصہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے حوالے سے

قمر جمالی کا ایک مضمون ''ماس میڈیا میں عورت کا رول، ریڈیو ڈرامہ میں خواتین کا حصہ'' کے عنوان کے تحت ہے جو نہایت ہی اہم ہے۔اس ضمن میں سب سے پہلے انہوں نے اس مرداساس سماج میں عورت کے مقام اور اس کے حقوق پر روشنی ڈالی ہے مختصراً یہ کہ تاہم اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسوی صدی کی ابتداء میں عورت نے خود کو سمجھنے کی شعوری کوشش کی سب سے پہلے برطانیہ میں عورتوں کے حقوق کے لئے ۱۷۹۰ء میں میری والسٹون کرافٹ کا آواز اٹھانا اور عورت کی محکومیت، عورت کے تشخص کی لڑائی کرنا، بعدازاں بدلتے حالات نے ہندوستان میں بھی عورتوں کے حالات بہتر ہوئے۔ بالخصوص آل انڈیا ویمنس کانفرنس میں عورتوں کی شخصی آزادی، ان کے تعلیمی حقوق، مزدور عورتوں کے حقوق وغیرہ کو بحث بنایا گیا اور عورت کو خس وخاشاک سے اٹھا کر مسند عزوتمکنت پر بٹھانے

کی شعوری کوشش ہوئی۔ یہ شعوری کوشش کی ابتدا ماس میڈیا کے ذریعے ہوئی جس کے تعلق سے قمر جمالی یوں رقم طراز ہیں:

''عورت کی اپنی لڑائی ابتداء میں پرنٹ میڈیا سے شروع ہوئی جو ماس تک اپنے پیغام پہنچانے کا ذریعہ بنی۔یعنی رسالوں اور کتابوں کے ذریعے آہستہ آہستہ اخباروں ریڈیو، ٹی وی کے ذریعے اپنی بات عوام الناس تک پہنچانے پر قدرت حاصل ہوگئی۔ ماس میڈیا میں اخبار کے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی بے حد طاقتور رابطے ہیں۔'' (۸۵)

مزید انہوں نے زیر نظر مضمون میں ہندوستان میں ڈرامے کی ابتداء، ریڈیو ڈرامے کی تعریف، اور ریڈیو سے نشر ہونے والے ڈراموں کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔جس کی وضاحت کرتے ہوئے مضمون نگار نے ریڈیو ڈرامے کی ہیئت اور پابندیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں ریڈیو ڈرامے کی تعریف پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''ریڈیو سے نشر ہونے والے ڈرامے کو ریڈیائی/ ریڈیو ڈرامہ کہا جاتا ہے۔ ایسے ڈرامے جو آواز کے ذریعے قوتِ سماعت پر اثر انداز ہوتے اور انسانی ذہن کو متاثر کر کے اس میں تحریک عمل کارکردگی اور جدوجہد کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے کہلاتے ہیں۔'' (۸۶)

قمر جمالی نے ریڈیو ڈرامے کی ہیئت اور ضروریات کے تعلق سے تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ریڈیو ڈرامے کی ضروریات میں جس کا دوسرا اہم حصہ مکالمہ ہے کیوں کہ ڈرامہ مکالمے کی ذریعہ ہی آگے بڑھتا ہے۔ چونکہ پورے ڈرامے کی تشکیل آواز پر مبنی ہوتی ہے اس لئے ڈرامے میں مکالمے کی حیثیت کو دیگر ڈراموں کے مقابلے میں اولیت حاصل ہے۔اس ضمن میں مضمون نگار نے ریوتی شرما کے ایک اقتباس پر روشنی ڈالی ہے چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

''ریڈیائی ڈرامے کے مکالمے لہجے کے اعتبار سے زیادہ فطری ہوتے ہیں۔ ان میں دبے لہجے کے الفاظ (Under Tunesدھیمی خود کلامی (Low

(Soliloquies) اور ادھورے الفاظ، جذباتی ردعمل کو ظاہر کرنے والے بے لفظ آوازیں (Word less sound) اور سانسوں کی ابھرتی گرتی آوازوں کے لئے خوب گنجائش ہوتی ہے جو ہماری روزمرہ کی جذباتی گفتگو کا بہت اہم صوتی حصہ ہوتی ہیں۔''(۸۷)

اس اقتباس کا خلاصہ ہے کہ مکالمے فطری انداز اور اس کی ادائیگی کی خوبی ہی ریڈیو ڈرامے کا اصلی حسن ہے اور یہی خوبی اسٹیج ڈرامے ممیّز کرتی ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے کے مکالموں کو سادہ عام فہم، شیریں اور کردار کی ذہنی سطح سے مطابقت رکھنے والے ہونا ضروری ہے۔

آگے انہوں نے ہندوستان میں ریڈیو ڈرامہ کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی، جس کی معلومات فراہم کراتے ہوئے مختلف دلائل و بیانات کی روشنی میں ریڈیو ڈرامے کی ابتداء کے متعلق جناب رفعت سروش کا ایک مضمون ''ریڈیائی ڈرامہ ایک جائزہ'' کا جائزہ لیا ہے جس میں انہوں نے لکھا:

''سید ذوالفقار علی بخاری کو ریڈیائی ڈرامے کا باوا آدم کہا جائے تو غلط نہیں۔ ۱۹۲۵ء میں بخاری صاحب اپنے وطن پشاور سے بہ سلسلہ ملازمت شملہ میں آبسے، فوجی ملازمت تھی اور ان کا عہدہ تھا ''ممبر آف بورڈ اکزامز'' کا وہ انگریز افسروں کو اردو اور فارسی پڑھانے پر مامور تھے۔ ڈرامے سے انہیں فطری لگاؤ تھا۔ انہوں نے شملہ میں بھی اپنی تھیٹر کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔''(۸۸)

خلاصہ گفتگو یہ کہ بخاری صاحب نے آل انڈیا ریڈیو میں براڈ کاسٹنگ شروع ہونے سے پہلے قدم رکھا اس لئے انہیں باوا آدم یا بنیاد کا پتھر کہنا حق بجانب ہے۔ بعد ازاں ۱۸۔ علی پور روڈ دہلی میں A.I.R کا دفتر اور اسٹوڈیوز قائم ہوئے اور جنوری ۱۹۳۶ء میں دہلی ریڈیو سے نشریات شروع ہوئے۔ جس پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

قمر جمالی حیدر آباد کی نثر نگار اور حیدر آباد میں ریڈیو ڈرامہ کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے موضوع حیدر آباد میں ریڈیائی ڈرامہ میں خواتین کا حصہ پر روشنی ڈالی ہے۔ خلاصہ گفتگو یہ کہ زیرِ نظر مضمون میں اس موضوع کے متعلق مصنفہ نے معلومات جمع کرنے کی کوشش کی تو انہیں نہ ہی کوئی تذکرہ، نہ کوئی ریڈیو ڈرامے کا مجموعہ

اور نہ ہی ریڈیو ڈرامہ پر کوئی جامع کتاب دستیاب ہوئی۔کئی کوششوں کے بعد انیس معین الدین امیر صاحب کا تحقیقی مقالہ ''حیدرآبادی مصنّفین کے ریڈیائی ڈرامے'' کتاب دستیاب ہوئی جس کے مطالعے کے بعد مصنفہ ان کے اس تحقیقی مقالہ پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''یہ مقالہ ۱۹۸۷ء میں تحریر کیا۔تب سے لیکر آج تک درمیان میں ایک طویل عرصہ حائل ہیعلاوہ ازیں معین الدین امر صاحب نے کتاب کے صفحہ نمبر 239 پر لکھا کہ جیلانی بانو کا ڈراموں کا مجوعہ ''اکیلا'' زیر طبع ہے۔مگر ہزار کوشش کے باوجود سوائے راقم الحروف کا مجموعہ ''سنگ ریزے'' نے کے علاوہ کوئی اور کتاب دستیاب پیش ہوئی۔'' (۸۹)

جناب معین الدین امر صاحب نے اپنے مقالے کے اختتام پر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر شدہ ڈراموں کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔

یہ فہرست ۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۳ء کا احاطہ کرتی ہے۔اس طویل فہرست میں صرف (۱۴) ڈراموں کے نام درج ہیں جنہیں خواتین نے لکھا۔قمر جمالی اس فہرست پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ اس فہرست کے علاوہ میرے بہت سارے ڈرامے نشر ہوئے۔

قمر جمالی موضوع کے متعلق مزید مواد کے لئے اپنی تحقیق جاری رکھتے ہوئے انہوں نے چند اہم شخصیتوں سے ٹیلی فون پر انٹرویو کیئے۔جن میں جیلانی بانو، جناب منظور الامین صاحب اور جعفر علی خاں صاحب شامل ہیں۔قمر جمالی تحقیق کے دوران جیلانی بانو سے سوال کیا تو نہیں میں جواب آیا۔پھر انہوں نے جناب منظور الامین صاحب سے سوال کیا کہ کیا کوئی ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ مرتب ہوا ہے تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے (۳۷) ڈراموں کے نام گنوائے اور کہا کہ ہندوستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوئے ہیں لیکن آپ کا موضوع صرف حیدرآباد آل انڈیا ریڈیو تک ہی محدود تھا۔پھر آخر کار انہوں نے جعفر علی خان صاحب سے فون پر بات کی۔موصوف اپنی عملی زندگی کی شروعات ہی آل انڈیا ریڈیو سے کی اور وہیں سے وظیفہ، حسین خدمت سبکدوش ہوئے۔جب ان سے حیدرآباد میں ریڈیو ڈرامہ نگار خواتین کے نام دریافت کیئے تو انہوں نے بلا جھجھک کہا جس کے تعلق سے وہ یوں قلم بند کرتی ہیں:

''خواتین میں صرف تین نام ۔ رفیعہ منظور الامین اور قمر جمالی اور کبھی کبھی
جیلانی بانو صاحبہ ویسے مردوں میں اچھے ڈرامے لکھنے والوں کی تعداد بہت
زیادہ ہے۔اپنے اس دور کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ۷۵
ءتا ۸۵ حیدرآباد ریڈیو ڈراموں کے حوالے سے زرین دور رہا ہے اور یہ دور
تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔''(۹۰)

مندرجہ بالا حوالوں کے زیر اثر قمر جمالی یہ کہنے کی جسارت کرتی ہے کہ ریڈیو ڈرامہ پر خواتین قلمکاروں کی توجہ بہت کم رہی ہے سوائے تین ڈرمہ نگاروں کے جن میں محترمہ پدم شری جیلانی بانو محترمہ رفیعہ منظور الامین اور خود قمر جمالی کے کوئی اور نام ریکارڈ میں نہیں ملتے۔مضمون نگار نے مزید اس بات پر زور دیا ہے کہ نشری ڈراموں کا مجموعہ سنگریزے ۱۹۹۳ء مطبوعہ کے علاوہ آندھرا پردیش اور حیدرآباد میں مصنفہ (قمر جمالی) کے علاوہ فی الحال خاتون ڈرامہ نگار کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔

اردو ڈرامہ اور منجو قمر کی خدمات:

قمر جمالی کا ایک مضمون ''اردو ڈرامہ اور منجو قمر'' کی خدمات پر نہایت اہم ہے۔اس مضمون میں قمر جمالی نے ڈرامہ کا مفہوم اور ڈرامے کی مختلف تعریفیں ڈرامے کے اجزائی ترکیبی ، اردو ڈرامے کی تاریخ اور ڈرامے کے آغاز وارتقاء اور اردو کے مشہور ڈرامہ اور ڈرامہ نگار پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے ڈرامے کی ارتقاء میں پارسی تھیٹروں نے جو اہم کردار ادا کیا ہے اس کا جائزہ پیش کیا ہے۔

مضمون نگار نے منجو قمر کو آغا حشر کاشمیری کے دور کے اہم ڈرامہ نگار قرار دیتے ہوئے آغا حشر کاشمیری اور منجو قمر میں مماثلتوں کا اظہار کیا ہے۔ان مماثلتوں کے باوجود منجو قمر کو وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جو آغا حشر کاشمیری کو فن ڈرامہ نگاری میں حاصل ہوا۔اس کو بیان کرنے کے لئے مضمون نگار نے رفعت سرورش کا ایک اقتباس پیش کیا ہے ملاحظہ ہوں:

''آغا حشر نے بہت سی کمپنیوں کے لئے ڈرامے لکھے۔خود ہی کمپنی قائم کی اور
اردو ڈرامے کو عروج کی انتہائی منزل تک پہنچادیا۔اس دور میں آغا حشر ماہ

کامل کی طرح آسمانِ ڈرامہ پر جگمگار ہے تھےاور باقی سب ڈرامہ نگاران کی موجودگی میں جھلملاتے ستاروں کی طرح تھے۔۱۹۳۰ء میں فلم کی آمد سے پارسی تھیٹر کو دھچکا سالگا اور منظر نامہ بدلنا شروع ہوا۔۲۸/اپریل ۱۹۳۵ءکو آغا حشر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے مگر ایک ایسی جگہ بنا کر کہ اردو ڈرامے کے ساتھ ان کا نام اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ اردو ڈرامہ باقی ہے۔''(۹۱)

مضمون نگار نے اس مضمون میں منجو قمر کی ادبی اثاثے اور تھیٹر کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اپٹا IPTA یعنی عوامی تھیٹر کے قیام وعمل اور جس کے زیر نظر انجمن ترقی پسند مصنّفین کے مشہور ومعروف جن ادیبوں نے ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھے پھر اسٹیج کا رخ کیا ان کا جائزہ پیش کیا ہے۔منجو قمر کی ڈرامہ نگاری اورفن پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''موصوف ساری عمر صنف ڈرامہ کے زلف سنوارتے رہے تادم حیات ، صرف چار سال قبل تک جب انہوں نے ترک دنیا نہ کی اسی مسلک سے جڑے رہے یعنی اپنا پہلا ڈرامہ ''آفتاب دمشق'' (جسے اکسلیسر تھیٹریکل کمپنی نے ۱۹۳۲ء میں پیش کیا) سے لے کر ۱۹۷۹ء میں ترک دنیا کرنے تک (تاریخ وفات ۱۰/جون ۱۹۸۳ء) ۲۹ ڈرامے ادبی دنیا کو دیئے جو ایک معرکتہ الآرا کا کام ہے۔ڈاکٹر حبیب نثار کا منجو قمر کو''فلک ڈراما کا قمر'' کہنا حق بجانب ہے۔''(۹۲)

قمر جمالی منجو قمر کی فن ڈرامہ نگاری ان کی خدمات اوران کی شخصیت کے حوالے سے ان کی ڈرامہ نگاری کے متعلق اپنے خیالات وتاثرات کو بھر پور انداز میں یوں بیان کرتی ہیں۔

''منجو قمر کی تصنیفات کو پڑھ کر دل میں ایک کسک،ایک درد کا احساس ہوتا ہے کہ دنیا نے انہیں وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق ہیں۔یا پھر اس میں ان کی اپنی انانیت کا دخل ہے جسے انہوں نے خودداری کا نام دیا۔کیوں کہ ایسا نہیں

تھا کہ خدا نے انہیں مواقع نہیں دیئے بلکہ بار بار دیئے مگر انہوں نے دو قدم
چل کر انہیں اپنایا نہیں بلکہ اپنے مقام پر ساکت کھڑے رہے یا پھر ان کی اپنی
طبیعت کی سادگی، اپنے وجود اور رتبے سے انکار، انکساری، یا ضرورت سے
زیادہ قناعت پسندی کا دخل تھا۔ محترم نے زندگی کو ویسا ہی لیا جیسے وہ ان کے
قریب آئی۔ سارے سجانے سنوارنے کے لئے کبھی اوروں کے مرہون منت
نہیں رہے۔ اب اسے ان کی اچھائی سمجھیں یا ان کی خاندانی سادات پسندی
کہ انہوں نے وہی کیا جو ان کے دل نے کہا۔ دماغ کے دلائل ان کے لئے
بے معنی رہے۔‘‘(۹۳)

الحاصل یہ ہے کہ قمر جمالی اس مضمون میں اردو ڈرامے کی روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے منجو قمر کی خدمات کے ذریعہ یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اردو ڈرامے کے فروغ میں منجو قمر کا بھی حصہ ہے ہر ایسے نابغہ روزگار مصنف کو ادبی دنیا نے بڑی آسانی سے فراموش کر دیا جس کی شکایت کرتے ہوئے مضمون نگار نے فراموش کردہ نابغہ روزگار ڈرامہ نگار کی خدمت میں سلام پیش کیا ہے۔

مولانا آزاد۔صحافتی زندگی کے آئینے میں:

قمر جمالی کا ایک مضمون ’’مولانا آزاد۔صحافتی زندگی کے آئینے میں‘‘ کے عنوان سے قائم گیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے مولانا آزاد کے خیالات کی روشنی میں ان کی زندگی کی بعض اہم پہلوؤں پر اظہار خیال کیا کرتے ہوئے انھوں نے مولانا کے بچپن، جوانی اور بڑھاپے تینوں ادوار کی روشنی میں ان کی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ اس تعلق سے وہ لکھتی ہیں:

’’مولانا بیک وقت مختلف صفات کا مجموعہ ہیں۔ لہٰذا ان کی ہمہ جہت و ہمہ گیر
شخصیت کو سمجھنے کے لئے ہم نے اپنے طور پر ایک درمیانی راستہ منتخب کیا ہے۔
یعنی مولانا کو بحیثیت انسان ادوار زندگی کے پس منظر میں دیکھیں: یعنی:
بچپن............جوانی............اور بڑھاپا

مگر یہاں بھی ایک دقت حائل ہوتی ہے اور مولانا کی حیات ایک پہیلی بن جاتی ہے۔ دراصل مولانا کے بچپن کو جوانی سے اور جوانی کو بڑھاپے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے مولانا کی طبعی عمر اور ذہنی عمر میں اس درجہ تفاوت تھا کہ ان کا طبعی بچپن درحقیقت ذہنی شباب تھا۔''(۹۴)

قمر جمالی نے مولانا کی آزاد کی ولادت، تعلیم وتربیت، بچپن، ادبی زندگی کا آغاز اور تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور ان کی ازدواجی زندگی، جدوجہد آزادی کے لئے ان کی کوشش وغیرہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ قمر جمالی اپنے مضمون میں مولانا ظفر احمد نظامی کے مضمون تحریک آزادی اور مولانا آزاد کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ مولانا نے اپنے اخبار میں لکھا:

''میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کرے۔ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں کہ ان کی سینہ کوبی کے شور سے کشتگان خوابِ موت سے ہوشیار ہو جائیں۔''(۹۵)

اس اقتباس کے حوالے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے ایک با قاعدہ مہم کی ضرورت ہے۔ جس کے لئے ان کا خیال تھا کہ اخبار سے اچھا اور کوئی ہتھیار ہو نہیں سکتا۔

الغرض میدان صحافت سے مولانا کا تاحیات ساتھ رہا۔ مولانا نے بچپن ہی سے اپنی ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ صحافتی زندگی کا بھی آغاز کیا۔ یعنی بیک وقت وہ شاعر اور صحافی کہلائے۔ مولانا مختلف رسالے جاری کئے ۔مگر لسان الصدق کی مقبولیت کے بعد ہندی مسلمانوں کا مشہور ادارہ انجمن حیات الاسلام کی دعوت پر مولانا لاہور پہنچ کر تقریر کرنا اور لاہور کے قیام کے دوران مولانا آزاد کی عظیم شخصیتوں سے ملاقات کے ذکر پر قمر جمالی نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا آزاد کی شبلی سے ملاقات کے بارے میں بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی سے مولانا ابوالکلام آزاد ممبئ میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی کہ ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا۔ مولانا شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لے آئے اور ایک زمانے تک ان کو پاس رکھا۔ وہ ان کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہے اور اپنی مستثنٰی فطری

صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے گئے۔''(۹۶)

مولانا کی صحافت کا دور ۱۹۰۰ء سے شروع ہوکر ۱۹۲۷ء میں ختم ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد آپ مکمل سیاست سے رجوع ہوگئے۔ ان (۲۰) سالوں میں مولانا جن اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے ان کی تفصیلات فراہم کراتے ہوئے ان کی مشہور مقبول سیاسی جریدے الہلال، البلاغ کی کارکردگیوں کی وجہ سے ان کے یہ سیاسی جریدے ضبط کئے گئے، جس کے نتیجے میں انہیں قید وبند کی صعوبتیں سہنی پڑیں، جس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ الہلال کے ذریعے مولانا نے کھلے عام مسلمانوں کو بیدار کرنے کا جو بیڑہ اٹھایا اور انہیں جھنجھوڑنے کی کوشش کی جس کو الہلال کے شمارے میں مولانا نے مسلمانوں سے خطاب کیا جس کے تعلق سے وہ لکھتی ہیں:

''ہندوؤں کو ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا حب الوطنی ہے مگر آپ کے لئے فرض اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق صداقت انسانی بند واستبداد اور غلامی کو توڑنے کے لئے کی جاتی ہے۔ پس اٹھ کھڑے ہو کہ خدا اب تم کو اٹھانا چاہتا ہے اور اس کی مرضی یہی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہیں بیدار ہوں اور اپنے فراموش کردہ جہاں کو زندہ رکھیں۔''(۹۷)

الغرض مولانا بنیادی طور پر نڈر اور بیباک صحافی تھے۔ لکھنے میں وہ ماہر تھے مگر مولانا کے لئے لکھنا صرف اظہار کا ذریعہ نہیں تھا بلکہ ان کے لئے قلم ہتھیار تھا اور الہلال جنگ کا میدان الہلال مولانا کی سیاسی زندگی کی اہم ترین کڑی اور اردو صحافت کا اہم ترین سنگ میل ثابت ہوا۔

مضمون نگار نے مولانا کی سیاسی زندگی اور گاندھی جی سے آپ کی پہلی ملاقات کانگریس کی صدارت ۱۹۴۷ء سے وفات تک آپ کا انٹریم گورنمنٹ میں وزیر تعلیم کے عہدے پر فائز رہنا وغیرہ کی مختلف دلائل وبیانات کی روشنی میں تفصیلات فراہم کراتے ہوئے تقسیم ہند اور عدم تعاون تحریک کے سلسلے میں مولانا نے جو خدمات انجام دیں ان کا جائزہ پیش کیا ہے۔ عدم تعاون تحریک کی وجہ سے مولانا کے خلاف انگریزوں نے ایک مقدمہ قائم کیا تو آپ نے اس مقدمے کی سماعت کے دوران میں ایک بیان دیا جس کے تعلق سے ان کا ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:

''انسان کی اس دنیا میں عجیب کیفیت ہے۔ ماننے پر آئے تو سامری کے

بچھڑے کو خدا مان لے اور انکار پر آئے تو حضرت عیسیٰ جیسے پیغمبر کو سولی کی
طرف لے جائے ہر دو فعل منطق سے عاری ہیں۔''(۹۸)

بالآخر مضمون نگار نے مولانا آزادی کی بیماری اور انتقال وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا آزاد کی شخصیت کے تعلق سے چند مثالیں پیش کرتے ہوئے اپنے تاثرات بیان کی ہے۔ چنانچہ وہ یوں رقمطراز ہیں:

''بہر حال مولانا آزادی کی مثال
اُس سپاہی جیسی رہی......جس کے ہاتھ میں ہتھیار کی جگہ قلم تھا
جو صحافت کے گھوڑے پر تمام عمر ہندوستان کی غلامی کے خلاف جہاد کرتا رہا۔
ایک پرندے کی سی تھی......جس کی قوت گفتار اس کی ادبیت ،قوتِ پرواز ،اس کی صحافت
تھی اور جو ہندوستانی عوام کو غلامی کی نیند سے بیدار کرنے کے لئے مسلسل نغمہ سرا رہا۔
ایک ایسے بشر کی سی تھی......جس کے خدوخال کے بارے میں رشید احمد صدیقی نے کہا:
جب کبھی ابوالکلام کے سراپا کا خیال آتا ہے ،ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ازمنہ قدیم میں
یونان کے کئی رزمیہ نگار مصروف کار ہوں۔ اپنے زمانے اور اپنے دیار میں مولانا یونانی
دیوتاؤں سے کم تھے۔ ایک ایسے خطیب کی سی تھی...........جس کے بارے میں ڈاکٹر
کسیکر (Dr. Kecskar) نے کہا
''میں نے آج تک ایسا مقرر نہیں دیکھا جس کی زبان میں مولانا کی زبان
سے زیادہ مٹھاس ہو۔ مجھے کئی بار انہیں سننے کا موقع ملا اور ہر بار یہی محسوس کیا
کہ وہ کسی موضوع پر بول رہے ہوں زبان ان کی تابع ہو جاتی ہے۔''(۹۹)

مختصراً یہ کہ اس اقتباس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عشق انسان کی بقاء کا ضامن ہے۔ مولانا نے بھی عشق کیا ، اپنی قوم سے ، اپنے وطن سے ، اسلام سے ، الحاصل یہ کہ قمر جمالی مولانا کی صحافتی زندگی کے آئینے میں انہوں نے آزادی کی جدوجہد کے لئے جو خدمات انجام دیں ان سب کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

فریدہ زین کا تخلیقی سفر۔فسانے سے حقیقت تک:

قمر جمالی نے ایک مضمون ''فریدزین کا تخلیقی سفر فسانے سے حقیقت تک'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ

مضمون ۹ رستمبر ۲۰۱۳ء کو لکھا گیا۔ جو ماہنامہ سب رس میں مئی ۲۰۱۴ء کو شائع ہوا۔ قمر جمالی نے اس مضمون کی ابتداء احادیث کی روشنی میں ایسے دلچسپ جملوں میں بیان کیا ہے کہ جس کو پڑھنے کے بعد قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے بلکہ یہ دلچسپی قاری کو مکمل مضمون کے مطالعے کی جانب راغب بھی کرتی ہے۔ آگے انہوں نے قرآنی کلمات واحادیث کی روشنی میں فریدہ زین کی زندگی اوران کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ فریدہ زین کو انہوں نے زندگی بھر ہر معاملے میں حضرت عمر بن میمونؓ سے منقول اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے پانچ چیزوں کو پانچ سے پہلے غنیمت جانو کے اس حدیث پر کاربند پایا ہے۔

چنانچہ زیرنظر مضمون میں قمر جمالی نے فریدہ زین سے ان کی شخصی ملاقات کے ذکر پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کے مطالعے کے بعد فریدہ زین کے ساتھ ساتھ مصنفہ کے حالات وجذبات کا برملا اظہار بھی ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''میں نے فریدہ کو اُس وقت دیکھا جب میں خود ادب کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکراتے، ریگزاروں پر ننگے پاؤں چلتے، آبلہ پائی کی لذت سے سرشار محوسفر تھی۔ ہم دونوں ایک ہی منزل کے راہرو تھے۔ مگر کچھ فاصلے سے چلتے رہے۔ ہاں مگر اس وقت تک فریدہ ادب کی شاہراہ پر ایک دو قندیلیں روشن کر چکی تھیں۔'' (۱۰۰)

آگے مضمون نگار نے فریدہ زین کی ادبی زندگی کا آغاز اور صنف افسانہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد اور تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کا ذکر نہایت ہی پُراسلوب انداز میں بیان کیا ہے جس کے متعلق اقتباس کو دیکھیں:

> ''ان کہانیوں میں بس محبت ہی محبت ہے ہر جگہ اور ہر روپ میں شاید یہ اس لئے بھی کہ محبت فطری جذبہ ہے جو ہر شخص پیدائش سے اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے جبکہ نفرت اکتسابی ردعمل ہے یہاں پہنچنے تک بھی فریدہ کے اندر ایک معصوم اور پاکیزہ قلمکار بیٹھی ان سے عشق کے صادق جذبوں کی عکاسی کرواتی رہی ہے۔ فریدہ کے جذبوں میں نہ ہی نفرت ہے اور نہ بغاوت'' (۱۰۱)

قمر جمالی نے فریدہ زین کے افسانوں کو (۲) زمروں میں تقسیم کیا ہے ابتدائی دو مجموعوں ''سسکتی چاندنی'' اور ''دل سے دار تک'' کے افسانوں میں ہر مبتدی کی طرح فریدہ کے افسانے بھی رومانی فضا کے اسیر ہیں۔قمر جمالی، ان کے دونوں مجموعوں کے حوالے سے ان کی افسانہ نگاری کی موضوعات بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔اور ساتھ ہی ان کے دوسرے دور میں لکھے گئے افسانوی مجموعوں کے موضوعات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا جائزہ پیش کیا ہے۔مثلاً وہ لکھتی ہیں:

> ''فریدہ زین کے دوسرے مجموعے، گردش دوراں، دھرتی کا دکھ،اک حرف تمنا اور جہان رنگ و بو کے موضوعات میں بلا کا تنوع اور ذہنی انتشار سے اٹھنے والے کرب نے فریدہ سے ایسے موضوعات پر قلم اٹھوایا جن میں جاں گسل جذبوں کی بے زبان، خاموش سلگتی زندگیاں، بدلتے اقدار کے ٹوٹنے کا غم ،سربستہ رازوں کے افشا ہونے کا خوف،انسانیت کے جذبے کا تحفظ،نکبت وافلاس کا ماتم غرض جو بھی لکھا جہدِ حیات کی تعبیر لکھا۔'' (۱۰۲)

مضمون نگار نے فریدہ زین کی افسانوں کی کردار نگاری اور ان کے چند افسانوں کے کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے تاثرات وجذبات کو پیش کرتے ہوئے ان کے افسانوں کی تکنیک ،اسلوبِ بیان اور علامات واستعارات کے استعمال پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خیالات کو ترتیب و مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

> ''دل گم گشتہ آپ بیتی ہے۔اختتام پر ''بائی پاس سرجری کے بعد'' لکھ کر فریدہ نے قاری کی ذہانت پر شک کیا ہے۔یہ افسانہ استعارات کی معراج ہے۔دل کے سارے جذبے متشکل ہو کر موجود ہوتے ہیں اور لوٹ جاتے ہیں سوائے ایک جذبے کے جس کا نام محبت ہے۔محبت اپنی ٹھنڈی میٹھی صورت کے لئے اس صنوبری شکل کے پھول کی حفاظت کرتی ہے جسے دل کہتے ہیں۔یہ افسانہ علامتی افسانہ کی معراج ہے۔اس میں فریدہ کا فن اظہار کی بلندی پر ہے۔''
> (۱۰۳)

فریدہ زین افسانہ نگاری میں ہی نہیں بلکہ تحقیق کے میدان میں بھی کمال کر دکھایا ہے۔ اگست ۲۰۱۳ء میں مختلف مذاہب میں عورت کی حیثیت ایک مطالعہ کے موضوع پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف فلاسفی یعنی پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا۔ قمر جمالی نے اس موضوع پر کامیاب مقالہ لکھنے کے لئے فریدہ زین اور ان کی رہبر و رہنما ڈاکٹر آمنہ تحسین کو بھی مبارکباد پیش کرتے ہوئے انعامات واعزازات اور آخر میں ان کی بیماری اور ملاقات کے واقعہ کا ذکر کیا ہے جو کہ مکالماتی انداز میں ہے ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:

''ابھی کچھ دن پہلے فریدہ کی صحت بگڑ گئی تھی۔ میں گئی تھی انہیں دیکھنے، پوچھا......

''کیا کہتا ہے دِل............؟''

''پیاسا ہو گیا ہے۔ خون پہنچ نہیں رہا ہے۔ بند ہونے کی دھمکی دے رہا ہے۔''

پھر فریدہ نے کہا کہ کسی کرم فرمانے انہیں کارنامہ حیات ایوارڈ حاصل ہونے پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

''کس پاگل نے تمہیں اس ایوارڈ کے لئے چنا، تمہارے لئے حیات ہی کیا کم تھی جو کارنامہ بھی سراہا گیا............''

چہ خوب......! وہ جو بھی ہیں واقعی انہوں نے جیوری کو بڑے اچھے خطاب سے نوازا

ہم دونوں اس لطیفے سے بہت محفوظ ہوئے اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔ پھر جب ہنستے ہنستے فریدہ نے کمزوری محسوس کی تو مجھے ایک حدیث یاد آئی جو حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے............

تفسیر، مسلمان کو جو بھی تکان، بیماری، فکر، غم اور تکلیف پہنچتی ہے حتیٰ کہ کانٹا بھی چبھتا ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

میں نے یہ نوید فریدہ کو سنائی اور دونوں بڑے مسرور ہوئے۔''(۱۰۴)

الغرض قمر جمالی نے اس مضمون کی ابتداء اور اختتام دونوں احادیث کی روشنی میں پیش کی ہے۔ اس

اقتباس کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فریدہ زین سے ملاقات کے واقعہ سے ہمیں مصنفہ کی شخصیت بھی واضح طور پر کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ مصنفہ نے بچپن ہی سے حالات سے ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ اور وہ آج ہمیں ایک کامیاب روشن مزاج بلند کردار کے طور پر ہمارے سامنے نظر آتی ہے۔

قمر جمالی کے سارے مضامین کے مطالعے سے بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ادبی دنیا کے ساتھ ساتھ انہیں مذہب سے بھی لگاؤ ہے اور ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔

انہوں نے صرف ادبی دنیا میں ہی اپنے جوہر نہیں دکھائے بلکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کا خیال رکھتے ہوئے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت، پختہ یقین، صبر وشکر اور توکل کے سہارے وہ اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کی ہے۔ وہی تعلیمات اپنے ساتھیوں اور قارئین کو دیتے ہوئے نظر آتی ہے۔

مضامین کا دوسرا حصہ ''انعکاس'' میں شامل مضامین:

زیر تحریر مقالہ میں مضامین کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ دوسرے حصے میں ،تبصروں اور دیباچوں کا مجموعہ ''انعکاس'' میں شامل چند منتخب مضامین ادب کا ایئر مارشل عاشق شاہ ۱۹۹۵ء، عکس عظمت ۱۹۹۸ء، عارف خورشید کا افسانوی سفر جولائی ۲۰۱۲ء، تحریم ناز اکتوبر ۲۰۱۲ء وغیرہ کا یہاں جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

عکس عظمت:

قمر جمالی تحقیقی وتنقیدی مضامین کے علاوہ ادبی شخصیات اور ان کی مجموعی تخلیقات پر مضامین لکھے ہیں۔ انہوں نے ایک مضمون ''عکس عظمت'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ ''زرین شعاعیں'' بنگلور سے ۳/۲۰۱۴ء قسط I، قسط II ۴/۲۰۱۴ء کو دو قساط میں شائع ہوا ہے۔ زیر نظر مضمون میں قمر جمالی نے حیدرآبادی تہذیب کی نمائندہ معزز خاتون، ممتاز شاعرہ عظمت عبدالقیوم کی کتاب ''عظمت غزل'' عظمت عبدالقیوم فن اور شخصیت ۲۵/ فروری ۱۹۹۸ء پر تفصیلی رشنی ڈالی ہے۔ مضمون کی ابتداء میں مصنفہ نے عظمت صاحبہ کی شخصیت کی منفرد نمایاں خصوصیات کا اظہار کیا ہے۔ بعد ازاں مصنفہ نے عظمت صاحبہ کو اپنی ماں تصور کرتے ہوئے ان سے جو عقیدت ومحبت اخلاص وحمیت اور اپنائیت ہے اس کا ذکر دل بھرے جذباتی انداز میں یوں لکھتی ہیں:

''میں محسوس کرتی ہوں کہ ان کی آنکھوں میں ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور میں اندر ہی اندر اُن کی طرف کھینچ رہی ہوں۔ میرے دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش تڑپتی رہتی ہے کہ ان سے لپٹ جاؤں، ان کی آغوش میں سما جاؤں اور کہوں ''اے ماں مجھے چھپا لو'' پھر...... نہ جانے کب، کون گھڑی میں ان کی ہوگئی۔ مجھے پتہ نہیں کیوں کہ کچھ عرصے سے جب بھی میں ان سے ملی ہوں مجھے لگا کہ میں اپنی ماں سے مل رہی ہوں۔اسی دن میں نے محسوس کیا کہ کتنی خواہش تھی میرے دل میں کچھ ان کے بارے میں کہنے کی اور کچھ اپنی سنانے کی۔''(۱۰۵)

اور انھوں نے عظمت صاحبہ کی ولادت، بچپن کے حالات، تعلیم و تربیت اور شادی وغیرہ کے حالات پر روشنی ڈالی ہے اور ساتھ میں ان کے شریک حیات جناب عبدالقیوم سے انہیں جو بے پناہ پیار و محبت اور عشق ہے جس کے متعلق ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''زرِ گل'' کے انتساب میں عظمتؔ صاحبہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنا اظہار خیال کیا ہے چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

''عشق تو میں نے کیا ہے۔اپنے شوہر سے۔ پہلے شادی پھر عشق کیا۔ وہ کہتی ہیں کہ انہوں نے ایک ایسی آسودہ زندگی گزاری کہ کبھی کوئی تشنگی اور ادھورے پن کا احساس باقی نہ رہا۔اور محبت کے قرینے انہوں نے اپنے شوہر عزیز سے سیکھے جن کے خلوص و اعتماد انہیں حوصلہ دیا۔ سچ تو یہ کہ خود عظمتؔ النساء کو''زرِ گل'' کی عظمت سے متعارف کروانے والے ان کے شوہر محترم جناب عبدالقیوم خان صاحب تھے۔''(۱۰۶)

آگے انہوں نے عظمت صاحبہ کا گھر کا ماحول اور شاعری و ادب سے لگاؤ کے متعلق ایک واقعہ پیش کیا ہے ۔ بعد ازاں قمر جمالی نے مضمون عکس عظمت میں عظمتؔ صاحبہ کا حلیہ، سیرت و کردار اور عادات و اطوار پر نہایت ہی خوبصورت انداز میں روشنی ڈالتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں:

''میں نے پہلی بار جب انہیں دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی تھی وہ ایک مشرقی

سہاگن کا روایتی نمونہ تھیں۔ سرخ وشفاف رنگت، ہونٹوں پر پان کی سرخی ،ہاتھوں میں لباس کی مناسبت سے باریک نگول والا چوڑیوں کا جوڑا۔ وہ ایک دیوان پر مخملی گاؤتکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ سامنے ایک بڑا سا چاندی کا پاندان رکھا تھا۔ یہ میں آج کی عظمت کا ذکر نہیں کررہی ہوں۔ آج سے دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔'' (۱۰۷)

آگے قمر جمالی نے ان کے ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شاعری کے خصوصیات کا ذکر کیا ہے ۔غرض یہ کہ مصنفہ عظمت صاحبہ کی فن شاعری کا مطالعہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی نظر میں پڑھا ہے اور انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے آسان پُراثر زبان کا استعمال کرتے ہوئے ایک دلکش اور سادہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں ایک جدت وندرت اور خوبی نظر آتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے عظمت صاحبہ کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

''میرے کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آپ کے اشعار میں نکیلا پھبیلا پن، محبت کا بانکپن ہی ہے، نہیں بلکہ متانت اور سنجیدگی تو عظمت صاحبہ کی غزل کا خاصہ ہے۔ عظمت صاحبہ کی غزل کو بھی رومانیت سے مبرّا نہیں کہا جاسکتا، ہاں مگر رومانی کیفیت عام سطحیت سے اوپر ہے اور آپ نے متانت اور سنجیدگی کو کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔'' (۱۰۸)

الغرض جمالی نے مضمون عکس عظمت میں عظمت صاحبہ کی شخصیت وفن کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ خلاصۂ گفتگو کہ عظمت صاحبہ کے چار شاعری کے مجموعے منظر عام پر آکر مقبول ہوچکے ہیں۔ آپ کا پہلا مجموعہ ' زرگل' ۱۹۶۴ء، دوسرا 'سفروسحر (نعتیہ کلام)، تیسرا 'رگ گل'، چوتھا 'عظمت وطن'، جو قومی نظموں پر مشتمل ہے۔ ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''رگ گل'' کے لئے اتر پردیش سے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ اور اردو اکاڈمی حیدرآباد نے بھی انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔ قمر جمالی 'رگِ گل' کے متعلق یہ بات آشکار کرنا چاہتی ہیں کہ عظمت صاحبہ اس کتاب کو اپنے مرحوم بھائی نواب شوکت علی خان کے نام منسوب نہیں کیا ہے بلکہ غموں کے نام معنون کیا ہے اور نہوں نے اس مجموعہ کی خصوصیت پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کی اس مجموعے کی کم وبیش ساری غزلوں کا مطلع لفظ غم سے تعبیر ہے۔ مزید

انہوں نے عظمت صاحبہ کو ۱۹۶۱ء میں ادبستان کرنول کی طرف سے آپ کو ''عظمت غزل'' کے خطاب سے نوازے جانے اوران کا پہلا شعری مجموعہ ''زرگل'' میں شامل (۱۸) نظموں میں سے چند نظموں کا اختصار سے جائزہ لیتے ہوئے صنف نظم میں عظمت صاحبہ کی زبان کو بے حد نرم اور احساسات کی گداز قرار دیا ہے۔

قمر جمالی نے زیر نظر مضمون میں عظمت صاحبہ کی شاعری کے علاوہ ان کی نثر نگاری پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے ان کے چند بہترین مضامین کے عنوانات درج کی ہیں۔ المختصر ان کے مضامین کی خاص بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ آپ کے مضامین میں ایک خالص مشرقی عورت کا دل دھکڑتا محسوس ہوتا ہے اور قمر جمالی کو عظمت صاحبہ کا نثری اسلوب شعری اسلوب سے مختلف نظر نہیں آتا۔

بالآخر قمر جمالی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے اربابِ مجاز کی نظر عظمت صاحبہ کی تخلیقات کی طرف توجہ نہیں دی گئی جب کہ ان کی تخلیقات تحقیق کے مستحق ہیں۔ قمر جمالی کے خیال میں عظمت صاحبہ کی تخلیقات پر توجہ نہ دینے سے عظمت صاحبہ کی شخصیت ادھوری رہ جانے اور تحقیق کا ایک باب نامکمل رہ جانے کا شکوہ کیا ہے۔ غرض زیر نظر مضمون میں مصنفہ نے عظمت عبدالقیوم سے اپنی عقیدت ومحبت کا برملا اظہار اور ان کے شعری ونثری خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی پوری تخلیقات پڑھ کر ان کی پذیرائی کی ہے اور کہیں کہیں قمر جمالی نے تمہید ذا لمبی باندھی ہے۔

عارف خورشید کا افسانوی سفر

قمر جمالی عصر حاضر کی افسانہ نگاروں میں نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے ان کے ہم عصر افسانہ نگار عارف خورشید کے مجموعی تخلیقات پر ایک مضمون ''عارف خورشید کا افسانوی سفر'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ یہ مضمون ۲۷ رمئی ۲۰۱۲ء کو لکھا گیا جو عالمگیر ادب اورنگ آباد۔ دکن کتابی سلسلہ نمبر ۳، عارف خورشید۔ فن اور شخصیت ، جولائی ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون عارف خورشید کی شخصیت اوران کی خدمات پر نہایت ہی اہم ہے کیونکہ قمر جمالی نے عارف خورشید کے تخلیقات ہی کے روشنی میں ان کی شخصیت کو اجاگر کرنے ہی کی کوشش کی ہے۔ مثلاً انہوں نے انہیں ایک Versatile رائٹر قرار دیتے ہوئے ان کی اپنی کتاب '' قافلے والوں سچ کہنا'' کے پیش لفظ میں ان کا لکھا ہوا اعتراف پر روشنی ڈالی ہے جس میں ان کا فن اور شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔

قمر جمالی نے مصنف کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے تخلیق کی تعریف کی ہے اور محبت کے بغیر تخلیق کرنا ناممکن قرار دیا ہے۔قمر جمالی کے خیال میں کوئی بھی تخلیق محبت کے جذبات سے خالی ہوکر فن پارہ نہیں بن سکتا کیوں کہ محبت کے کوکھ سے ہی تخلیق جنم لیتی ہے اوراس کائنات کی اساس، تخلیقِ کائنات کی وجہ اور انسان سے انسان کا ٹکراؤ محبت ہی تو ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ محبت کے افہام وتفہیم میں اتنی وسعت ہوئی کہ قاری اور قلمکار دونوں تجربہ کاراور حقیقت پسند ہوگئے۔ چنانچہ قمر جمالی نے انہیں بالغ النظر افسانہ نگاروں میں جناب عارف خورشید کو شمار کرتی ہیں۔آگے انہوں نے اس مضمون میں عارف خورشید کے افسانوں کے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔جس سے قمر جمالی کے عالمانہ خیالات پر بھی روشنی پڑتی ہے ملاحظہ کیجئے:

''انہوں نے صرف ایک ہی موضوع کو جوزن وشو کے داخلی معاملات سے متعلق ہیں۔ بڑے تنوع سے پیش کیا ہے۔تقریباً سبھی کہانیاں کائنات کے اس رمز کے اطراف گردش کرتی ہیں جس کے لئے خدائے بزرگ وبرتر نے یہ کائنات تخلیق کی۔

یعنی

تخلیق آدم

اور

آدم کی پسلی سے حوّا کا جنم

پھر..................

یہ ساری نسلِ انسانی

جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا

ومن آیاتِہ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِن اَنْفُسِکُمْ ازواجاً لّتسکُنُوا الیھا.

اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے جوڑے بنائے تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرسکو۔

وجَعَل بینَکُم مودۃ و رحمتۃ.

ترجمہ: اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی‘‘ (سورہ الروم، آیت ۲۱)(۱۰۹)

مذکورہ اقتباس سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ عارف خورشید عورت اور مرد کے نجی جذبات کو ہی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔یعنی ان کے افسانے سماج اور باہر کے ماحول سے زیادہ گھر کی چار دیواری میں بند کمرے کی فضاء کو ہی پیش کیا ہے۔ زیرِنظر مضمون میں مصنّفہ نے عارف خورشید کے افسانوں کے فن کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

> ’’عارف خورشید نے اکثر افسانے صیغۂ واحد متکلم میں لکھا ہے۔ اس سے بیانیہ مضبوط ہو جاتا ہے اور قاری کردار کے پس پردہ قلمکار کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اس وسیلہ میں افسانوی اظہار سفر نامے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تخلیق کار مسافر کی صورت اپنی داستانِ سفر بیان کر رہا ہوتا ہے ۔ اور قاری......؟ سن رہا۔ اس لئے اظہار میں قاری کو فنکار کے تجربے میں ردِ قبول کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ غائبانہ طور پر قاری اس پورے Scinario میں بذاتِ خود موجود رہتا ہے۔ عارف خورشید کا یہی اعترافی لہجہ انہیں قاری سے قریب کرتا ہے۔‘‘(۱۱۰)

الغرض جناب خورشید صاحب کے ہاں کہانیاں اپنے اندر تحریر شدہ کرب کی علامتیں ہیں۔ اور وہ کہانی کی تفریح کا سامان نہیں بلکہ حالات واقعات کا منظر نامہ سمجھتے ہیں۔ اور ان کا اپنا نظریہ بھی رہا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں کہانیاں لکھنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ جس کی وجہ سے قمر جمالی نے زیرِنظر مضمون میں عارف خورشید کو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ان کے اظہارِ بیان کو مختلف دلائل روشنی میں ایک منفرد لہجے کے افسانہ نگار قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ’’عارف خورشید ایک منفرد لہجے کے افسانہ نگار ہیں اظہار بیان کے لئے جس کے وسیلے کو اپنایا ہے وہ فکر وہ لہجہ نیا تو نہیں لیکن اس میں آ گہی کی قدرت

اور لذت گناہ سے زیادہ احساس گناہ اور خدا سے عفو و درگزر کی توقع انہیں،
ان ایک قبیل افسانہ نگاروں میں ممیّز کرتی ہے ان کی فکری اساس صرف تفریح
کا ذریعہ نہیں بلکہ آگہی بھی ہے۔'' (۱۱۱)

قمر جمالی ان کے مجموعی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے خورشید کے ہاں عورت کے مقام کو ظاہر کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے چنانچہ وہ یوں رقمطراز ہیں:

''عارف خورشید اپنی نوع کے افسانے کا ایک جاندار اور بیباک نام ہے۔
انہوں نے پچھلی روایت کے مطابق جنسی موضوعات کے اظہار کے لئے کسی
طوائف یا بازاری عورت کا سہارا نہیں لیا۔ عورت ان کے ہاں بس ایک عورت
ہے۔ یہ عورت کے تقدس کا احترام بھی کرتے ہیں اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں
سے دھڑلے سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ ہاں مگر ادب میں ادب ملحوظ
رکھنا اور کچھ معاملات کی پردہ داری بھی اس کے ضروری اور مستحسن عمل
ہے۔'' (۱۱۲)

الغرض مکمل مضمون کے مطالع کے بعد اس بات کا علم ہوتا ہے کہ عارف خورشید نے اپنے افسانوں میں جنسی موضوعات پیش کرنے میں بے باکی سے کام لیا ہے مگر قمر جمالی چند چیزوں میں پردہ داری کو ضروری سمجھتی ہیں کیوں کہ عارف خورشید کے جنسی افسانوں کا حوالہ دیتے ہوئے قمر جمالی کو شاید شرمندگی سی محسوس ہوئی ہو آخر عورت جو ٹھہریں۔

تحریم ناز:

قمر جمالی نے ''تحریم ناز'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ یہ مضمون ۹/اگست ۲۰۱۱ء کو تحریر کیا گیا ہے۔ جو روزنامہ مصنف (حیدرآباد)، آئینہ ادب ایڈیشن میں ۴/ستمبر ۲۰۱۲ء کو شائع ہوا۔ زیرِ نظر مضمون میں مصنفہ نے مظفر النساء کی شخصیت، حلیہ، سیرت و کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی ادبی علمی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ مضمون کا آغاز مصنفہ نے نہایت ہی دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مضمون نگار نے اپنے خیالات کو اتنے پر اثر انداز

میں لکھا ہے جسے پڑھ کر قاری نہ صرف نصیحت حاصل کرتا ہے بلکہ ان کی نصیحت قاری کے دل پر اثر انداز بھی کر جاتی ہے۔ مصنفہ نے اپنی تحریروں میں مضمون کی ابتداء میں موضوع کی مناسب سے متعلق ایک تاثراتی مضمون لکھتے ہوئے اپنے خیالات کو ترتیب و مربوط میں انداز میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ مضمون تحریم ناز کی ابتداء میں انہوں نے دنیا و آخرت کی سچائی و مقام کو ظاہر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی تلقین کرتی ہیں اور یہ پیغام دیتی ہے کہ دنیا و دین کو پیش نظر رکھ کر اعتدال سے اپنی حیات کی تکمیل کرنی چاہئے۔ بعدازاں انہوں نے مظفر النساء کی حلیہ نگاری پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''اونچا قد، مناسب جثہ کھلتا ہوا گندمی رنگ جو گورے پن کی طرف مائل ہو، سامنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرنے والے نین نقش مسکراتی آنکھوں والی ناز کو ہم ۱۹۷۵ء سے جانتے ہیں جب محفل خواتین میں ہم نے پہلی بار قدم رکھا۔''(۱۱۳)

مضمون نگار نے مظفر النساء کی شخصیت سے مکمل واقفیت رکھتی ہیں۔ لہٰذا وہ ان کی شخصیت کے نمایاں خصوصیات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''ہر منزل پر میانہ رو، نہ دولت کی فراوانی کا تکبر، نہ رتبے کا نشہ، قانع اور اللہ کی دی ہوئی نعمت میں خوش نہ کسی سے بیر، نہ حسد، نہ جلن، نہ زیادہ فضول خرچ نہ کنجوس۔''(۱۱۴)

مضمون تحریم ناز میں قمر جمالی اپنی پڑھائی کا ذکر کرتے ہوئے ملازمت کے دوران اپنی پڑھائی جاری نہ رکھنے کی مجبوریوں کی روداد بیان کی ہے اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعدازاں ایم اے فارسی مکمل کرنے کی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے تعلیم گاہ عثمانیہ یونیورسٹی سے ایک غائبانہ عشق کا اظہار کیا ہے اور انہوں نے مضمون تحریم ناز میں محترمہ عظمت صاحبہ سے ان کی پہلی ملاقات اور ان سے وابستہ عقیدت، احترام و محبت، دلچسپی اور یادوں کی ایک لفظی تصویر اور اس سے ابھرنے والے تاثرات کو بیان کیا ہے جو کسی جگہ نہایت بے ساختہ انداز میں شروع ہو کر کہیں غیر روایتی انداز میں ختم ہو جاتی ہے۔ الغرض یہ کہ انہوں نے مظفر النساء ناز سے پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ بعدازاں ان کی ولادت، ابتدائی تعلیم، شادی اور ملازمت اولاد وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ

وہ مظفر النساء کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''یہ ناز ہے۔ ناز ہونے سے پہلے مظفر النساء ہوا کرتی تھی۔ اچھی شاعرہ ہے اور محفل خواتین کی خازن سکریٹری ہے۔ ایسا کہو کہ کرتا دھرتا ہے۔ سب کچھ سنبھالتی ہے۔ حساب کتاب اندراجات، محفل میں شریک ہونے والوں کے ناموں کی فہرست، پروگرام مرتب کرنا، سچ کہوں تو عملاً بہت کچھ یہی کرتی ہے اگر چہ سرکاری ملازمت کرتی ہے گھر میں فوقانیہ مدرسہ چلاتی ہیں اور ادب کا کام بھی کرتی ہے۔''(۱۱۵)

قمر جمالی مظفر النساء کی شاعری کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شاعری کے موضوعات اور شعری خصوصیات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں۔

''درون خانہ مسائل، پیار، محبت سے محرومی، وفا اور زندگی کی عنایتوں پر طمانیت ان کے موضوعات ہیں۔ ناز کی شاعری ایک تازہ ہوا کے جھونکے کا احساس دلاتی ہے۔ اشعار کی فرضی کہانی خنک ہوا کی طرح رخساروں سے مس کرتی ہوئی گزرتی ہے تو ایک گوں ناگوں شگفتگی کا احساس ہوتا ہے مگر ناز کی شاعری میں شگفتگی ،تازگی اور شوخی کے ساتھ ساتھ نشاط غم کی بھی کمی نہیں ہے۔''(۱۱۶)

نازؔ کے اب تک تین شعری مجموعے منظر پر آکر تحسین خواص وعوام حاصل کر چکے ہیں۔قمر جمالی تحریم ناز کی شعری کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اوران کی شعری خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے نازؔ کو اللہ تعالیٰ نے جو ہنر عطا کیا ہے جس کو تخلیق کے ذریعے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''نازؔ اگر چاہے تو کئی اور مجموعے منظر پر آسکتے ہیں مگر چونکہ ناز ان معاملات پر زیادہ توجہ نہیں دیتیں یا پھر............

پر طبیعت ادھر نہیں آتی کے نام اور شہرت سے گریز نے انہیں سست بنا دیا ہے۔

جب تک تخلیق کا کرب انہیں بے چین نہیں کرتا انہیں کاغذ قلم کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بہت ہوا تو لکھ دیا اور محفل خواتین کے کسی اجلاس میں سنا دیا۔ بس اُسی کو وہ اپنے منصب کی تکمیل سمجھتی ہیں۔ ناز کے لہجے کی نرمی اور گداختگی ان کی لحن پر حاوی رہتی ہے۔ جب یہ اشعار سناتی ہیں تو لگتا ہے پاس کہیں گھنگرو بج رہے ہوں..................

درست ہونے کے ناطے یہ کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہنر انہیں بخشا وہ امانت ہے، لہٰذا اپنے خیالات احسن کو اوروں تک پہنچانے میں بحالت غیر دیانت داری ہے۔'' (۱۱۷)

بالآخر قمر جمالی نے نازؔ کا ہی ایک شعر پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی دل کی جذبات کو تبھی سمجھ سکتا ہے جب تک اس کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو نہیں کر لیتا۔ الغرض قمر جمالی نازؔ کو اپنی سستی دور کرتے ہوئے تخلیق کو مسلسل جاری رکھنے کا مشورہ دیتے ہوئے ناز ان کی بات سے متفق ہونے کی پُر امید سے مضمون کا اختتام کیا ہے۔

الغرض ان کے مضامین کے مطالعے سے ان کی تحقیق وتنقیدی بصیرت کا علم ہوتا ہے۔ وہ ایک اچھی محقق ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے وہ کسی موضوع پر تحقیق کرتے وقت تمام متعلقہ مواد تک رسائی حاصل کرتی ہیں اور مختلف دلائل کی روشنی میں اپنے مطالعہ کو پیش کرتیہوئے نتیجہ اخذ کرتی ہیں۔ انہوں نے فارسی کے چند اہم صوفیوں کی شخصیت وسیرت اور ترکِ دنیا مشائخوں کی خدمت ومحبت اور ان کی قوتِ روحانی وکرامات پر روشنی ڈالتی ہے ان مضامین میں تصوف کے موضوع پر عالمانہ وحکیمانہ خیالات پیش کئے ہیں۔ یہ مضامین ان کے وسیع مطالعے اور غور وفکر کا نتیجہ ہیں جس کے مطالعے سے قاری کے علوم میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔

تحقیق مضامین کی زبان اور انداز میں سادگی الفاظ اور موضوع کی خوبصورتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں ایک ایک چیز کو باریکی سے سوچتے ہوئے ہر چیز کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ قمر جمالی کے مضامین کی ایک خوبی مفکرانہ سنجیدگی ہے۔ وہ اپنے مضامین میں تدبر وتفکر کی مدد سے حقائق کو واضح کرتے ہیں جس سے قاری بھی غور وفکر کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بعض اوقات بات کوئی نہیں ہوتی لیکن ان کے اندازِ تحریر سے قاری کو لگتا ہے کہ یہ

چیز اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھی۔قمر جمالی کے مضامین کی ایک اور خصوصیت نُدرتِ فکر ہے۔قاری جب کوئی مضمون پڑھتے ہوئے اس کے موضوع پر آتا ہے تو وہ اپنے طور پر جس چیز کا خیال کرتا ہے اس سے بالکل الگ اور نئے خیال اور نئے پہلو سے ہم کنار ہوتا ہے۔اس طرح غیر متوقع خیالات اس کی دلچسپی کو بڑھاتے ہیں۔

شخصیات پر لکھے گئے مضامین میں ان کی شخصیت،حلیہ،سیرت وکردار،عادات واطوار،یادوں کی ایک لفظی تصویر،متعلقہ شخصیت سے وابستہ محبت اور حقیقی واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شاعری،افسانہ نگاری وغیرہ کا تجزیہ کرتے وقت اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معروضی نقطۂ نظر رکھتی ہیں متوازن اور مدلل انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔اس طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک اچھی محقق اور نقاد ہے۔انہوں نے تحقیق وتنقید پر کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں لکھی لیکن ان کے مضامین کے مطالعے سے ہم ان کی تحقیقی اور تنقیدی نظر کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔امید ہے کہ آئندہ وہ کسی موضوع پر باقاعدہ لکھنے کی طرف توجہ دیں گی۔غرض مجموعہ 'نواحِ ادب' اور 'انعکاس' کے مضامین میں رواں دواں دلچسپ انداز کے استعمال پر خصوصی توجہ دی ہے جس کی وجہ سے ان کے مضامین تمام نثری محاسن کے ساتھ متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ذ) سفرنامے

قمر جمالی نے افسانے،ڈرامے اور انشائیے،خاکے،رپورتاژ کے علاوہ سفرنامے کی صنف کی طرف بھی خاص توجہ کی ہے۔انہوں نے تقریباً تین سفرنامے تحریر کیے ہیں۔ان کا پہلا سفرنامہ شاخِ نبات 1992ء، دوسرا سفرنامہ آخری تکون 2007 تیسرا اتکل-کلنگا-اڑیسہ 2015۔ان کے یہ تینوں سفرنامے شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ان کے سفرناموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفرنامے انہوں نے ادبی سمینار و کانفرنس میں شرکت کی غرض سے کئے گئے سفر پر مشتمل ہیں۔ان کے سفرناموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان سفرناموں کے ذریعے مختلف شہروں کے علاوہ قمر جمالی کی شخصیت ومزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور ان کے یہ سفرنامے ایسی دستاویز ہیں قاری کے لیے مستند معلومات سے فیضیاب کر دیتی ہیں۔قمر جمالی کے سفرناموں میں صداقت کا عنصر زیادہ اور تخیل کی کارستانی کم نظر آتی ہے۔دلکش مناظر کا حسنِ بیان تو ان کی کمزوری ہے کہ خودفراموشی کا عالم طاری ہوجاتا

ہے۔ایسے موقع پران کے قلم کے جوہر کھلتے ہیں،اسلوب نگارش اور شگفتہ ہوجاتا ہے اور حسین مناظر قاری کی نگاہوں کے سامنے اپنے تمام جلوے بکھیر دیتی ہیں۔ان کے یہ سفرنامے اسلوبِ نگارش کے اعلیٰ نمونہ ہیں۔

شاخِ نبات:

سفرنامہ ایک بیانیہ صنف ہے۔اس بیانیہ صنفِ ادب میں مردوں کے دوش بدوش خواتین بھی اپنا حق ادا کرتے ہوئے بیسویں صدی کی ابتداء ہی سے اردو میں سفرنامے لکھنا شروع کیا۔حیدرآباد کی خواتین افسانہ نگاروں میں قمر جمالی ایک معروف ومشہور افسانہ نگار ہیں جنہوں نے افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔قمر جمالی نے اپنا پہلا سفرنامہ 'شاخِ نبات' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔یہ سفرنامہ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'سبوچہ' میں شامل ہے جوتناظر پبلیکیشن ،دہلی سے 1992 میں شائع ہوا۔سفرنامہ کی ابتداء میں مصنف نے اپنے اندر چھپے ایک ناہموار لڑکی کا ذکر کیا ہے جس کے داخل ہونے سے مصنفہ کے اندر چھپے ہوئے ایک نٹ کھٹ لڑکی انہیں تنگ کرنے لگتی ہے۔مصنفہ اپنے متعلق اس حقیقت کا اظہار کرتی ہیں کہ ان کے اندر چھپے یہ نٹ کھٹ لڑکی ہمیشہ وقت سے پرے سفر کرتی ہے چونکہ کسی بھی پرانی تہذیب کی باقیات ان کے لیے بے پناہ کشش رکھتی ہیں،لہٰذا مصنف جب گوا کے ٹور کے لیے نکل پڑیں تو انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ آگے پیچھے صدیوں میں ڈولنے والی یہ لڑکی انہیں بہت تنگ کرے گی۔الغرض قمر جمالی اپنے اہل خاندان کے ساتھ کرناٹک اسٹیٹ میں داخل ہوتے ہی ہبلی اسٹیشن سے دھارواڑ (DHARWAR) کے بیچ ان کی گاڑی رک گئی اور گاڑی پر دہشت گردوں کا قبضہ ہوگیا۔بعدازاں انہوں نے جن پریشانیوں کا سامنا کیا اس کا ذکر کیا ہے۔

گوا بھارت کی ایک ریاست ہے۔بلحاظ رقبہ سب سے چھوٹی ریاست ہے۔بلحاظ آبادی چوتھی ریاست ہے۔یہ ریاست بھارت کے جنوب مشرقی علاقہ میں واقع ہے۔اس علاقہ کو کونکن بھی کہا جاتا ہے۔اس ریاست کے شمال اور مشرق میں ریاست مہاراشٹر،جنوب میں ریاست کرناٹک اور مغرب میں بحیرۂ عرب واقع ہے۔قمر جمالی نے سفرنامہ شاخِ نبات میں گوا کے جغرافیائی حالات اور وہاں کی تہذیب وزبان پر روشنی ڈالی ہے، چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

"گوا میں مندروں کی بھی بہتات ہے۔یہاں کی آبادی 1981 کی مردم شماری کے مطابق دس لاکھ ہے جن میں 45 فیصد ہندو ہیں۔باقی 55 فیصد میں عیسائیوں کی

اکثریت ہے۔تیسری بڑی جماعت مسلمانوں کی ہے، ویسے یہاں ہر علاقہ اور مذہب کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔تہذیب پر عیسائی چھاپ اتنی زیادہ ہے کہ پہناوے سے ذات پات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہندو آبادی میں مرہٹوں کا غلبہ محسوس ہوتا ہے۔

گوا کی علاقائی زبان تو کونکنی ہے مگر یہ زبان صرف ساحلی علاقے کے ماہی گیر قبیلے میں زندہ رہ گئی ہے۔ پرانی کونکنی تہذیب کو اسی قبیلے نے سنبھال کر رکھا ہے۔چکنی چکنی مچھیرنوں کو دیکھ کر دل میں ایک عجیب، بے ہنگم سا احساس ہوتا ہے۔ کچھ ناگوار، کچھ خوشگوار ہوسکتا ہے۔ میں جس احساس کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں اس کا مجھ سے زیادہ میرے شوہر صاف طور پر اظہار کرسکیں۔'' (۱۱۸)

قمر جمالی کے اسلوب کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ ان کا جادونگار قلم ہر منظر کو متحرک بنا کر پیش کرتا ہے۔ فضا آفرینی کی کیفیت تو ان کے سفرناموں میں ایک عروج پر نظر آتی ہے۔ان کی منظر کشی ایک طرف تو ادبیت کی چاشنی رکھتی ہے تو دوسری طرف چند سطروں میں مرقع کھینچ کر رکھ دیتی ہے۔سفرنامہ شاخِ نبات میں انہوں نے گوا کی تمّائی گھاٹوں اور وادیوں کے مناظر کو بڑے ہی دلچسپ شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ملاحظہ کریں:

''کرناٹک اسٹیٹ چھوڑنے کے تھوڑی دیر بعد تمّائی گھاٹ سے گھاٹوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو اٹھارہ گھاٹوں سے گاڑی گزرتی ہوئی ریلوے لائن کی دونوں طرف اتنے خوبصورت مناظر تھے کہ بار بار خدا کی شان میں قصیدہ ہوجاتا۔کرناٹک اسٹیٹ سے گوا تک کی ریلوے لائن پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔اس لیے اگر گھاٹ نہ بھی ہوں تو گاڑی وادیوں سے گزرتی ہے۔حدنظر مخملیں، ٹیلے—جن پر اڑتے ہوئے سفید ہنسوں کے سے پر پھیلائے بادلوں کے دل، بادلوں کو چیر کر—یا بادلوں کے اوپر سفر کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا احساس کچھ زیادہ ہونے لگتا تھا، کیونکہ کہرے کی وجہ سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہمارا ناطہ زمین سے ٹوٹ گیا ہے اور ہم آسمانی مخلوق میں ہونے لگے۔'' (۱۱۹)

اس اقتباس سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ قمر جمالی جو بھی منظر دیکھتی ہے وہ جذب کر لیتی ہے اور اس طرح خود بھی منظر کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔خصوصاً واقعات ومناظر کی مستی ان پر نشے کی کیفیت طاری کردیتی ہے۔

سفرنامہ شاخِ نبات میں گوا کے سفر میں پیش آنے والے تلخ واقعات ومشاہدات کا ذکر اور وہاں کی قوانین

وتہذیب، رہن سہن، عادات واطوار، گوا کا موسم ودلکش مناظر، گھاٹیوں، وادیوں، ندیوں، شہروں اور وہاں کی مرغوب غذائیں، گوا میں شادی بیاہ کے رسومات اور ساحلوں کی زمین گوا پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے گوا میں گورنر خورشید عالم کے ہاں ضیافت کا ذکر اور ان کے پیار و محبت پر اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے۔ غرض ان کا یہ سفر نامہ ان کے اعلیٰ ذوق اور ادیبانہ اسلوب کی عکاسی کرتا ہے۔

آخری تکون:

قمر جمالی اپنا دوسرا سفر نامہ 'آخری تکون' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ سفر نامہ 12 نومبر 1994 کو تخلیق کیا گیا جو سہ ماہی 'توازن' مالیگاؤں سلسلہ نمبر 29، 1996 میں شائع ہوا۔ جس کو قمر جمالی نے اپنا چوتھا افسانوی مجموعہ 'زہاب' میں بھی شامل کیا ہے جو تناظر پبلیکیشن دہلی سے 2007 میں شائع ہوا۔ سفر نامہ 'آخری تکون' کنیا کماری کے سفر پر مشتمل ہے۔ قمر جمالی سفر نامہ کی ابتداء میں غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو نادار سمجھتے ہوئے لکھتی ہے کہ سفر کی روداد جو آنکھوں میں محفوظ ہے جس کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کی کوشش کے ساتھ ایک خوف سا مسلط محسوس کرتی ہے کہ آج کی دنیا تو کہانیوں سے بھری پڑی ہے کہیں نادانستہ طور پر ایسی کہانی نہ لکھ دیں کہ تلویں زخمی ہو جائیں۔ بعد ازاں وہ اپنی ہی بات کا اعتراف کرتی ہے کہ وہ ان زخموں سے گھبراتی نہیں ہیں بلکہ زخم ہی تو ہیں جو جینے کا حوصلہ دیتے ہیں، چونکہ وہ ان زخموں کو زخم نہیں بلکہ عطاء قرار دیتے ہوئے جن کے بھروسے پر اپنے خیالات کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے کہتی ہے کہ جو خارجی احساس ذہن و دل میں جذب ہو کر پھر کسی خارجی ایٹم سے ٹکرا کر دھماکا نہیں ہو جاتا تب تک ذہن میں محفوظ یادیں پھلجھڑی کی چنگاریوں کی طرح باہر نہیں آتا جس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ ورنہ جو خیالات ادھر جذب کیا وہ کہیں اُدھر منتقل نہ ہو جائے۔ الغرض قمر جمالی نے سفر نامے کی ابتداء میں کہانی لکھنے کے متعلق جو اپنی ذہنی تغیرات ہیں جس کا اظہار کرتے ہوئے 'آخری تکون' میں شام کے منظر کی بڑی حسین منظر کشی بڑی لطیف اور شگفتہ انداز میں بیان کی ہے، چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

> ''جس وقت ٹاملناڈو ٹرانسپورٹ کی بس نے ہمیں وہاں اتارا شام کے سائے ابھی پھیلے نہیں تھے۔ یہاں چرچے بہت تھے کہ شاہِ مشرق غسلِ شباب کے لیے سمندر میں غوطہ لگانے والے ہیں۔ مسافروں کی ٹولیاں ہجوم در ہجوم کسی خاص سمت کی طرف رواں دواں تھیں مگر ہمیں ابھی اپنی منزل تک پہنچنا باقی تھا۔

''ابھی نہیں۔''

ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور ...اُلٹے چل پڑے تا کہ جلد از جلد ویویکا نند آشرم میں کوئی کاٹیج حاصل کر لیں۔

تازہ دم ہوکر جب ہم اپنے کاٹیج سے باہر نکلے چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہرے بھرے جھاڑوں کے بیچ یہاں وہاں برقی قمقمے ٹمٹمارہے تھے۔ایک دبیز سناٹا تھا۔ جھینگروں اور حشرات الارض کی جگل بندی ہم رات دیر گئے تک سنتے رہے۔''(۱۲۰)

الغرض قمر جمالی کو ناملناڈو کے ویویکا نند آشرم میں خول کی مناسبت سے انہیں سکوت کا عالم محسوس ہوا۔

ٹامل ناڈو یعنی تامل لوگوں کا ملک بھارت کی انتیس ریاستوں میں سے ایک ریاست ہے اور کنیا کماری ریاست تامل ناڈو کا ایک ضلع ہے۔ ہندوستان کی جنوبی سرحد کا یہ آخری تکون کا جغرافیائی نام کیپ مورِن اور عرف عام میں کنیا کماری کہا جاتا ہے۔قمر جمالی سفر نامہ آخری تکون میں شہر کنیا کماری کی جغرافیائی خصوصیات کے متعلق وہ یوں رقم طراز ہیں:

''مشرق میں خلیج بنگال، مغربی ساحل سے متصل بحیرۂ عرب اور جنوب میں بحر ہند۔تین سمندروں کے سنگم پر قدآدم لہروں کے حصار میں محصور ننھا سا تکون جس پر کھڑے ہو جاؤ تو ہمارا اپنا ملک سارے کا سارا پیٹھ پیچھے رہ جاتا ہے اور سامنے رہ جاتا ہے پانی — نیلا، پیلا اور گلابی پانی۔حد نظر تک بس پانی ہی پانی۔''(۱۲۱)

شہر کنیا کماری کی کل آبادی چودہ ہزار تین سو اسّی نفوس (14380) اور رقبہ 25 مربع کلومیٹر پر محیط ہے یہ علاقہ ناریل اور کیلے کے درختوں اور دیو مالائی کہانیوں کو سمیٹے دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا ہے اور سفر نامہ آخری تکون میں انہوں نے وہاں کے مقدس دید مقامات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جب وہ ان مقامات کی نظارہ کے لیے نکل پڑیں تو جہاں انہوں نے جو ذاتی مشاہدہ کیا جس کا ذکر کرنے سے مصنفہ کی شخصیت کر کھل کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ ان مقدس دید مقامات پر لوگوں کا ایک بے ہنگم سا شور تھا۔ان سب کی نظر ان مقامات پر رہی مگر مصنفہ نے تماشائے اہلِ ہنر دیکھتی رہ گئیں لیکن جب وہ تکون پر پہنچ کر خود کو کولمبسؔ محسوس کرنے لگیں۔ کیونکہ کولمبسؔ نے لہروں پر ڈولتے ہوئے زمین کے چھور کو پکڑنے کی کوشش کی تھی جبکہ مصنفہ نے زمین پر کھڑے لہروں کو پکڑنے کی کوشش کرتی رہی، ان کی اس کوشش کو تجاہل عارفانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

قمر جمالی آخری تکون کے سمندر کی فضاء کو اس طرح بیان کیا ہے جس سے افسانے کا لطف و جاذبیت ہوتا ہے۔ بعدازاں دیوی کنیا کماری کے درشن کرتے ہوئے دیوی کے ناک کی دال میں دمکتے ہیرے کی خصوصیت کا اظہار کیا ہے کہ کسی زمانے میں یہ ہیرا لائٹ ہاؤز کا کام کیا کرتا تھا اور سمندری جہازوں کو اس کی روشنی سے رہنمائی ہوتی تھی۔ قمر جمالی نے اس سفرنامے میں راکھشسوں کا راجا بانا سوار کا بھی ذکر کیا ہے، جس نے دیوی دیوتاؤں پر غالب آکر انہیں طرح طرح سے ظلم کیا کرتا تھا۔ بانا سوار کو ختم کرنے کے لیے پراشکتی نمودار ہوکر بانا سوار کے خلاف 'کماری' کے مقام پر تپسیا کا آغاز کیا وہیں بھگوان شیو نے پراشکتی کو دیکھ کر اس کے عشق میں گرفتار ہوا۔ الغرض قمر جمالی ان دونوں کی عشق کی داستان، شادی کی تیاریاں اور شادی کے لیے آدھی رات کا مہورت نکالا جانا وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے مقام 'کماری' کس طرح کنیا کماری کے نام سے مشہور ہوگئی جس کے متعلق وہ یوں لکھتی ہے:

> ''صبح دم تک پراشکتی نے بھگوان شیوا کا انتظار کیا مگر جب مایوس ہوگئی تو پاؤں مار کر شادی کے مقدس تھال کو الٹا دیا اور عہد کیا کہ وہ ہمیشہ کنیا ہی رہیں گی۔ تب ہی سے یہ جگہ کنیا کماری کے نام سے مشہور ہوگئی۔ شادی کا سارا سامان پکوان ریتی میں تبدیل ہوگیا۔'' (۱۲۲)

کنیا کماری ہندوستان کی وہ واحد جگہ ہے جہاں طلوع آفتاب اور غرب آفتاب کا نظارہ ایک ہی مقام سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جیسا کہ انہوں نے کنیا کماری کے ساحل پر فطرت کے نمونوں کو دیکھ کر خالقِ کائنات کی شان میں بے ساختہ سبحان اللہ کہتے ہوئے جن کا ذکر نہ کرنا کفرانِ نعمت سمجھتی ہیں۔ اس بناء پر انہوں نے کنیا کماری کے ساحل کے مناظر اور خصوصیات کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''اگرچہ کہ سنگم پر تینوں سمندروں کی لہروں کی تخصیص کرنی مشکل ہوجاتی ہے مگر جب لہریں واپس لوٹتی ہیں تو اپنی شناخت چھوڑ جاتی ہیں۔ سرخ، سیاہ اور سنہری ریت کی جگ مگ کرتی چادریں ساحل پر دور تک بچھ جاتی ہیں بالکل ایسے جیسے کسی نے سلیقے سے تین مختلف رنگ کی چادریں ایک دوسرے سے متصل بچھادی ہوں۔'' (۱۲۳)

کنیا کماری سے 12 کلومیٹر کے فاصلے پر جہاں بھگوان شیو نے کنیا کماری تک پہنچنے سے قبل انتظار کیا تھا، وہاں ایک 'سچیند ر' کے نام سے ایک مندر تعمیر کیا گیا۔ یہ مندر ہندو فلسفے 'Trinity' کا مظہر ہے یعنی وشنو بھگت اور شیو بھگت دونوں کے لیے مقدس ہے۔ چنانچہ قمر جمالی نے اس مندر کو نویں صدی عیسوی کے طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ کہا

ہے، لہٰذا قمر جمالی نے اس سفرنامے میں وہاں کی تاریخی عمارتوں اور راجاؤں کے فنِ تعمیر کی ستائش کرتے ہوئے اس کی خصوصیات کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے، مثلاً ایک اقتباس دیکھئے:

''اس مندر میں ایک ہی پتھر میں تراشے گئے سات ستون فرش سے چھت تک ایک دوسرے سے متصل کھڑے ہیں جنہیں 'Musical Pillars' کہا جاتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک ستون پر ہتھیلی سے تھاپ دیں اور کسی اور ستون پر کان دھر کر سنیں تو سننے والے کو ساتوں ستون سے سنگیت کے ساتھ سُر یعنی سا(۱) — رے(۲) — گا(۳) — ما(۴) — پا(۵) — دا(۶) — نی(۷) صاف سنائی دیتے ہیں۔'' (۱۲۴)

الغرض تامل ناڈو ریاست واقعتاً اپنی نوعیت کا واحد ریاست ہے جو مختلف قدیم مندروں کی زیارت کے لیے ہو یا ریاست ہی قدیم تہذیب کے کھنڈرات کے فنِ تعمیراتی معجزہ دیکھنے کے لیے یہاں کچھ مشہور ترین مقامات ہیں جن پر حیرت انگیز تامل ناڈو کے سفر کیے جاسکتے ہیں۔

تمل ناڈو ریاست کا ایک مشہور علاقہ کنیا کماری سماجی اور معاشی اعتبار سے ایک پچھڑا علاقہ ہے۔ کنیا کماری میں آبادی کا بڑا حصہ ماہی گیروں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ قمر جمالی جن کے مذہب کے بارے میں اندازہ لگانا تو اسے مشکل قرار دیا ہے۔ الغرض سفرنامہ نگار نے کنیا کماری میں موجود کیتھولک چرچ اور چرچ کے قیام اور وہاں کی آبادی کا ذکر کیا ہے۔

علاوہ ازیں انہوں نے 11/ اکتوبر 1996 کی شام مدورائی میں کسی بی جے پی رہنما کے قتل کے بعد کنیا کماری میں پھیلی سیاسی بے چینی اور پابندیوں کا ذکر کیا ہے جس سے انہیں جن جن مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر دوسرے دن ہندوستان کے دوسرے بڑے مذہب کا حال یعنی جمعہ مسجد کی تلاش میں نکل پڑیں جہاں امام بکری صاحب سے ملاقات کے بعد جو تاثرات وکیفیات مرتب ہوئے اس کا ذکر کیا ہے۔

سفرنامہ مثبت یا منفی جذبات وخیالات اور اثرات کا مرکب ہوتا ہے۔ اس طرح سفرنامہ وہ طرزِ تحریر ہے جس میں انسان یا سیاح اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات کے ساتھ جوڑ کر اپنی ذہنی، دلی اور طبعی کیفیت ظاہر کرتا ہے، یہ کیفیت اتنی وسیع اور عمیق ہوتی ہے کہ قاری یا سامع اس کے ضرور اثر قبول کرتا ہے۔ قمر جمالی نے سفرنامہ

آخری تکون میں کنیا کماری میں پیش آنے والے حالات، واقعات اور حادثات سے خود پر جس نوع کے داخلی وخارجی مرتب اثرات کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اندازِ بیان میں ادبی اور فنی چاشنی پیدا ہوگئی ہے جس سے سفر نامہ نگار کے ساتھ ساتھ قاری بھی اس لطف سے سرشار ہو کر اس میں برابر شریک محسوس کرتا ہے۔

جب قمر جمالی نے بکری صاحب سے ادعا بیان کیا تو بکری صاحب نے شہرِ حیدرآباد کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا کہ مصنفہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس کے بعد بکری صاحب کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے حسب ونسب کے متعلق کچھ یوں لکھتی ہیں:

> ''انہوں نے اپنا نام محمد محی الدین بکری بتایا اور کہا کہ ان کا حسب ونست حضرت ابوبکرؓ سے ملتا ہے، لہٰذا ان کے خاندان کے سارے افراد اپنے نام کے آخر میں بکری لگایا کرتے ہیں۔''(۱۲۵)

سفر انسان کی وسیع النظر، وسیع القلب اور جسمانی طور پر متحرک اور بیدار رکھتا ہے۔ سفر تجربے کی وسعت کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس میں نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ قمر جمالی نے اجلاس میں موجود جناب ایس ایم اے بشیر صاحب اور اسکول سکریٹری جناب عزیز سے ملاقات کے بعد کنیا کماری میں مسلمانوں کی آبادی وتاریخ اور وہاں کی مقامی بولی کے متعلق وہ یوں لکھتی ہیں:

> ''کنیا کماری میں چار سو مسلمان خاندان آباد ہیں جن کا نوّے(۹) فیصد حصہ وہابی فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ذات پات کے تفرقے سے بے نیاز 'وحدہٗ لاشریک' پر ایمان رکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ علاقہ ریاست کیرالا کا حصہ تھا مگر 1912 میں تامل ناڈو کی ریاست میں شامل کرلیا گیا ہے۔ یہاں عیسائیوں کا غلبہ ہے اور منت پراوالم Manitpra-vaalam یہاں کی مقامی بولی ہے جو تامل اور ملیالم کی ملی جلی شکل ہے۔ ہندو آبادی میں نائرلوگ شامل ہیں۔''(۱۲۶)

مصنفہ نے کنیا کماری کی تہذیب اور وہاں موجود ناڈار قبیلے کے لوگوں کے لباس اور طرزِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ناگارکال سے مارتنڈم کے مقام پر ایک ایک ہزار سال پرانی مسجد مالک بن دینار مسجد کی تاریخ اور تامل ناڈو میں North Arcat کے مقام پر مدرسۂ عائشہ صدیقہ میں درس وتدریس کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے قمر جمالی اور بکری صاحب کے درمیان مدرسہ کی تعلیم کے متعلق سوال وجواب کا سلسلہ چل پڑا۔ اس کے بعد قمر

جمالی نے تامل ناڈو میں بکری صاحب سے اردو زبان کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنے کی تلقین کرتی ہیں تو بکری صاحب اردو کی ابتدائی کتابیں دستیاب نہ ہونے کا ذکر کیا جب قمر جمالی نے انہیں عابد علی خاں ٹرسٹ کی اردو خدمات سے واقف کراتی ہوئی انہیں بنیادی اردو کتب کی فراہمی کا انتظام کروانے کی یقین دلاتی ہیں۔ بالآخرانھوں نے آخری تکون کے سفر کے مشاہدہ کے بعد اپنی کہی بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ آخری تکون ظاہر میں اپنی آغوش میں دیو مالائی کہانیوں کے سمیٹے نظر آتا ہے واقعی ایسا نہیں ہے۔

الغرض پانچ دن کے قلیل عرصے میں قمر جمالی نے کنیا کماری کی سیاسی، سماجی وتہذیبی، تاریخی، جغرافیائی، مذہبی، تعلیمی اور معاشرتی زندگی کو نہ صرف بغور دیکھا بلکہ نہایت خوبی کے ساتھ اپنے سفر نامے میں سمیٹ لیا ہے۔ان کے اسلوب میں بے پناہ روانی ہے۔ان کا خطابیہ انداز اور تکرار الفاظ میں داخلی حسن ہے اور یہ اسلوب قاری کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ قمر جمالی کی تحریر کا انداز فطری، دل آویزی اور بعض جگہ مکالماتی ہے اور جو منظر دیکھتی ہے جس کو وہ من وعن پیش کرتی چلی جاتی ہیں۔بعض مقام پر انسانی فطرت وذہنی تصورات کا اظہار کیا جس سے مصنفہ کی شخصیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔

اتکل، کلنگا اوراڑیسہ:

قمر جمالی نے ایک اور سفر نامہ ''اتکل، کلنگا اوراڑیسہ'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ سفر نامہ 16 اپریل 1995 کو تخلیق کیا گیا جس کو قمر جمالی نے اپنا پانچواں افسانوی مجموعہ 'صحرا بکف' میں شامل کیا ہے جو ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی سے 2015 میں شائع ہوا۔ دوسری مرتبہ سہ ماہی 'فروغ ادب' میں 7 دسمبر 2015، جلد ۱، شمارہ ۲ میں شائع ہوا۔قمر جمالی نے اڑیسہ کا سفر ساہتیہ اکاڈمی کے ٹراول گرانٹ یعنی اکاڈمی کے خرچ پر سفر کیا ہے۔اس سفر نامہ میں انہوں نے بیس سال پرانی یعنی 1995 کی اڑیسہ کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ سفر نامے کی ابتداء میں مصنفہ نے اس حقیقت کا اظہار کرتی ہیں کہ ان کی ہر تخلیق میں تاریخِ تخلیق اور تاریخ طبع میں بڑا بعد ہوتا ہے کیونکہ ان کا مزاج ایسا ہے کہ کسی بھی تخلیق کو فوری چھپوانے کے دھند میں نہیں رہتا ہے۔ جب وہ اپنا ذخیرہ چھان پھٹک کر رہی تھی تو انہیں یہ روداد ہاتھ لگی ان بیس سال پرانی یادوں کو وہ جوں کا توں چھاپ دیا ہے۔

قمر جمالی نے سفر نامے کی شروع میں سفر کرنے کی وجوہات بیان کرتی ہیں۔ الحاصل یہ کہ جب انہیں

ساہتیہ اکاڈمی کی ایماء پر ہندوستان کی کسی بھی ریاست کا دورہ کرنے کی اطلاع ملی تو ان کے ذہن میں فوری قومی ترانہ مصرعۂ ثانی کے دوسرا نام پر اٹک گیا، 'اتکل' جسے 'اتکل، کلنگا اور اڑیسہ' کے تین مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے۔ چنانچہ مصنفہ اس شہر کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''وہ زمین جہاں ہندوستان کے سپتر سمراٹ اشوک نے عالمِ انسانیت کو امن و آشتی کا پہلا پیغام دیا اور باوجود جنگجو سپہ سالار ہونے کی کشت وخون سے توبہ کی۔ وہ میدان جہاں جنگ کلنگا لڑی گئی اور وہ لاٹ جو اس جنگ کی یاد میں قائم کی گئی، آج بھی اسی مقام پر کھڑی ہے۔''(۱۲۷)

سفر کی تیاریاں اور اسٹیشن پہنچنے کے واقعات اور منتظمین کا تعارف پیش کیا ہے۔قمر جمالی اپنے سفرناموں میں جس علاقے کا سفر کرتی ہے، وہاں کے جغرافیائی حالات اور رقبے وغیرہ کا بھی ذکر کرتی ہیں۔انہوں نے سفر نامہ اتکل، کلنگا اور اڑیسہ میں اڑیسہ کے رقبے وہاں کی آبادی کا فی صد اور جغرافیائی خصوصیات پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''اڑیسہ خلیج بنگال کے ساحل پر چار ریاستوں، مغربی بنگال، بہار، مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش سے متعلق، مہاندی کے دونوں جانب (1,55,707) ایک لاکھ پچپن ہزار سات سو سات کلومیٹر پر محیط ریاست ہے، جس کی کل آبادی (3,15,12,070) تین کروڑ پندرہ لاکھ، بارہ ہزار ستر نفوس پر مشتمل ہے۔ دو ہزار سال پرانی یہ ریاست اپنی داستان حیات خود بیان کرتی ہے، جس کی بیاض میں کٹک اور بھونیشور دو الگ الگ حکایتیں ہیں۔''(۱۲۸)

نیز انہوں نے اڑیسہ کی تہذیب اور وہاں کی سڑکوں اور گاڑیوں اور عمارتوں کی بھی تصویر پیش کی ہے اور انہوں نے اڑیسہ کے ہائر ایجوکیشن سلیکشن بورڈ کے چیئر مین کرامت علی کرامت کا تعارف و شخصیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ان کی دوستی کسی بھی بڑے رشتے سے زیادہ محترم ہے۔

قمر جمالی سفر نامہ اڑیسہ میں اپنی کہانی 'مجسمہ' کے متعلق بھی اپنا اظہار خیال کیا ہے کہ ان کی یہ کہانی اردو زبان کے ساتھ ساتھ اڑیا زبان میں شائع ہو چکی ہے۔ کرامت علی کرامت صاحب نے بھی اپنے مکتوب میں اس کہانی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے مصنفہ کی شخصیت اور کہانی 'مجسمہ' کی خصوصیات عیاں ہو جاتی

ہیں، ملاحظہ ہوں:

''مٹی کے بتوں میں ایسا بدن ڈھونڈتی ہو جن کے سینے سے تمہاری اپنی ماں کے دودھ
کی بو آتی ہے۔ ذرا محسوس کرو کہیں وہ 'مجسمہ' میں تو نہیں—!''(۱۴۹)

'بھونیشور' ریاست اڑیسہ کا صدر مقام ہے۔ اگر چہ کہ کٹک اور بھونیشور جڑواں شہر ہیں۔ کٹک کی تاریخ دو ہزار سال پرانی ہے اور کٹک ایک گنجان آباد علاقہ ہے۔ 1950 تک یہی ریاست اڑیسہ کا دارالخلافہ رہا ہے۔ بھونیشور کٹک کی ضد ہے، بھونیشور اڑیسہ کا جدید علاقہ ہے۔ بھونیشور کو مندروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ غرض قمر جمالی نے زیرِ نظر سفرنامے میں ان دو شہروں کے بیچ نہ صرف تہذیبی اور معاشرتی نظام بلکہ بیرونی خدوخال بھی مختلف ہونے کا ذکر کرتے ہوئے اڑیسہ کی قدیم اور جدید تہذیب کے متعلق جو ذاتی مشاہدہ کیا ہے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ نیز انہوں نے طے شدہ پروگرام کے تحت کرامت علی کرامت کے ساتھ جب بھونیشور نکل پڑیں، بھونیشور سے گزرتے ہوئے ارض اتکل کے منظر در منظر کو اپنی آنکھوں میں جذب اور محسوس کرتے ہوئے وہاں کی تہذیب، معاشرہ، سماجی حالات، بولیاں اور لوگوں کے رہن سہن، کھانے پینے کے طور طریقے وغیرہ سے متعارف کروایا ہے۔

قمر جمالی نے سفرنامہ اڑیسہ میں کٹک میں پندرہ دن تک ڈاکٹر کرامت علی کرامت صاحب کے مکان پر ان کے اہل خاندان کے ساتھ مل کر رہنے اور ان سے جو رشتہ قائم ہوا وہ انشاء اللہ تاحیات قائم رہنے کی آرزو کرتے ہوئے پروفیسر کرامت علی کرامت کے ساتھ اجلاس میں شرکت کی اور وہاں اڑیا زبان کے ترقی پسند مصنفین، بھونیشور کے سکریٹری جناب سؤری بندوکر (Mr. Sauri Bandukar) کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے ساتھ ساتھ قمر جمالی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے نیشنل فیڈریشن کی سہ روزہ قومی کانفرنس میں ترقی پسند تحریک کے بانی رہنماؤں میں سے جناب سجاد ظہیر، سبط حسن، ڈاکٹر جوتی گھوش وغیرہ سے ملاقات کا جو شرف حاصل ہوا۔ مہا پاترا نیلمنی ساہو صاحب کے مکان پر ایک نشست کا انتظام رکھا تھا۔ اس نشست میں اڑیا زبان کے شہرۂ آفاق ناول نگار، ادیبوں وشاعروں سے ہوئی ملاقات کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ قمر جمالی کا یہ سفرنامہ خالص ادبی نوعیت کا تھا۔ اس لیے انہوں نے ان اداروں کا بھی ذکر کرنا ضروری سمجھا ہے جو کسی نہ کسی طرح زبان وادب کی بقاء وترویج کے لیے صالح رول ادا کر رہی ہیں۔ چنانچہ مصنفہ نے اڑیسہ کو زبان وادب کا خزانہ قرار دیتے ہوئے مزید مشاہدہ وتجربے کے بعد اس حقیقت کا ظہار کیا ہے کہ جو مساعد حالات اور محدود وسائل کے بعد اڑیسہ میں اردو کی صورت حال مضبوط نظر آتی ہیں

اور حیدرآباد کی طرح اڑیسہ میں زبان وادب کی ترویج کے لیے کئی غیر سرکاری ادارے اردو کو زندہ رکھنے کے لیے مسلسل کوشاں ہیں، ان تمام اداروں کے نام گنوائے ہیں۔قمر جمالی نے اڑیسہ میں ادبی نشستوں میں شرکت سے جو کچھ حاصل کیا اس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے، ملاحظہ کریں:

''اڑیسہ میں پندرہ روزہ قیام کے دوران ہم نے تقریباً بیس ادبی نشستوں میں شرکت کی اوران کی ساری نشستوں کا انتظام عالی جناب کرامت علی کرامت صاحب کی ایماء پر ہوا۔ ان محفلوں نے ہمیں بہت کچھ دیا۔عزت، توقیر، محبت، اپنا پن اور — تجربہ اور ہماری کہانیوں کو اڑیسہ میں ترجمہ کروا کے چھپوایا۔''(۱۳۰)

سفرنامہ اڑیسہ (MYCA) مسلم یوتھ کلچرل ایسوسی ایشن، کٹک نے قمر جمالی کے اعزاز میں ایک بہت بڑے جلسے کا اہتمام کیا جہاں کٹک میں جن اردو داں ادیبوں اور شعراء سے ملنے کا اتفاق ہوا اس کا برملا اظہار ملتا ہے اورانہوں نے جس بھی مشاعرے میں شرکت کی ہر مشاعرے کا شوق ہر مقام پر یکساں پانے کا ذکر بھی کیا ہے۔علاوہ ازیں قمر جمالی نے سفرنامہ اڑیسہ میں دورِ ہٹلر کے تاریخی واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''کہتے ہیں ہٹلر جب کسی ملک کو تباہ کرنا چاہتا تھا تو سب سے پہلے اس ملک کی کتابوں اور کلچرل سینٹر کو نذرِ آتش کر دیتا تھا کیونکہ کسی بھی ملک کا کلچر اس ملک کی کتابوں اور اس کے فن کے نمونوں میں محفوظ رہتا ہے— کیا پتہ آج کا لکھا کوئی فقرہ کل تاریخ کا حصہ بن جائے۔''(۱۳۱)

کونارک اور جگناتھ پوری اڑیسہ کے دو معاشرتی ادارے ہیں قمر جمالی جن کی زیارت کے بغیر ان کی اس تڑپ کو مکمل قرار نہیں دیتی کیونکہ مصنفہ کے لیے کسی بھی پرانی تہذیب کی باقیات بے پناہ کشش رکھتی ہے۔قمر جمالی تفریح کی اتنی متمنی تھی کہ وہ سنجیدہ مزاج ہونے کے باوجود ان کے اندر کچھ آرزوئیں، کچھ خواہشیں سمٹ کر وہ ایک نٹ کھٹ بچی میں مجسم ہو جاتی ہیں اور دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ان کی اسی تخیل نے ان کے اندر نٹ کھٹ لڑکی ہے جو طفلانہ حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ان کے اس سلوک سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا علم ہوتا ہے۔ بالآخر ان معاشرتی اداروں کی تڑپ آخری دن طے پائی تو مصنفہ رات بھر خیالوں میں جیتی جاگتی اور صبح کے انتظار میں اتاولی سی نظر آتی ہیں۔گوکہ سفرنامہ اڑیسہ میں مصنفہ کی ذوقِ نظر وذاتی تاثرات اور حسن بیان کا اظہار بڑی عمدگی سے ملتا ہے۔جس سے مصنفہ کے اسلوبِ بیان میں ایک دلکشی پیدا ہوگئی ہے مثلاً مصنفہ کے ذاتی تاثرات اور اظہار بیان

کے متعلق ایک اقتباس دیکھئے:

''اس رات ہم صبح کے انتظار میں بڑی اتاؤلی نیند سوتے رہے اور صبح سے پہلے ہی بیدار ہو کر بیٹھ گئے۔ زمین تین دن سے پانی پی کر پھول گئی تھی اور اتنی پلپلی ہوگئی تھی کہ جہاں پاؤں دھرو اندر دھنس جانے کا خوف مگر اب مطلع کچھ کچھ صاف ہونے لگا تھا۔ سورج ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوا تھا۔ نو بجتے بجتے مسلسل تین روز سے محوِ غسل شاہ مشرق، نہایت صاف وشفاف اپنے اصلی روپ میں دیکھتے ہوئے گولے کی طرح برآمد ہوئے تو دیکھتے ہی دیکھتے زمین کی ساری غلاظت سکڑ گئی۔'' (۱۳۲)

آخر کار جناب سوری بندو کر کی ایماء پر جناب چھبن بہاری پہاڑی اس تڑپ میں قمر جمالی کی رہنمائی کرتے رہے۔ بعد ازاں انہوں نے اڑیسہ میں بولی جانے والی زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ اڑیسہ میں زبان کا تعصب پایا نہیں جاتا اور اس بات کا اقرار کرتی ہیں کہ شہر حیدر آباد کی طرح اڑیسہ بھی محنت، محبت اور سادگی کا شہر ہے جس کی وجہ سے انہیں اڑیسہ میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ مزید انہوں نے سفر نامہ اڑیسہ میں وہاں کی ایجادات اور کونارک مندر کی تاریخ وخصوصیات کو بیان کی ہے۔ مختصراً یہ کہ کورناک، بھونیشور سے (65) کلومیٹر کے فاصلے پر، خلیج بنگال کے ساحل پر 1255 میں چندر بھاگا کے مقام پر 'مہاراجہ لنگولا نرسمہا دیو' کا تعمیر کروایا 'سوریہ دیوتا' کا مندر رہے۔ یہ ہندوستان کا واحد مندر ہے جسے باوجود مکمل تعمیر ہونے کے عبادت کے قابل نہیں سمجھا گیا مگر قمر جمالی نے اس مندر کو نرسمہا دیو کی بڑائی وعظمت انسانی کا پرتیک کہا ہے۔ اس کے متعلق اڑیسہ میں متعدد حکایتیں مشہور ہیں۔ جن میں سب سے معتبر حکایت 'راجہ نرسنگ دیو' کو اڑیسہ میں ایک ایسا مندر تعمیر کروانے کی خواہش ہوئی جو فن سنگ تراشی میں لاثانی ہو اور ایک ایسا تیرتھ ثابت ہو جس کی زیارت کے لیے دنیا کے کونے کونے سے لوگ کشاں کشاں چلے آئیں، اسی واقعے کے ابھارتے ہوئے جذبات نگاری سے کام لیا ہے، چنانچہ وہ کونارک مندر کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے کونارک مندر کی اس تاریخ حقیقت کا اظہار، ذاتی احساس ومشاہدہ کے بعد اپنا تنقیدی نظریہ پیش کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''کونارک ایک ایسی تعلیم گاہ ہے، جہاں مورتیاں خود بولتی ہیں اور دیکھنے والوں کے لب سی دیتی ہیں۔ دنیا کا ہر فلسفہ عورت کو کائنات کی قابل قدر وقابل احترام ہستی مانتا ہے مگر کونارک ایک ایسی تجربہ گاہ ہے جہاں عورت کو صرف BIOLOGICALLY

> ALIVE بتایا گیا ہے جس کا منصف مرد کے حیوانی جذبے کی آسودگی ہے۔ہم نے مہارشی وشوامتر اور مینکا کو مندر کے بالائی حصے میں یوں مصروف عمل دیکھا کہ آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ہم یہی سمجھ نہ سکے کہ اگر مہارشی وشوامتر کو اس حال میں نہ دکھایا جاتا تو دنیا کی کون سی چال ٹیڑھی پڑ جاتی۔!''(۱۳۳)

غرض مصنفہ ایک عورت ہونے کے ناطے کونارک مندر کے مناظر دیکھنے کے بعد شرم سا محسوس کرتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس مندر میں حیاتِ انسانی کے ایک خاص فلسفے کو بڑے کھلے بے حجاب انداز میں پتھرا گیا ہے۔جس کو انہوں نے مرد کے اخلاق کے اعتبار سے اس کے حیوانی جذبے کی آسودگی قرار دیتی ہیں۔غرض قمر جمالی کے اس اظہار خیال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی تمدن وتہذیب کے لیے پردہ ضروری ہے۔

قمر جمالی نے سفر نامہ اڑیسہ میں جذبات نگاری سے بھی کام لیا ہے۔مصنفہ کونارک کی مندر کے تعمیر میں راجہ نرسنگ دیو کا ظلم بیان کرتے ہوئے سنگ تراش شیبو کا بیٹا دھرما باپ کی تلاش میں نکل پڑا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے دھرما کے بہادری وجذبات کا اظہار یوں کرتی ہیں:

> ''آپ لوگ میری کم سنی پر نہ جائیں۔میری رگوں میں میرے باپ دادا کا خون بہہ رہا ہے جو پیڑی در پیڑی اسی فن کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ مجھ پر بھروسہ کریں۔''(۱۳۴)

غرض ان کے اس سفر نامے کے مطالعہ کے بعد ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک سفر نامے میں جن جن فنی خوبیوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان فنی خوبیوں کو قمر جمالی نے بڑے ہی انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔سفر نامہ 'اڑیسہ' بظاہر ایک روداد سفر ہے مگر اس مختصر سے سفر کو قمر جمالی نے تاریخی اور جذباتی سفر بنا دیا ہے۔ان کے اسلوب میں جذبے کی شدت کے علاوہ وارفتگی شوخ، بیتابی اور بے ساختگی نے یکجا ہو کر شعر کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

سفر نامہ اڑیسہ ایک ایسا سفر نامہ ہے جس کے ذریعے مختلف اداروں کے علاوہ سفر نامہ نگار کی شخصیت ومزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔زبان وبیان کے لحاظ سے اسے سفر ناموں کی صف میں شامل کیا جائے گا جنہیں پڑھتے وقت قاری کا جی لگا رہتا ہے۔

غرض قمر جمالی کے سفر ناموں کے مطالعہ کے بعد مجموعی حیثیت سے جو خصوصیات ملتی ہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے سفر کی ابتداء سے گھر لوٹنے تک کے حالات، ٹرین کے سفر کی روداد، اشخاص سے ملاقاتوں کا تذکرہ، ان

کی سیرت وکردار کے بیان کے علاوہ دلکش ودلچسپ قدرتی مناظر مختلف علاقوں کی جغرافیائی حالات کے علاوہ وہاں کے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی وثقافتی اور تاریخی واقعات، مذہبی عقائد، وہاں کے ایجادات، راجاؤں کا تعمیر کروائے چرچ، مندر، وہاں کی آب وہوا، رہن سہن، کھانے پینے کی عادات واطوار تذکرہ کرتے ہوئے بالخصوص سنگ تراشی کےفن سے بھی متعارف کروایا ہے۔

قمر جمالی نے وہاں کے کلچر اور زبان وبیان کی خصوصیات پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ ایک افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے ان کے سفرناموں کی زبان میں بھی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہی ہے۔تشبیہات واستعارات اور محاوروں وضرب الامثال کا بھی بڑی عمدگی سے استعمال کرکے انہوں نے زبان کو مزید دلچسپ بنایا ہے۔

قمر جمالی کے سفرنامے ان کے عالی ذوق اور ادیبانہ اسلوب کی عکاسی کرتے ہیں۔ دراصل قمر جمالی کی سفرناموں کی ایک جداگانہ اہمیت اور حیثیت اس لیے بھی ہے کہ مصنفہ نے مروجہ روش سے ہٹ کر اسے تحریر کیا ہے۔ یہ سفرنامے قدیم اور جدید کا حسین امتیاز ہیں۔ چوں کہ قدیم سفرنامہ کی طرح تاریخ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور جدید سفرنامے کی طرح اس میں ایک سچی سیاحت مخصوص مشاہدات اور فلسفہ زندگی ملتی ہے۔

ان سفرناموں کی ایک اور خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ خود ان سفرناموں میں بار بار نظر آتی ہے۔ ایک مرکزی کردار کی حیثیت سے ان کا وجود بار بار اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ مصنفہ کے ذوقِ نظر، ذاتی تاثرات اور حسن بیان نے مل جل کر ان کے سفرناموں کو ایک دلچسپ کہانی کی طرح پُر لطف بنادیا ہے۔

قمر جمالی کے متحرک تخیل نے بڑی خوبی سے کام لیا ہے اور قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ ان واقعات اور مقامات کو نہ صرف آنکھوں سے دیکھ رہا ہے بلکہ وہ مقام اس کے دل سے بھی گزر رہے ہیں۔ چوں کہ قمر جمالی نے ہر شہر کو ایک تخلیقی ادیب کی حیثیت سے دیکھا ہے اور اس کی نادر کیفیات کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ مختصر سیاحتوں کے علاوہ قمر جمالی کے سفر حیات کے تجربات ومشاہدات کا عکس بھی ان کے سفرناموں میں ملتا ہے۔ وہ ہر شہر اور مقام کو الگ حیثیت سے جانتی ہیں اور اس کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کی بہترین کوشش بھی کی ہے۔

غرض شگفتہ اور پرلطف نثر، سفر کی روداد، سیاسی سماجی، تہذیبی وتاریخی حالات کی عکاسی اجنبی واقعات اور پرکشش مناظر کے ساتھ زبان وبیان میں تازگی منظر نگاری، جذبات نگاری واقعہ نگاری کے مطالعہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ

ایک اچھی سفر نامہ نگار ہیں اور ان کے سفر نامے اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ح) وفیات

اُردو فکشن کی معتبر آواز قمر جمالی دراصل ایک ایسی کہانی کار ہیں جو برسوں سے غمِ کائنات کو لفظوں میں ڈھال رہی ہیں۔قمر جمالی نے طبقاتی سماج کی درندگی، پامال ہوتی انسانیت اور انسان کی مجبوری و محرومی سے جڑے واقعات کو قلم کی نظر کرنے میں اپنا خونِ جگر شامل کیا ہے اور انسانی رشتوں سے جڑی کہانیوں کو بڑی ہی فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔انسانوں پر گہری سوچ رکھنے والی اور انسانوں میں منفرد پہچان بنانے والی قمر جمالی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔خواتین تخلیق کاروں نے غیر نثری اصناف ریڈیو فیچر اور وفاتیوں کی طرف کم ہی توجہ مرکوز کی ہے۔مگر قمر جمالی نے افسانوی نثر کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی نثر کے تمام اصناف میں اپنے جوہر بکھیرتے ہوئے اپنے عہد کے چند با کمال و نامور اہلِ قلم مرحومین کے وفیات بھی لکھے ہیں۔انہوں نے کل نو(۹) وفیات تحریر کئے ہیں۔ان کے لکھے گئے وفیات کی ترتیب اس طرح ہیں:

یادِ عظمت (عظمت عبدالقیوم) ۱۹۹۰ء، آواز کا مینار (سرینواس لاہوٹی) ۱۹۹۲ء، اےئ راحتِ جاں (ساجدہ سلطانہ) ۲۰۰۷ء، آہ! رفیعہ آپا (رفیعہ منظور الامین) ۲۰۰۸ء، آہ راج انکل۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (ڈاکٹر راج بہادر گوڑ) ۲۰۱۱ء، سمٹ گئے ہیں مگر انتشار باقی ہے (نایاب سلطانہ) ۲۰۱۳ء، آہ فریدہ زین۔ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے (فریدہ زین) ۲۰۱۵ء، آہ! راشد بھائی کیسے راوی داستاں کی داستاں کھا جائے گا (راشد آزر) ۲۰۱۷ء، آہ فاطمہ آپا (فاطمہ عالم علی) ۲۰۲۰ء، ان کے یہ وفیات کسی نہ کسی ادبی جلسے میں پڑھے گئے ہیں۔ان میں بعض وفیات ادبی رسالے یا اخبار میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

قمر جمالی نے جن شخصیتوں پر وفیات تحریر کیے ان کے بیشتر دلچسپیاں، مشاغل اور معاملات اس سلسلے میں مختلف ہیں کیوں کہ یہ اشخاص بھی مختلف ہیں۔ان میں افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی، ناقد بھی ہیں اور دانشور بھی، محقق بھی ہیں اور فلم سکریپٹ رائٹر بھی۔غرض ہر نوع کی شخصیات پر قمر جمالی نے وفیات تحریر کئے، لیکن ان سب میں جو بات یکساں ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام کا قمر جمالی کے ساتھ یا تو خونی رشتہ رہا ہے یا تو دوست واحباب رہے ہیں۔ان وفیات کی خاص بات یہ ہے کہ مصنفہ نے عام فہم آسان اور پُر اثر انداز میں وفیات تحریر کئے ہیں جو قاری کے فہم میں

آسانیاں پیدا کردی ہیں۔

یادِعظمت:

محترمہ عظمت عبدالقیوم صاحبہ محفل خواتین کی بانی کی وفات پر قمر جمالی نے ''یادِعظمت'' کے عنوان سے ایک وفاتیہ تحریر کیا ہے۔ یہ وفاتیہ ۱۰/جون ۱۹۸۸ء کولکھا گیا۔ جو ۱۷/مارچ ۱۹۹۵ء میں محفلِ خواتین کا ادبی مجلّہ ''ادبی میگزین'' یادگار عظمت عبدالقیوم میں شائع ہوا۔ ۱۷/جون ۱۹۸۸ء کا اخبار دیکھا تو یادِعظمت میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے والوں میں قمر جمالی نے اپنا نام پڑھتے ہی عظمت صاحبہ کی وفات پر انہیں جس خوف ناک تکلیف سے گزرنا پڑا جس کا اظہار کیا ہے۔ مزید وہ ہائے وہ دن۔ ۲۱/مئی ۱۹۸۸ء قیامت صغریٰ کے سرخی کے تحت غم کا اظہار خیال کرتے ہوئے صاحبہ کی وفات سے چند دن قبل ان سے ملاقات کے ذکر پر روشنی ڈالی ہے۔ قمر جمالی عظمت صاحبہ کو اپنی ماں کی طرح سمجھتی اور انہیں دل سے پیار کرتی تھیں۔ عظمت صاحبہ کی وفات سے انہیں بڑا صدمہ پہنچا۔ ان سے اس حد تک محبت کرتی تھیں کہ ان کے رحلت پر اپنے دل میں چھپے درد و غم اور جذبات و احساسات کا ذکر اتنے پُراثر انداز میں بیان کیا ہے کہ چند لمحوں کے لئے قاری کا دل بھی رنج و الم سے بھڑک اٹھتا ہے۔ الغرض قمر جمالی نے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لئے ایک طویل شکوہ بھی لکھا ہے ملاحظہ کیجئے:

> ''اے مادرِ مہربان! کیسے آغاز کروں اپنی بات کا! سلامتی میں تجھ پر بھیج نہیں سکتی۔ درازی عمر کی دعا دے نہیں سکتی، اور نہ ہی تجھے مغفور و مجبور ہونے دعا دے سکتی ہوں۔ کیوں کہ میں نہیں مانتی کہ تو مر چکی ہے۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ نہ غزل مرے گی اور نہ عظمت غزل۔ نقل مقام کرنا ہی تھا تو کچھ کہا تو ہوتا۔ کچھ اشارہ کیا ہوتا۔ میں تجھے وداع کرنے سے قبل اپنی آنکھوں میں بسا لیتی تیری ایک چھپی پیاری سی اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا لیتی۔ مگر تو نے تو مجھے یکلخت فراموش کردیا۔ ذرا یاد بھی نہ کیا۔ مجھے یقین ہے اگر ایک آہ بھی تیرے ہونٹوں سے نکلی ہوتی تو اس کی گرمی میں اپنے چہرے پر محسوس کر لیتی۔ یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ تو نے آہ بھی نہ کی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ موت کا چہرہ تجھے اتنا خوفناک نہ لگا ہو کہ تو دہشت زدہ ہو جاتی۔ ہوسکتا ہے اجل نے تجھے زبردستی زندگی کے ہاتھوں چھینا نہیں بلکہ تو خود ہی چل کے اسے خوش آمدید کی ہو۔ مگر جو بھی ہو۔ مجھے شکوہ ہے اے ماں! تیری ذات سے۔ تیری ممتا بھری مُسکان سے جس نے مجھے دھوکہ دیا کہ میں

تو تجھے اپنی ماں مانتی رہی اور تو نے پتہ نہیں مجھے رشتوں کے آہنی جنگلے کے کون سے زینے پر بٹھائے رکھا کہ دمِ آخر ذرا پتہ نہ کیا۔'' (۱۳۵)

اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ قمر جمالی عظمت صاحبہ کو اپنی ماں مانتی تھی اور ان سے بے حد عقیدت و محبت کرتی تھیں۔ کیوں کہ عظمت صاحبہ تاحیات قمر جمالی سے مادرانہ اور مشفقانہ پیار کرتی رہی۔ ان دونوں ماں بیٹی کا رشتہ جو جذباتیت پر مشتمل ہے جس میں پائی جانے والی محبت کا کوئی نعم البدل موجود نہیں۔ الغرض قمر جمالی نے اس طویل نامہ لکھنے کے بعد بالآخر وہ اپنے غم سے بے قابو ہو گئیں اور قلم کو ایک طرف پھینک کر نامہ ریزہ ریزہ کر کے کئی گھنٹوں تک روتی رہی جب وہ رو رو کر تھک جاتی تو محسوس کرتی کہ عظمت صاحبہ ان کے سرہانے کھڑے ہوئے جیسے کہہ رہی ہوں کہ رو نہیں بیٹی! یہ تیرے ایمان کے عین منافی ہے۔ پھر جب قمر جمالی کا احساس بحال ہوا تو یہ محسوس کرتی ہیں کہ سر پیٹنا، بال نوچنا، زوروں سے رونا اس طرح ماتم کرنا تو یقیناً شریعت کے خلاف ہے۔ بعد ازاں انہیں یہ خیال آتا ہے کہ جنہیں مرا ہوا میں تصور نہیں کرتی پھر ان کا ماتم کیوں کروں۔ جس کے متعلق عظمت عبدالقیوم کا ہی ایک شعر کی مثال دیتے ہوئے لکھتی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی میں ہزاروں حادثے ہوتے رہتے ہیں یہ تو روح وجسم کے تقاضے ہیں مگر انسان کو زندگی کے حالات سے پریشان نہیں ہونا چاہئے۔

الغرض زمانے بدلنے اور صدیاں بیت جانے کے باوجود یعنی ایک انسان کے رحلت کے بعد بھی اس کی یادیں تو تازہ ہی رہتی ہیں جس پر تو کسی کا قابو نہیں ہوسکتا لہٰذا انہوں نے عظمت صاحبہ سے وابستہ یادوں کو ایک بہترین سرمایہ، اثاثہ اور پونجی سمجھتے ہوئے اپنے دل میں یادِ عظمت کے نام سے مقید کرتے ہوئے اس وفاتیہ کا اختتام کیا ہے۔

آواز کا مینار-سرینواس لاہوٹی:

قمر جمالی نے سرینواس لاہوٹی کی وفات پر'' آواز کا مینار سرینواس لاہوٹی'' کے عنوان سے ایک وفاتیہ تحریر کیا ہے۔ یہ وفاتیہ یکم جولائی ۱۹۹۲ء میں ناندیڑ گزٹ شمارہ: ۲۹، جلد: ۶ میں شائع ہوا۔ اس وفاتیہ میں قمر جمالی نے اپنے عہد کے ایک جاگیردارانہ نظام کے مخالف شخص جس کا نام سرینواس لاہوٹی تھا جن کی موت سے پہلے بسترِ مرگ کے حالات کو قلم بند کیا ہے۔ مصنفہ نے مرحوم سرینواس لاہوٹی کو'' آواز کا مینار'' کے لقب سے موسوم کیا ہے۔ قمر جمالی نے وفاتیہ کا آغاز مرحوم کے دواخانے میں داخلے سے کیا ہے جہاں مصنفہ بذاتِ خود ان کی عیادت

پُرسی کے لئے تشریف لے جاتی ہیں اور ان کے بستر مرگ کے حالات کو کچھ یوں رقم کرتی ہیں:

''غالباً دو ماہ قبل کی بات ہے جب میں ان سے آخری بار ملی......شناخت نہ کر سکی......وہ زندگی سے بھر پور نمایا کہیں غائب تھا صرف انسان کا ایک بچا کھچا نام رہ گیا تھا۔''(۱۳۶)

دواخانے میں مرحوم کی عیادت کا حال بیان کرتے ہوئے مصنفہ نے ان کی کمزوری اور ناتوانائی کو اس وفاتیہ کے پہلے صفحے کی زینت بنایا ہے۔ دواخانے کا نقشہ بیان کرتے ہو قمر جمالی کا بیان ہے کہ اس میں تقریباً ایک ہزار بیڈ لگے تھے۔ بعدازاں مرحوم کی زندگی اور ان کی پرانی یادوں کو ایک لفظی تصویر میں بیان کرتے ہوئے اور ان کے اظہار خواہش کے ذیل میں کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''کیا یہی وہ شخص ہے جو کمرہ نمبر ایک میں بیٹھا مجھ سے کہہ رہا تھا قمر زندگی بہت جی لی...... اب تو بس حکم کا انتظار ہے۔ زندگی میں تین چیزوں کی خواہش کی تھی۔ اچھا کھانا، اچھا پینا اور اچھی کتابیں پڑھنا۔ ان تینوں خواہشوں کی تکمیل ہوگئی اب اور کیا جینا۔''(۱۳۷)

قمر جمالی اس وفاتیہ میں مرحوم کی بہادری اور شجاعت کو بیان کرتے ہوئے ان کی بیماری کے حال میں بھی ان کی بہادری اور قوتِ برداشتہ کو سراہتے ہوئے مصنفہ نے مرحوم کو ایک آواز اور ایک تحریک کے متحرک مجاہد کے طور پر پیش کر کے انھیں اَمر قرار دیا ہے۔ ان کے جاگیردارانہ نظام اور اُردو کے مخالف سازشوں کے خلاف ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند دکھایا ہے۔ قمر جمالی نے سرینواس لاہوٹی کی موت کو اُن کی حیات سے تعبیر کرتے ہوئے انہیں لوگوں کی آواز کے مشابہ قرار دیا ہے۔ مزید وہ اُن کی وفات کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے انہیں مردِ مجاہد کے نام سے یاد کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''۲۹رمئی ۱۹۹۲ء ساڑھے بارہ بجے اس آواز نے سرینواس لاہوٹی کے جسم سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ بانسری ٹوٹ گئی۔ مگر الاپ بے سُرا نہیں ہوا کیوں کہ سرینواس لاہوٹی اُس مرد مجاہد کا نام ہے جس نے اپنے اطراف آوازوں کا ہالہ بنالیا تھا، غلامی کے خلاف، جاگیر دارانہ نظام کے خلاف۔''(۱۳۸)

اس عیادت کے دوران مرحوم مصنفہ کے تخلیقی سفر کے بارے میں ان سے سوالات کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے لکھتے رہنے کا سفر جاری رکھنے کی تلقین سرینواس لاہوٹی کچھ یوں کرتے ہیں:

''آج کل تمہاری آواز سنائی نہیں دیتی لکھتی رہنا مشق ٹوٹ جائے گی۔''(۱۳۹)

مصنفہ اس بات کا برملہ اعتراف کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ مرحوم ہر محفل میں انہیں کسی نہ کسی طرح کی ہدایت دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ مصنفہ کی باتوں سے لگتا ہے کہ مرحوم سے ان کا رشتہ استاد اور شاگرد کی طرح رہا ہے۔

بالآخر وہ سرینواس لاہوٹی کو مجاہد اُردو، ادب نواز اور ادب دوست، نئی نسل کے سرپرست کے ناموں سے یاد کرتے ہوئے اور یہ لکھتی ہیں کہ مرحوم آج ہمارے درمیان نہ ہونے کے باوجود بھی ان کی آواز دل میں سما کر خود مجسم بن کر ہر دل میں زندہ رہنے کی آرزو کے ساتھ وفاتیہ کا اختتام کیا ہے۔

اے راحتِ جاں:

قمر جمالی نے اپنی چھوٹی بہن ساجدہ سلطانہ کی وفات پر ''اے راحتِ جاں'' کے عنوان سے ایک وفاتیہ تحریر کیا ہے۔ یہ وفاتیہ ۲/اپریل ۲۰۰۶ء کو تخلیق کیا گیا جس کو قمر جمالی نے اپنا تیسرا افسانوی مجموعہ ''زہاب'' میں شامل کیا ہے۔ جو دسمبر ۲۰۰۷ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔

قمر جمالی نے اس وفاتیہ کی ابتداء شاؔذ تمکنت کے ایک شعر سے کیا ہے۔ جب وہ رویندرا بھارتی تھیٹر میں ''غزل اُتسو'' کے اہتمام میں گائی جانے والی غزلوں کا مزہ لے رہی تھی تو جب مغنی نے شاؔذ کا ایک شعر پڑھا تو قمر جمالی کے آنکھوں میں آنسو جاری ہوگئے اور سانس لینا بھی دشوار ہوگیا۔ چونکہ مصنفہ نے شاؔذ کے ایک شعر کی مثال دیتے ہوئے لکھتی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وقت ہماری زندگی کا ایک اہم حصہ ہے یہ بغیر رکے آگے بڑھتا رہتا ہے لہٰذا وقت کے ساتھ عمر بھی گزرتی چلی جاتی ہے اور قائم نہ رہنے اور ٹوٹنے والی امیدوں اور تقاضوں کے ساتھ ساتھ ذاتی زندگی کے دکھ درد کا اظہار کرتے ہوئے اپنی بہن ساجدہ سلطانہ کی موت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ۱۶/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو اپنی بہن کی موت کی اس بے وفائی کو برداشت کرنے اور ان کی وفات کے بعد انہیں نہلا دھلا کر نیا لباس زیب تن کر کے، خوشبو اور عبید سے معطر کر کے ساجدہ سلطانہ کو زمین کے حوالے کرنے کے لئے اپنے ہاتھوں سے رخصت کرنا جس کو وہ قیامت سے تعبیر کرتی ہیں۔ مزید انہوں نے ساجدہ سلطانہ کے انتقال پر انہیں جس قدر صدمہ پہنچا اس کا ذکر کیا ہے۔ غم کی اس گھڑی اور رنج والم کی کیفیت میں اپنے تاثرات وجذبات اور احساسات کا اظہار کرتے ہوئے وہ نہایت ہی دکھ بھرے انداز میں یوں لکھتی ہے:

''وہ تو یوں گئی جیسے کوئی مسافر بس اسٹینڈ پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے کوئی ریز روڈ
سیٹ اس کے لئے مختص کر کے رکھی گئی تھی۔
واقعی بس آئی۔ لگا اُسی کے لئے رکی۔ وہ ہاتھ سے وداعی اشارہ کرتی ہوئی بس میں سوار
ہوئی کہ بس یہ جا......وہ جا......ہم حیران وہیں کھڑے رہے۔
چشم زدن میں کیا کچھ ہوگیا......!!
ہمارا تو مطلع حیات صاف ہوگیا۔ بالکل کورے کاغذ کی طرح۔
لگا وہاں نہ حیات کی لکیریں باقی ہیں۔
اور جینے کی چاہ......
امیدیں روئی کے گالوں کی طرح فضاء میں اُڑ کر ہمارے اطراف پھر پریاں بھرنے لگیں۔
ہم نے سوچا شاید صورِ اسرافیل پھونکا جاچکا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ بس......نہ سوار۔
پھر......؟
کیسے گئی؟ کہاں گئی......!!
کیا وہ جانتی تھی کہ وہ بس کے انتظار میں کھڑی ہے؟'' (۱۴۰)

مزید وہ ان کی صحت خرابی کا ذکر کیا ہے ساجدہ سلطانہ کو سانس لینے میں دقت محسوس ہو رہی تھی تو مصنفہ کا خیال تھا کہ جب آکسیجن ملتے ہی ٹھیک ہوجائے گی مگر خدا کی مصلحت کون جانے، ساجدہ جب اس تکلیف سے گزر رہی تھی تو مصنفہ کہتی ہے کہ اگر انہیں پہلے محسوس ہوتا کہ وہ اپنی سانسوں کی ڈور کی ضامن لگا کر ساجدہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی۔ جب کہ وہ انہیں کے قریب تھیں مگر کچھ نہ کہہ پانے کا غم کا اظہار کیا ہے۔ جب ساجدہ سلطانہ کو گھر والے انہیں تیسری منزل سے دوڑے دوڑے دواخانہ لے جارہے تھے تو اس وقت ساجدہ نے انہیں فرش پر لٹانے کی آرزو کرتی رہی۔ مگر ان کے گھر والوں نے ان کی باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ انہیں گھسیٹ کر دواخانہ لے جارہے تھے مگر گھر کے باہر نکلنے سے قبل ہی ان کی روح پرواز کرگئی۔

الغرض قمر جمالی نے وفاتیہ اے راحتِ جاں میں ساجدہ سلطانہ کی بیماری کی حالت بیان کرتے ہوئے اُن کی اس حالت کو دیکھ کر ان کے تمام فردِ خاندان نے جس اذیت ناک درد سے گزرا اس کا تذکرہ کیا ہے اور مصنفہ نے اپنی بہن کے بچپن سے جڑی یادوں کی ایک لفظی تصویر کشی کی ہے جس کا منظر آنکھوں کے سامنے سے پھر جاتا ہے اس

سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''میری ننھی سی جان......!

میری بہن......

جسے ہم نے مادرزاد نہلایا دھلایا، اپنے ہاتھوں کپڑے سی سی کر پہنائے۔گڑیا کی طرح سجا کر سنوار کر عید بقر عید کو محلے کی گلیوں میں دوستوں سے ملنے جاتی تو جھانک جھانک کر دور تک لہراتی دیکھ کر ہزار جان سے خوش ہوا کرتے۔

ایسی تھی وہ......

پھولوں سی مہکتی۔

معصوم لڑکھڑاتی

لہروں سی چنچل

ہواؤں سی شریر، چلبلی......

اکثر میرے حصے کی مٹھائی کھا جاتی، اور کہتی میں جانتی تھی دیدی آپ کو مٹھائی پسند نہیں۔ ہاں! وہ خوب جانتی تھی۔ میری پسند...... ناپسند۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتی تھی کہ وہ مجھ سے پہلے اس دنیا سے کوچ کرے۔ بہت چھوٹی تھی وہ مجھ سے۔

پورے دس سال۔

مگر......کرگئی نافرمانی۔

مجھے بتائے بغیر۔ مجھ سے اجازت لئے بغیر چلی گئی نا اس دنیا سے۔ میری ننھی سی پری جان!''

(۱۴۱)

مزید وہ ساجدہ سلطانہ کے مرض کے متعلق تفصیلات فراہم کرتے ہوئے اظہار خیال کیا ہے کہ ساجدہ کو پیدائشی دل میں سوراخ تھا۔ بیس برس تک ریڈیالوجسٹ نے ان کا علاج کیا مگر وہ ۱۶/ اکتوبر ۲۰۰۵ کی شام ساڑھے پانچ بجے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئی تو مصنفہ درد بھری کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ان کی زندگی بھی ساجدہ کے تعاقب میں پیچھے پیچھے بہت دُور نکل گئی اور اندر سے اپنے آپ کو خالی محسوس کرتی ہوئی اپنے جسم کو ایک خالی پٹارہ سے تعبیر کیا ہے۔ الغرض قمر جمالی کو اپنی بہن کی موت سے ان پر ایک غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور دل سے بے قابو ہوگئیں۔ بالآخر ان کی تدفین کے بعد بہن کو سارے آلام سے نجات مل جانے اور جنت میں ان کا عالی شان محل تیار

رہنے کی بشارت کے ساتھ ان کی مغفرت کی دعاء کرتے ہوئے وفاتیہ کا اختتام کیا ہے۔

آہ! رفیعہ آپا!

قمر جمالی نے ایک اور وفاتیہ رفیعہ منظور الامین کے انتقال پر ''آہ رفیعہ آپا'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ وفاتیہ ۱۴/ اگست ۲۰۰۸ء کو لکھا گیا جو روزنامہ سیاست میں ۱۹/ اگست ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس وفاتیہ میں انہوں نے رفیعہ منظور الامین سے اپنے تعلقات، ان کے حلیہ، ن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور ان کی عادات واطوار پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ قمر جمالی، رفیعہ منظور الامین سے عقیدت کی حد تک محبت کرتی تھیں۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر ان پر کیا گزری اس کا ذکر کرتے ہوئے ان کا سراپا بیان کا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''ویسی ہی سڈول، خوبصورت سی، مناسب قد قامت، مناسب جسامت، کھلتا ہوا گندمی رنگ جو کبھی سفید رہا ہو۔ ستواں ناک اور مسکراتے ہوئے ہونٹ اور سب سے خاص کر کمر پر لہراتی ہوئی چوٹی جو گھٹنوں سے نیچے اُتر آتی تھی۔'' (۱۴۲)

زیر نظر مضمون میں قمر جمالی! رفیعہ منظور الامین کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے اپنا اظہار خیال کیا ہے کہ برین ٹیومر کے آپریشن کے دوران رفیعہ کے بالوں کو نکال دیئے جانے پر انہوں نے انگریزی طرز پر بالوں کو تراشنا شروع کیا تو وہ اور خوبصورت نظر آتی تھی مگر قمر جمالی کے دل کے نگاہ خانوں میں وہی خوبصورت سی لمبی بالوں والی رفیعہ منظور الامین کی تصویر کا نقش ہی قائم تھا۔ جس سے ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مصنفہ کو رفیعہ منظور الامین کے تیئں جس حد تک دلی لگاؤ ہے، جس کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ قمر جمالی نے مزید رفیعہ منظور الامین کی آنکھوں کی خوبصورتی کو فیض کے ایک مصرعے کی مثال دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہے:

> ''میٹھی سی مسکراہٹ، کھلی ہوئی بادامی آنکھیں، دراصل آنکھیں ہی تو تھیں ان کی جو لمحہ بھر میں صدیوں کی داستانیں سناتی تھیں۔ بولتی ہوئی محبت پاش آنکھیں۔ ٹھنڈی شبنمی آنکھیں!!'' (۱۴۳)

آگے وفاتیہ نگار نے رفیعہ منظور الامین کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے ہمسفر منظور الدین صاحب، رفیعہ منظور الامین سے کس قدر والہانہ انداز میں پیار کرتے تھے جس کا ذکر کیا ہے۔ اور رفیعہ منظور الامین کی

شخصیت میں اخلاص وحمیت اور اپنائیت کی تعریف کرتے ہوئے ایک واقعہ کے حوالے سے ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ بعدازاں قمر جمالی نے رفیعہ منظورالامین کی تخلیقی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی کہانیوں میں پائی جانے والی خصوصیات وموضوعات کا جائزہ لیا ہے۔ الغرض قمر جمالی کا خیال ہے کہ حیات کے نشیب وفراز و ماضی کی شاندار روایتیں اور بدلتے اطوار کے ساتھ سماج کے الگ الگ طبقوں سے تعلق رکھنے والے کرداراوران کے مسائل کو پیش کرنے کا انداز جو رفیعہ کے ہاں ہے وہ کسی بھی خاتون تخلیق کار سے توقع نہیں کی جاسکتی جس کو رفیعہ منظور الامین نے اپنے مشاہدہ کے تحت اتنے بھرپور انداز میں پیش کرتی ہیں کہ وقت کے ساتھ بھولی نہیں جاسکتی بلکہ ہر دور میں اپنی انفرادیت قائم رکھتی ہیں۔ بالآخر قمر جمالی نے رفیعہ منظورالامین کے لئے مغفرت کی دعا کرتے ہوئے کہ رفیعہ اس دنیا میں اپنی کہانیوں، سینکڑوں کرداروں اور قارئین کے دلوں کی دھڑکنوں میں ہمیشہ زندہ رہنے کی آرزو کے ساتھ وفاتیہ کا اختتام کیا ہے۔

آہ! راج انکل بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

قمر جمالی نے ''راج بہادر گوڑ صاحب کے انتقال پر آہ! راج انکل بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا'' کے عنوان سے ایک وفاتیہ لکھا ہے۔ یہ وفاتیہ ۹/اکتوبر ۲۰۱۱ء کو لکھا گیا جو ماہنامہ قومی زبان میں نومبر ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے راج بہادر گوڑ صاحب پر تین شخصی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اس وفاتیہ کی ابتداء میں گوڑ صاحب کی وفات سے تین دن قبل قمر جمالی کو راج بہادر گوڑ صاحب کی بری طرح سے یاد آنے پر وہ راج بہادر گوڑ صاحب کی بیوی اودھیش رانی کو فون کرتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ راج بہادر گوڑ صاحب بہت نازک حالت سے گزر رہے ہیں تو وہ فوراً راج بہادر گوڑ صاحب کے گھر پہنچتی ہیں اور راج بہادر گوڑ صاحب کو بالکل ساکت آواز دیکھ کر قمر جمالی پوری طرح سے دہل جاتی ہے۔ بعدازاں وہ راج بہادر گوڑ کے گھر والوں کی ہمت باندھتی ہوئی قمر جمالی کے گوڑ صاحب سے جس طرح کے تعلقات رہے ہیں جس کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت میں محبت وشفقت کے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے جذبات وکیفیات کا ذکر وہ یوں کرتی ہے کہ:

> ''بہت دیر تک راج انکل کے ساتھ رہ کر ہم لوٹ آئے۔ مگر دامنِ دل کا کنارہ وہیں ٹکارہ گیا۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔ دراصل راج بہادر گوڑ صاحب سے ہمارے تعلقات باپ بیٹی جیسے تھی۔ جب تک وہ ہوش میں رہے انہوں نے اپنے پدرانہ شفقتوں میں کبھی کوئی کنجوسی

نہیں کی۔ خاندان کے تمام افراد بھی اتنے فراخ دل کہ راج صاحب چاہے جس پر محبتیں
لٹائیں انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ الٹا فخر محسوس کریں گے۔ ان کی بڑی صاحبزادی ہم سے
ایک دن چھوٹی ہے۔ ہمیں دل سے بڑی بہن مانتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ راج صاحب سے
جو بھی ملتا وہ یہی سمجھتا کہ راج صاحب صرف انہیں کو چاہتے ہیں۔'' (۱۴۴)

قمر جمالی کے یہاں اکتوبر بروز جمعہ سوا آٹھ بجے راج بہادر گوڑ کی بڑی بیٹی تمارا گوڑ کا فون آتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ قمر! سب کچھ ختم ہو گیا پاپا چلے گئے۔ قمر جمالی کہتی ہیں کہ بالکل انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ الغرض گوڑ صاحب کی وفات کی خبر سن کر قمر جمالی اور ان کے تمام فردِ خاندان پر جو صدمہ پہنچا اور وہ جس دردناک تکلیف سے گزرے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ راج بہادر گوڑ صاحب کی وفات کے بعد ان کی جسد خاکی کو مخدوم بھون میں دیدار کے لئے رکھا گیا تو خاندان کے لوگوں کے ساتھ ساتھ سیاسی لیڈر کیا ٹریڈ یونینسٹ ہر مذاق اور مزاج کے آدمی کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ جب ان کی جسد خاکی کو عثمانیہ میڈیکل کالج کے حوالے کیا جا رہا تھا تو کامریڈز تھوڑی تھوڑی دیر سے راج بہادر امر رہے کے نعرے لگا رہے تھے تو قمر جمالی کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ راج بہادر گوڑ واقعی امر ہے کیوں کہ راج بہادر گوڑ ایک شخص کا نام نہیں بلکہ وہ تو اپنے آپ میں ایک مکمل قوم تھے۔ لہٰذا قمر جمالی نے راج بہادر گوڑ کی وفات کے غم کو صرف ان کے خاندان اور دیگر اقرباء کا ہی نہیں بلکہ پورے حیدرآبادیوں کے غم سے موسوم کیا ہے۔ بعد ازاں قمر جمالی نے راج بہادر گوڑ کی شخصیت، سیرت و کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ مزید قمر جمالی نے راج بہادر گوڑ کی کتابوں کو متاعِ حیات سے تعبیر کرتے ہوئے وفات سے پہلے راج بہادر گوڑ نے اُردو ہال کے کتب خانے میں اپنی کتابیں محفوظ کرانے کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی راج بہادر گوڑ صاحب نے عثمانیہ میڈیکل کالج جہاں سے انہوں نے M.B.B.S. کیا تھا۔ تحقیق کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے انہوں نے ان کا جسم خاکی کو عطیہ بطور دینے کی وصیت جو کر رکھی تھی جس کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی نفساتی و ذہنی کیفیات و تغیرات اور ان کی شریف النفسی پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''راج انکل کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ دن میں بھی اور رات میں بھی۔ ان کی ساری
دولت تو خود ان کے اندر مضمر تھی۔ ان کی شریف النفسی، ان کی انسان دوستی اور ان کی
املاک ان کی کتابیں تھیں جو دیوار سے لگی شیلفوں میں سجی ہوئی تھی۔ وہ تو خود چاہتے تھے
کہ کوئی ہمت والا چور اندر آئے اور ان دو چیزوں میں سے کچھ چرا کر لے جائے۔ نیک

نفسی یا کتابیں پڑھ لکھ کر انسان بن جائے گا......قہقہہ لگاتے اور سامنے والے کو بھی ہنسنے پر مجبور کرتے۔''(۱۴۵)

بالآخر راج بہادر گوڑ صاحب کی ادبی وسماجی وسیاسی خدمات کے تئیں قمر جمالی اپنے جذبات و کیفیات اور تاثرات کا بیان کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو صرف اُردو کا علمبردار، قومی یکجہتی کا نادر نمونہ، مزدوروں کا رہنما، غریبوں کا مسیحا اور ناانصافیوں کے خلاف آہنی ہتھیار کہنے سے بات مکمل نہیں ہوجاتی کیوں کہ وہ تو ہر مجبور اور ضرورت مند کا آسرا تھے۔ دن میں سورج کی تمازت اور رین بسیرا کے لئے ایک تناور درخت تھے۔ ایک ایسا سمندر جو اپنے ہم نفسوں کے دکھ، درد اور کثافت کو لہروں کے دوش پر بہت دور تک بہالے جائے...... اور ایک ایسا شخص جو دوسروں میں حیات بانٹتا پھرے۔

موت برحق ہے۔ ہر پیدا ہونے والے ذی روح مرتا ضرور ہے۔

پھر بھی ان ساری تسلیوں کے باوجود دل کے اندر ایک احساس ہے جو بار بار آواز دیتا ہے۔

جو بانٹتے پھرتے تھے حیات ابدی شاذؔ
وہ لوگ بھی مرجاتے ہیں معلوم نہیں کیوں''

(۱۴۶)

اس اقتباس سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ موت نہ نیک صالح لوگوں پہ رحم کھاتی ہے، نہ ظالموں کو بخشتی ہے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والوں کو بھی موت اپنے گلے لگا لیتی ہے اور گھر بیٹھنے والوں کو بھی موت نہیں چھوڑتی۔ اخروی اور ابدی زندگی کو دنیاوی اور فانی زندگی پر ترجیح دینے والے بھی موت کی آغوش میں سوجاتے ہیں اور دنیا کے دیوانوں کو بھی موت اپنا لقمہ بنالیتی ہے۔ الغرض موت اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ موت سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تمام مخلوقات پر اس کا مکمل تسلط عیاں ہوتا ہے۔

آہ! فریدہ زین- ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے:

قمر جمالی نے ایک وفاتیہ ''آہ! فریدہ زین- ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ وفاتیہ انہوں نے ۸/اگست ۲۰۱۵ء کو تخلیق کیا جو روزنامہ منصف میں ۲۴/ستمبر ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔ اس

کے علاوہ یہ وفاتیہ .P.W.A فریدہ کے تعزیتی جلسے میں بھی پڑھا گیا ہے۔قمر جمالی نے اس وفاتیہ میں فریدہ زین سے اپنی دوستی کا ذکر کرتے ہوئے ان کے حالات زندگی، شخصیت وسراپا اور ان کی ازدواجی زندگی ، ان کی ادبی خدمات واعزازات اور ان کی بیماری اور وفات پر روشنی ڈالی ہے۔

دوستی ایک بہت ہی قیمتی اور خاص رشتہ ہوتا ہے۔جس کا سچا دوست ہو وہ انسان اس دنیا میں خوش قسمت ہے۔ کیوں کہ ایک حقیقی دوست ہمارے جذبات کو سمجھتا ہے اور ان پر قابو پانے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ایک سچے دوست کی ہمیشہ ہر انسان کو تلاش کرنا چاہئے کیوں کہ سچا دوست خدا کا سب سے خوبصورت اور قیمتی تحفہ ہوتا ہے۔ دوستی کسی بھی شخص کی زندگی میں ایک ستون کی حیثیت سے کام کرتی ہے جو اسے نازک وقتوں میں ثابت قدم رہنے میں مدد دیتی ہے اور زندگی کے مشکل اوقات میں معاون ثابت ہوتی ہے۔لہٰذا جو انسان دوستی کی قدر کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں خوش رہتا ہے۔الغرض قمر جمالی،فریدہ زین سے چالیس سالوں پر محیط انہی دوستی کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہے کہ ان چالیس سالوں میں چالیس بار بھی فریدہ زین سے شخصی ملاقات نہیں ہوئی پھر بھی ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں رہی جس کو ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ اظہار خیال نہیں کیا ہو یعنی ہمارے دلوں میں پیدا ہونے والے جذبات واحساسات اظہار کرنے سے پہلے ہی ہمارے ذہنوں تک اُس کی رسائی ہو جاتی تھی۔

الغرض قمر جمالی اور فریدہ زین کے تعلقات بہت گہرے رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ قمر جمالی کی کہانیوں میں فریدہ زین اور فریدہ زین کی کہانیوں میں قمر جمالی کی جیتی جاگتی تصویر ملتی ہے۔قمر جمالی نے فریدہ زین کو بہت قریب سے دیکھا تھا اسی لئے ان کی وفات پر قمر جمالی کو بہت دکھ ہوا کیوں کہ ایک انسان جب اس دنیا میں رہتا ہے تو اس کے دل میں کئی تمنائیں اور ارمان ہوتے ہیں وہ ان ارمانوں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے مگر جب انسان کی وفات ہو جاتی ہے تو اس سے جڑے تمام رشتوں کو اس کے مرنے کا افسوس رہتا ہے کیوں کہ وہ اپنے ارمانوں کو پورا نہیں کر پاتا۔لہٰذا قمر جمالی کہتی ہیں کہ انسان کے دل کے اندر کئی اکائیاں یعنی محبتوں اور نفرتوں کی گھر بنائے رہتی ہیں۔ جب یہ اکائیاں ٹوٹتی ہیں تو بہت درد ہوتا ہے۔اس سلسلے میں قمر جمالی فانیؔ کے ایک شعر کی مثال دیتے ہوئے کہتی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حوادثات کی زد میں آ کر یہ اکائیاں جب ٹوٹتی ہیں تو دل کی زمین لرز جاتی ہے اور ایسی تکلیف وگھبراہٹ ہوتی ہے کہ وجود ریشہ ریشہ بکھر جاتا ہے اور ذہن ناتواں وکمزور ہو جاتا ہے۔

الغرض قمر جمالی اپنے ایک خاص دوست کے گزر جانے کا دکھ کا اظہار بڑے دلنشیں پیرائے میں بیان کیا

ہے۔وفاتیہ نگار مزید فریدہ زین کی ازدواجی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتی ہیں دونوں میاں بیوی کے اندر ایک نیک جذبہ تھا جن کے دل سادہ لوح اور سادہ مزاج حقوق العباد کو حقیقی معنوں میں سمجھتے ہوئے زندگی گزارتے تھے بالخصوص جب یہ دونوں اولاد سے محروم ہوئے تو اس کمی کو پورا کرنے کے لئے فریدہ زین نے 'فلاورزون' اسکول قائم کرکے اس کمی کو پوری کرلی۔مگر جب زین صاحب کی اچانک موت سے فریدہ دل برداشتہ ہوکر مدرسہ بھی بند کردی جس کے بعد وہ ہر خوشی سے محروم ہوگئیں تو دوسری طرف فریدہ زین کے خاندان میں ایک ایک کرکے داغ مفارقت دیے گئے تو پوری طرح ان صورتوں نے انہیں توڑ کے رکھ دیا نتیجتاً وہ ذیابیطس کا شکار ہوگئی۔فریدہ کے چاہنے والے ان کے تمام گھر والے جب ان کا ساتھ چھوڑ کر دنیا سے چل بسے تو فریدہ زین اسی غم میں اکثر بیمار رہا کرتی تھی۔قمر جمالی اس سلسلے میں فریدہ زین کے جذبات واحساسات کو بیان کیا ہے ملاحظہ کیجئے:

''میں نے اپنوں میں خوشیاں کم اور درد زیادہ بانٹے پھر بھی یہ پاگل لوگ مجھے ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔''(۱۴۷)

مزید وہ لکھتی ہیں کہ فریدہ زین ان تمام صدموں وحالات سے ٹوٹی نہیں بلکہ اپنی زندگی سے پیار کرتی رہی اور خدا تعالیٰ سے کبھی کوئی شکایت نہیں کیا کرتی بلکہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے ہمیشہ شکر بجالاتی۔قمر جمالی فریدہ زین کو ایک حساس خاتون قرار دیا ہے۔چوں کہ سماج میں پھیلی برائیوں کو دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھتا تھا۔اسی تڑپ کو انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ پیش کرتے ہوئے بہت کچھ لکھا ہے۔

الغرض قمر جمالی ان کی لکھی گئی چند افسانوں وڈراموں،مضامین کے مجموعوں پہ روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تمام کتابوں پر ملے اکاڈمی ایوارڈ اور دیگر حاصل ہوئے ایوارڈز کا ذکر کیا ہے۔مصنفہ نے فریدہ زین کی آخری کتاب ''آئینہ احساس کا''،جس کی رسم اجراء کی تصویر جناب زاہد علی خاں صاحب ایڈیٹر سیاست جاری کیا تو قمر جمالی وہ خبر پڑھتے ہی فریدہ زین سے شکوہ کرتی نظر آتی ہیں۔جس پر فریدہ زین نے جو جوابات دیے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی باتوں سے اکتفاء کرتے ہوئے فریدہ زین کو ہندوستان کی اچھی افسانہ نگاروں میں شمار کیا ہے۔مگر وہ جس مقام کی حق دار تھی وہ جائز مقام فریدہ کو نہ ملنے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس کی ذمہ دار خود فریدہ زین کو ٹھہراتے ہوئے کہتی ہیں کہ وہ نام اور شہرت سے دور رہ کر وہ اپنی ذات کو قارئین میں بانٹ کر مطمئن رہتی۔

قمر جمالی کے خیال میں ان کی ادبی سماجی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ جب بھی اردو ادب کی

تاریخ لکھی جائے گی تو ان کا نام جلی حرفوں میں لکھے جانے کے آرزو کے ساتھ بالآخر انہوں نے فریدہ زین کی وفات کی تفصیلات فراہم کرتے ہوئے اپنا اظہار کیا ہے کہ ان کی زندگی میں فریدہ زین کی جو کمی محسوس ہوگی اس کو کوئی پُر نہ کرنے کے خیال کے ساتھ وہ مزید ایک شعر کی مثال دیتے ہوئے لکھتی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ البتہ وقت کے ساتھ زندگی گزر رہی جائے گی مگر فریدہ زین کے بنا ان کی زندگی بہت اداس و بے قرار گزرنے کے غم کا اظہار خیال کیا ہے الغرض مذکورہ وفاتیہ میں قمر جمالی کو فریدہ زین سے جو بے لوث محبت ہے اس کا برملا اظہار ملتا ہے۔

آہ! راشد بھائی کیسے راوی داستاں کی داستاں کھا جائے گا:

قمر جمالی نے ''کیسے راوی داستاں کی داستاں کھا جائے گا'' کے عنوان سے ایک وفاتیہ تحریر کیا ہے۔ یہ وفاتیہ ۲۱ر ستمبر ۲۰۱۶ء کو لکھا گیا جو ماہنامہ سب رس میں جنوری ۲۰۱۷ء کو شائع ہوا۔ قمر جمالی نے وفاتیہ کا آغاز فراق گورکھپوری کے ایک مصرعہ سے کیا ہے جس کا خلاصہ یہ کہ کئی بھولی بسری کہانیاں دل سے یاد آ گئیں کے سرخی کے تحت اپنا اظہار خیال کرتے ہوئے راشد آزر کے ساتھ سینتیس سالوں سے وابستہ یادوں کی ایک لفظی تصویر بیان کرتے ہوئے ان کا حلیہ و شخصیت بیان کیا ہے اور راشد آزر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو کر جو خدمات انجام دیں ہے اس کا جائزہ لیا ہے۔ الغرض قمر جمالی، راشد آزر کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کا سراپا بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''بوٹا سا قد، سرخ و سفید بے داغ رنگت، پینتالیس/ پچاس کا سن، سر پر کے بال، سفید کرتا پاجامہ، پاؤں میں چڑھاوے اور موسم کے لحاظ سے کندھے پر شال اوڑھے جب وہ سوا چھ بجے انجمن کے جلسہ گاہ آتے تو لوگ اپنی گھڑیوں کی طرف دیکھنے لگتے۔'' (۱۴۸)

بعد ازاں انہوں نے راشد آزر کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے اراکین کی تفصلات فراہم کرتے ہوئے اپنا اظہار خیال کیا ہے۔

مختصراً یہ کہ جب قمر جمالی انجمن ترقی پسند مصنّفین میں داخلہ لیا تو اس وقت راشد آزر انجمن ترقی پسند مصنّفین کے صدر تھے۔ اور جناب صلاح الدین نیر جنرل سکریٹری، اس وقت انجمن نہایت سنجیدہ اور ثقہ قسم کے ادیبوں و دانشوروں اور شاعروں مرد و خواتین کا گہوارہ تھا۔ جسے قمر جمالی نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی جلسوں میں شرکت کرنے والے اُردو، ہندی، تلگو ادیبوں، دانشوروں کے چند نام گنوائے ہیں۔

چنانچہ Progressive writers Association (P.W.A.) کا ایک طرح سے کمیونسٹ پارٹی سے الحاق رہا۔اس لئے ثقہ قسم کے اصول پرست کمیونسٹ انجمن کے رکن رہے ہیں۔

الغرض قمر جمالی انجمن کے سخت اصولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب راشد آزر کی علمی وادبی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے اور انہیں لفظوں کا پارکھ یعنی محاورے، استعارات وتشبیہات اور تراکیب کو راشد آزر کی شناخت قرار دیا ہے۔ وفاتیہ نگار مزید کہتی ہے کہ راشد آزر کو تراکیب کی بڑی سوجھ بوجھ تھی اگر کوئی دو زبانوں کے لفظوں کو جوڑ کر تراکیب بنالے تو وہ سخت غصہ ہوجاتے تھے۔اسی طرح قمر جمالی بھی محاوروں کو مسخ کر کے استعمال کرنے پر وہ گوارہ نہیں کرتی ۔قمر جمالی مزید لکھتی کہ راشد آزر خود کو لامہذب کہنے میں کوئی تردد نہیں ہوتا تھا کیوں کہ وہ خود کو کمیونسٹ سمجھتے تھے۔

الغرض قمر جمالی راشد آزر کو ایک سچے کمیونسٹ اور ایک کٹر قسم کے اصول پرست قرار دیتے ہوئے وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہ کر انہوں نے اپنے اصولوں پر کس طرح عمل آوری کی اور اپنے اصولوں پر ہمیشہ قائم رہے اس کے متعلق ایک اقتباس پیش کیا جارہا ہے ملاحظہ فرمائیں:

> ''میں نے اپنی ماں معصومہ بیگم کے خلاف ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے لئے انتخابی مہم چلائی تھی کیوں کہ میں کمیونسٹ پارٹی کا حامی تھا۔''(۱۴۹)

بعدازاں قمر جمالی نے راشد آزر کی حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے،خلاصۂ گفتگو یہ کہ راشد آزر اپنی آخری ایام میں ترقی پسند مصنّفین کی پچیسویں کانفرنس کے بعد انہوں نے انجمن اراکین سے علیحدگی اختیار کر لی اور گوشہ نشین ہوگئے مگر قلم اور قمر جمالی سے روزِ اوّل سے جو رشتہ رہا وہ استوار رہا۔مزید کہتی ہے کہ مگر پہلی جیسی وہ بات باقی نہیں رہی ۔الغرض راشد آزر کا شہر حیدرآباد اور قلم سے ان کا رشتہ محبوبانہ رہا۔انہیں شہر حیدرآباد سے اس حد تک والہانہ عشق تھا کہ وہ دوسرے ممالک میں مستقل سکونت پذیر ہونے کے کئی مواقع تھے مگر انہوں نے اپنے وطن کو چھوڑنا ناگوار سمجھا کیوں کہ وہ اپنی بیوی فاطمہ بی بی کے ساتھ چالیس سال زندگی یہیں گزاری ہے۔جن کی ہجر میں انہوں نے اپنی شاعری میں ہجر کی کہانیوں اور تنہائیوں کی ہولناکیوں کو اپنی شاعری میں جذب کر کے پیش کرتے رہے۔

الغرض قمر جمالی نے اس وفاتیہ میں راشد آزر کی شعری ونثری تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شعری

خصوصیات وموضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

> ''باوجود اس کے ان کا شعری رویہ بڑا انگیختہ تھا ان کی شعری جمالیات کے تقاضے بالکل مختلف تھے۔ مثلاً ان کے اظہار میں معصومیت کی جھلک اظہار میں عشق کی وارفتگی اور برتاؤ میں ہجر کی بے چینی لیکن ان سب میں ایسا تناسب تھا کہ شاعری میں سنجیدہ فضاء بن جاتی تھی اور ایک ایسا رکھ رکھاؤ تھا کہ باوجود ہجر کی تلخیوں کے قاری انہیں رومانی فضاء سے الگ نہیں کرسکتا تھا۔''(۱۵۰)

مزید انہوں نے ان کی رباعی گوئی کا جائزہ لیا ہے ''منزلِ شوق'' راشد آزر کی ۲۰۰ رباعیوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ گوکہ ان کے رباعی گوئی مضامین عارفانہ اور صوفیانہ مسائل سے ہٹ کر اپنی رباعیوں میں فراؔق کی حسن پرستی کو اختیار کرتے ہوئے عشق اور حسن و جمال کی تصویر کو پیش کی ہے جس کو قمر جمالی نے ن کے حسن پرست ہونے کی بڑی دلیل قرار دیتے ہوئے ان کا یہ رنگ فراق کے رنگ سے ہم آہنگ کہا ہے۔ بالآخر قمر جمالی نے ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور ان کے آخری ایام وتنہائی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی وفات کی تفصیلات فراہم کرتے ہوئے راشد آزر کو منفرد لب و لہجے کے معتبر شاعر قرار دیا ہے۔ جسے قاری کبھی فراموش نہیں کرسکتا اور ان کا نام تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہنے کی آرزو کے ساتھ وفاتیہ کا اختتام کیا ہے۔

آہ! فاطمہ آپا......!

قمر جمالی نے ایک وفاتیہ ''آہ! فاطمہ آپا'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ وفاتیہ ۱۰ رمئی ۲۰۲۰ء کو تخلیق کیا گیا جو ماہنامہ قومی زبان میں دسمبر ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔ قمر جمالی نے اس وفاتیہ کی ابتداء اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کے کلمات کے سرخی کے تحت موت کی حقیقت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے اس کی تیاری ایک ضرورت -موت کی اٹل حقیقت سے انسان کی آنکھ زیادہ اوجھل ہی رہتی ہے وہ گھڑی جس سے ایک دن سب کو خدائے حقیقی سے جاملتا ہے۔ انسان اِس کے متعلق سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کے سرشت میں اللہ تعالیٰ نے امید کی ایک روشنی بھی رکھی ہے۔ یہی روشنی انسان کو جینے کا حوصلہ دیتی ہے اور دنیا اسی امید پر قائم ہے۔ الغرض قمر جمالی فاطمہ عالم علی کی رحلت پر غم کا اظہار خیال کرتے ہوئے جس میں انہوں نے فاطمہ عالم علی کی ستانوے سال کی، حالاتِ زندگی اور ان کا حلیہ وشخصیت اور ولادت، ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم

وتربیت اوران کے بچپن کا ذکر واز دواجی زندگی اوران کی علمی وادبی سماجی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔مزید انہوں نے محفل خواتین کے متعلق اظہار خیال کیا ہے کہ محترمہ عظمت عبدالقیوم صاحب کے مکان ''خیابان''امیر پیٹ میں محفل خواتین کی بنیاد۱۹۷۲ء میں پڑی۔اس مشاورت میں فاطمہ عالم علی محفل خواتین کی سکریٹری اورعظمت صاحبہ صدر رہی ہیں۔ان دونوں بزرگوں کا رویہ محفل خواتین کے ہم عصروں اور چھوٹے لوگوں کے ساتھ کیسا رہا اوران کی سیرت وکردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ان سے وابستہ عقیدت ومحبت اوران کی شفقت ومحبت نصیب ہونے پر پروردگار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے جذبات واحساسات کا ذکر کیا ہے ملاحظہ کیجئے:

''اس خاکسار پر تو ان دونوں بزرگوں کی شفقت کچھ زیادہ ہی رہی۔میری تحسین وتعریف بہ اندازِ ہمت افزائی کرتیں اور یہ احساس دلاتیں کہ مجھ سے اچھا لکھنے والی کوئی نہیں،بس یہی وہ رویہ تھا جو میرے ادبی ڈھانچے کی ہڈی میں فولاد بن کر جم گیا اور میں ان بزرگوں کی امید پر پورا اُترنے کی کوشش میں خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگی رہی۔ آج جو کچھ بھی ہوں اپنی والدہ اوران بزرگوں کی نیک تمناؤں اور امیدوں کا نتیجہ ہوں۔''(۱۵۱)

۱۹۹۷ء میں میرا اکاڈمی لکھنؤ کی طرف سے حیدرآباد کے چند ادیبوں وشاعروں کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جن میں ایوارڈ کے حق دار مرد وخواتین کو ایوارڈ کے فنکشن کے بعد لکھنؤ گھمانے کا اہتمام کیا گیا۔جب اُن کی گاڑی کرامت علی حسین کالج پر رُکی تو فاطمہ عالم علی ٹولہ گاڑی سے نیچے اُتر گئی اور حسرت بھری نگاہوں سے کرامت علی حسین کالج کو دیکھنے لگی۔

مختصراًیہ کہ قمر جمالی،فاطمہ عالم علی کی زندگی اوران کے بچپن سے جڑے چند اہم واقعات اور کرامت علی حسین کالج سے وابستہ یادوں کی ایک لفظی تصویر بیان کی ہے جس سے فاطمہ عالم علی کی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔مزید وہ فاطمہ عالم علی کی جذبات وکیفیات کا اظہار کرتے ہوئے ان کے تئیں قمر جمالی اپنے احساسات کا ذکر کرتے ہوئے یوں لکھتی ہیں:

''آج ہی آپا کے چہرے کی وہ سرخی/آنکھوں کی چمک اور فرطِ انبساط سے کبھی مسکرانا اور کبھی ملول ہونا یاد آتا ہے۔تو احساس ہوتا ہے یادیں کتنی طاقتور ہوتی ہیں۔''(۱۵۲)

فاطمہ عالم علی کا شمار ہندوستان کی معتبر انشا پردازوں میں ہوتا ہےقمر جمالی ان کی انشا پردازی اور خاکہ نگاری کے خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی سماجی خدمات پر روشنی ڈالی ہے ملاحظہ کیجئے:

''فاطمہ آپا ایک فعال سوشل ورکر بھی تھیں۔ جناب اختر حسن صاحب، سابق صدر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی بہن باجی جمال النساء کے ساتھ مل کر معاشی طور پر کمزور طبقے کی خواتین کو جمع کر کے انہیں کشیدہ کاری سکھاتیں اوران سے خوبصورت ڈیزائنر ملبوسات، ساڑیاں اور اوڑھنیاں تیار کرواتیں۔ان کی مارکیٹنگ ادارہ کرتا اوران خواتین کا محنتانہ ادا کرتا۔ آپا ہمیشہ اسی ادارے کی ڈیزائنر ساڑیاں پہنا کرتیں ۔ ایک ساڑی (پہنی ہوئی) انہوں نے مجھے بھی مرحمت فرمائی جو آج تک تبرکاً میری الماری میں لٹکی ہوئی ہے کتنی یادیں دست بستہ کھڑی ہیں۔کن کن کا ذکر کروں۔ ہر تحریر کی کچھ تحدیدات ہوتی ہیں۔میں اپنی یادوں کے پٹارے کو یہیں بند کرتی ہوں۔'' (۱۵۳)

قمر جمالی ۴؍مئی ۲۰۲۰ءکو صبح فاطمہ عالم علی کی رحلت کی خبر سن کران کے گھر فون کرتی ہیں اوران کی ملازمہ سے حالات دریافت کرتے ہوئے ان کی بیماری اور تدفین کا ذکر دکھ بھرے انداز میں بیان کرتی ہیں کہ یہ وہ دور تھا اس وقت ملک میں پھیلے کورونا وائرس وبا نے قبل از وقت قیامت کی تصویر کھینچ دی ہے۔کورونا کی تباہی نے ہر انسان کو اکیلا کر دیا تھا قمر جمالی نے اس دور کی نفسا نفسی کا عالم بیان کرتے ہوئے کورونا کے اس دور میں فاطمہ عالم علی کے لئے چار کندھے مل جانے پر غنیمت سمجھتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرتی ہوئی فاطمہ کی آخری ایام اور تدفین میں اپنوں کا ساتھ نہ ہونے پر شکوہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔جس کے متعلق ایک اقتباس دیکھئے:

''بچے آتے جاتے رہتے ہیں۔ضرورت ہو تو آئیں گے۔شاید یہی وہ امید تھی جو اس بوڑھے ناتواں جسم کو سہارے ہوئے تھی۔ (۹۷) سال کی عمر میں بھی اگر والدین اپنے بچوں سے کچھ توقعات نہ رکھیں اور اولاد بھی چھوٹی سی قربانی دینا مناسب نہ سمجھے تو پھر ......اولاد کی آرزو چہ معنیٰ دارد......؟'' (۱۵۴)

بالآخر وہ اس آرزو کے ساتھ اولادان بزرگ ماں باپ کی آخری امید کو توڑنے اور ماں باپ کے وداعی لمحوں کی اہمیت کو سمجھنے کی توفیق ہر انسان کو اللہ تعالیٰ عطا کرنے کی دعا کرتے ہوئے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں سورۂ بنی اسرائیل آیت نمبر۲۴،۲۳ میں ماں باپ کی اہمیت کو بیان کیا ہے؟ جس کو قمر جمالی نے اُجاگر کیا ہے۔الغرض

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور عزت ومحبت کے ساتھ برتاؤ کرنے اور انکساری سے پیش آنے اور ان کی خدمت کرنے کی تلقین کے ساتھ فانؔی کا ایک شعر پیش کیا ہے۔جس کا خلاصہ یہ کہ انسان کی عمر گزر ری جاتی ہے یعنی حالات جیسے بھی ہوں عمر گزر رہی جاتی ہے مگر آخر موت ہے اور مر مر کے جینے کا نام زندگی ہے۔لہٰذا ہر انسان کو اپنی دنیا و آخرت کو مدنظر رکھتے ہوئے زندگی گزارنے کا پیغام سارے سماج کو نہایت ہی خوبصورت انداز میں دیتی ہوئی وفاتیہ کا اختتام کیا ہے۔

غرض قمر جمالی کے وفاتیوں کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں وفاتیہ نگاری کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔قمر جمالی کے مرحومین پر لکھے گئے وفاتیوں میں انہوں نے علم وادب شعروسخن اور سماجی وسیاسی خدمات سے وابستہ شخصیتوں کے علاوہ اپنے علاقے کی چند ایسی ممتاز گراں قدر شخصیتوں پر بھی خامہ فرسائی کی ہے جن کا تعلق براہِ راست شعروادب سے نہیں ہے۔قمر جمالی کے لکھے گئے وفاتیوں میں مقالہ کے شروع میں کوئی غم کا اظہار کرنے والی سرخی کے ساتھ جو کسی حال میں گزر جانے والے شخص کی تفصلات فراہم کرتے ہوئے اس شخص کا تعارف،حالات زندگی اور ان کی شخصیت،حلیہ،عادات واطوار اور ان کی سیرت وکردار پر روشنی ڈالی ہے اور ان سے وابستہ عقیدت ومحبت،دوستی اور چند اہم واقعات کے ذریعے ان سے جڑی یادوں کی ایک لفظی تصویر پیش کی ہے جس کی زندہ جاوید تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے اور ذہن پر اس کا نقش قائم ہوجاتا ہے اور ممکنہ طور پر ہر تجہیز وتکفین کی تفصیلات بھی پیش کرتے ہوئے بالآخر وہ چند وفاتیوں میں سماج کو پیغام دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

سہل اسلوب اور وسیع الفہم تعبیر کے ذریعے ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ حیات وخدمات اور احوال وآثا کا پورا مرقع آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔قمر جمالی کے لکھے گئے وفاتیوں میں شخصیتوں کی محبت،عقیدت والفت کی جلوہ گری نے مندرجات کو خشک وسپاٹ ہونے سے بچالیا۔حرف حرف روشنی اور سطر سطر میں خلوص کا بحر بیکراں موجزن ہے۔مزید یہ چند وفاتیوں میں مصنفہ نے موت کی حقیقت اور وقت کی اہمیت پر بھی اپنا اظہار خیال کیا ہے۔مثلاً اے راحت جاں،اور’’آہ فاطمہ آپا‘‘،’’آہ!راج انکل بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا‘‘اس ذیل میں نہایت ہی اہم ہیں۔

ان کے لکھے گئے وفاتیوں کی خاصیت یہ کہ قمر جمالی نے جس کسی بھی مرحوم پر وفاتیہ لکھا ہے اس میں خلوص ومحبت کے ساتھ غم کا اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے جذبات واحساسات،کیفیات وتاثرات کا اظہار نہایت ہی پُر اثر

انداز میں بیان کیا ہے۔جس سے قاری کا دل بھی درد وغم سے بھڑک اٹھتا ہے۔'یادِ عظمت' اور ''اے راحت جاں'' اس ذیل میں نہایت ہی اہم ہیں کیوں کہ عظمت صاحبہ جنہیں قمر جمالی اپنی ماں تصور کرتی ہے اور اپنی بہن ساجدہ سلطانہ ان دونوں بہنوں اور ماں بیٹی کا رشتہ جو جذباتیت پر مشتمل ہے جس میں پائی جانے والی محبت کا کوئی نعم البدل موجود نہیں۔

الغرض قمر جمالی ایسی شخصیات کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے جو اپنی بیش بہا علمی، ادبی، سیاسی، سماجی دنیا سے جڑے ادب دوست رہے ہیں۔خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ قمر جمالی نے اپنے لکھے گئے وفاتیوں میں شخصی مرثیہ نگاری کے بہترین نمونوں کو پیش کیا ہے۔

ط) خاکے

حیدرآباد میں آزادی سے لے کر اب تک کئی مرد تخلیق کار ہی نہیں بلکہ خواتین تخلیق کار بھی ادب کے ایوان سجانے میں مصروف ہیں۔بیسویں صدی کی اہم حیدرآبادی تخلیق کاروں میں ۱۹۷۰ء کے بعد شہرت حاصل کرنے والی خواتین میں آمنہ ابوالحسن، رفیعہ منظورالامین اور قمر جمالی کا شمار ہوتا ہے۔ابتدائی دونوں تخلیق کاروں نے اپنے فن کی نمائندگی کر کے اس دنیا سے کوچ کیا۔قمر جمالی اپنی تخلیق کے ذریعہ آج بھی سرزمینِ حیدرآباد کو سرسبز وشاداب کر رہی ہیں۔قمر جمالی نے نہ صرف افسانوی نثر پر توجہ دی بلکہ اسی کے ساتھ غیر افسانوی نثر کے فروغ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔قمر جمالی نہ صرف بلند پایہ افسانہ نگار ہیں بلکہ انہوں نے انشائیہ نگاری، رپورتاژ نگاری، سفرنامہ نگاری، مضمون نگاری اور خاکہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔بحیثیت خاکہ نگار انہوں نے تقریباً سترہ (۱۷) خاکے لکھے ہیں۔ان کے خاکوں کی ترتیب اس طرح ہے:

میانہ رو-محترم آر بانو صاحبہ (آر-بانو) ۱۹۸۰ء، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ایک شخصیت-منثور مثلّثی ۱۹۹۱ء، ثقلین حیدر ایک بہترین ناظم مشاعرہ (ثقلین حیدر) ۱۹۹۲ء، گفتار رفیعہ منظورالامین سے بات چیت (رفیعہ منظور الامین) ۱۹۹۳، ادب کا ایئر مارشل عاتق شاہ ۱۹۹۵ء، نگار سلطانہ نایاب (نگار سلطانہ نایابؔ) ۱۹۹۶ء، ڈاکٹر عزیز بانو-استادِ فارسی دانشگاہ جامعہ عثمانیہ (عزیز بانو) ۲۰۰۸ء، مردِ آہن-ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ۲۰۱۰ء، نقش رہگزر (عطیہ نورالحق) ۲۰۱۱ء، تحریم ناز (مظفر النساء ناز) ۲۰۱۱ء، نجمہ نکہت میری یادوں کے صحیفے میں (نجمہ نکہت) ۲۰۱۳ء وغیرہ۔

ان کے یہ خاکے کسی نہ کسی ادبی تقریب میں پڑھے گئے ہیں۔ان میں بعض خاکے ادبی رسالے یا اخبار میں شائع ہوچکے ہیں اور بعض خاکوں کوانہوں نے ترمیم کرتے ہوئے جن کو شخصی مضامین میں شامل کیا ہے اور بعض خاکوں کی سنِ اشاعت کی جانکاری نہیں ملتی وہ کہاں سے شائع ہوئے ہیں۔ان کے خاکوں کی خاص بات یہ ہے کہ یہ خاکے ان کے قریبی تعلقات اور دیرینہ مراسم کی بناء پر لکھے گئے ہیں۔یہ خاکے مذکورہ شخصیات سے متاثر ہونے کے بعد لکھے گئے ہیں۔مگران کے بعض خاکوں میں تحقیقی مضامین کی بھی خصوصیت پائی جاتی ہے۔

قمر جمالی نے اپنا ایک مضمون ''ادب کا ایئر مارشل عاتق شاہ'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ یہ مضمون ۲۵/جولائی ۱۹۹۵ءکوسوانحی خاکہ ''میں چیخوں گا'' کی رسم اجراء پر پڑھا گیا ہے۔جس کوانہوں نے مجموعہ انعکاس میں شامل کیا ہے لیکن یہ مضمون کم اس میں خاکہ نگاری کی بہت سی خصوصیات ملتی ہیں۔مثلاً حلیہ نگاری،موضوع،شخصیت کے عادات واطوار، اور ادبی خدمات،شخصیت سے ملاقات اور ملاقات سے اُبھرنے والے تاثرات اور ان کے زندگی کے حقیقی واقعات کو سامنے رکھ کر موضوع کی سیرت کو واضح طور پر پیش کیا ہے اور عاتق شاہ کے جذبات واحساسات کی عکاسی اوران کی ذہنی نفسیاتی کیفیات کا اظہار بھی کیا ہے۔لہٰذااس مضمون کو خاکہ نگاری کی ذیل میں رکھا گیا ہے۔چنانچہ انہوں نے عاتق شاہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی حلیہ نگاری کی ہے۔ملاحظہ کیجئے:

> ''چھ فٹ سے تجاوز کرتا قد، اونچی ناک، سر پر Berrycap، جس کے نیچے سے جھانکتے ہوئے بے ترتیب لمبے لمبے ملگجی بال، آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک جس کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی چھوٹی مگر ذہین آنکھیں، جو جانے ہمیشہ کس کے تعاقب میں لگی رہتی ہیں! چہرے پر سب سے نمایاں ان کے لمبی لمبی گھنی بے ترتیب مونچھیں جو ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے بھی چلا چلا کر اپنے وجود کا احساس دلانے لگتی ہیں کہ یہ عاتق شاہ ہے۔زندہ اور پائندہ۔''(۱۵۵)

قمر جمالی کے عاتق شاہ صاحب سے دیرینہ مراسم رہے ہیں ان کی شخصیت سے وہ مکمل واقف ہیں۔ انہوں نے ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے عاتق شاہ کی زندگی کے حقیقی واقعات کو سامنے رکھ کر ان کی سیرت کو اجاگر کیا ہے۔جس سے ان کی ذہنی،نفسیاتی کیفیات پر بھی روشنی پڑتی ہے،مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''تم اتنی بیمار ہواور مجھے پتہ ہی نہ چلا۔تم فکرمت کرو۔میں جب تک زندہ ہوں تمہارے

بال کو بھی دھکا نہیں پہنچ سکتا۔ اگر تمہیں خون کی ضرورت ہے تو میں اپنے جسم کا سارا خون دے کر تمہیں بچا لوں گا اور خود مر جاؤں گا۔ اور سچ پوچھو تو میں مروں گا بھی کہاں۔! مر کر تم میں میں زندہ رہوں گا۔ تمہارے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے میں مسکراؤں گا۔''(۱۵۶)

غرض اس پورے اقتباس سے عاتق شاہ کے خیالات میں ایک معصوم بچے کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔

خاکہ نگار نے عاتق شاہ کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی کتاب ''میں چیخوں گا'' کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کتاب شخصی مرثیے کی تاریخ میں ایک بہترین اضافہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ یوں رقم طراز ہیں:

''میں چیخوں گا'' عاتق شاہ کی تیرہویں تصنیف ہے جسے انہوں نے بجا طور پر سب ٹائٹل کیا ہے۔ سوانحی خاکہ ''میں چیخوں گا'' دراصل ان کے مرحوم بیٹے طارق شاہ کی داستانِ حیات ہے جس کی برین ٹیومر کی وجہ سے تین سال کی عمر میں وفات ہوگئی۔ یہ تصنیف دراصل ننھے طارق شاہ کی زبانی عاتق شاہ کی کہانی ہے جس میں ہزار کوشش کے باوجود عاتق شاہ ننھے طارق شاہ کے وجود سے اچھل اچھل کر باہر آ جاتی ہیں۔ اور کبھی تو کھل سے کھل کر قاری کی ہتھیلی پر مٹی مٹی بکھر جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ لمبے تڑنگے عاتق شاہ اس وقت کے ننھے طارق کے وجود میں سانس لے رہے ہیں۔ یہی ان کی حقیقت ہے۔ اور یہی عاتق شاہ کی موجودگی راز ہے۔ یہ کتاب شخصی مرثیے کی تاریخ میں بہترین اضافہ ہے۔ جس میں عاتق شاہ روتے نہیں ہیں۔ چیخنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ ایک ایسی چیخ جس میں آندھیاں لانے کی قوت ہوگی، طوفان آئیں گے اور زمین دہل جائے گی۔ یہ کیسی چیخ ہوگی—! کہیں عاتق شاہ کا اشارہ اُس صَیحَۃٌ واحدہ، کی طرف تو نہیں جس کا قرآن مجید میں بار بار ذکر آیا ہے۔ مگر نہیں۔ ابھی عاتق شاہ کو بہت لکھنا ہے۔ ابھی تو انہیں قمر جمالی سے کیا وعدہ بھی پورا کرنا ہے جو انہوں نے اس کی پہلی کتاب شبیہ کی رسم اجراء پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اُس کی کہانی 'کنارہ' کے ایک فقرے کے عوض وہ اپنا ایک مجموعہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ ابھی تو قمر نے یہ فیصلہ بھی نہیں کیا ہے کہ اُن کا کون سا مجموعہ اپنے نام منتقل کروالے۔''(۱۵۷)

قمر جمالی کا ایک خاکہ نگار سلطانہ نایاب کی شخصیت سے متعلق ہے، اس خاکہ میں انہوں نے ''نگار سلطانہ''

کے حلیے، شخصیت اور عادت واطوار پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً وہ لکھتی ہیں:

''دھواں دھواں سی اجلی رنگت، خاموش آنکھیں، سلے ہوئے لب اور حنا پستہ جوڑا (بالوں کا)، ڈھیلی ڈھائی قمیص شلوار میں، نایاب آپا خود کہیں چھپی چھپی سی رہتی تھیں۔ مگر۔کم کم بولنے والی نایاب آپا نے جب بھی اشعار کی زبان میں بات کی خاموشی کا طلسم ٹوٹ ٹوٹ گیا۔ انہیں یا تو ضرورت سے زیادہ چپ رہنے کی عادت تھی یا پھر اپنے مدعا کو بےخطر اور بے بانگ دہل کہنے کی عادت تھی۔''(۱۵۸)

اس خاکے میں نگار سلطانہ نایاب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے ایک واقعہ کے حوالے سے انہوں نے اُن کی شخصیت میں محبت وشفقت کے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی ملنساری پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''غالباً چار سال قبل انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی رکنیت لی۔ ویسے انہیں محفل خواتین میں اکثر سنا تھا۔ جہاں کی یہ بانی اراکین میں سے تھیں۔۱۹۹۴ میں دارالخلافہ میں ترقی پسندوں کے نیشنل فیڈریشن کی سہ روزہ کانفرنس ہوئی۔ بحیثیت مندوب ہمارے ساتھ دہلی چلیں۔ سفر میں انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔۔ سیدھی سادھی سی نایاب آپا ہر عمر والے کے ساتھ ویسے ہی ملتیں نہ بزرگی کا رعب جمانے کی فکر نہ اچھی شاعری کا زعم جب نیشنل فیڈریشن کے ایک اجلاس کی صدارتی مجلس میں مجھے شامل کیا گیا تو بزرگوں کی موجودگی میں مجھے خود اٹپٹا سا لگا۔ انہوں نے نہایت شفقت سے میری پیٹھ ٹھونکی اور مبارکباد دی اور اعتبار طبعی عمر کا تابع نہیں ہوتا۔''(۱۵۹)

قمر جمالی نے ایک خاکہ ''ڈاکٹر عزیز بانو استادِ فارسی دانشگاہ عثمانیہ'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ خاکہ ۵/ستمبر ۲۰۰۸ء کو تخلیق کیا گیا۔ جس کو ''عُصاصی-فردوسی ہند'' کتاب کی رسمِ اجراء پر پڑھا گیا ہے۔ اس خاکے میں انہوں نے ان کے حلیے، ان کی شخصیت کے دلنواز پہلوؤں کے علاوہ ان کے عادات واطوار اور زباں و بیاں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کا تعارف پیش کیا ہے جس سے اس شخص کیا زندہ جاوید تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے اور ذہن پر ان کا نقش قائم رہ جاتا ہے اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''شعبۂ فارسی (عثمانیہ یونیورسٹی) میں صدر شعبۂ فارسی کے اجلاس سے ملحق ایک چھوٹے

سے کمرۂ جماعت میں میز کے ایک رُخ پر درمیانی کرسی پر بیٹھی ہمیشہ لکھنے یا پڑھنے میں مشغول۔ اور شعبہ کے دروازے ہر کسی بھی آہٹ کو محسوس کرتے ہی ''السلام علیکم'' کی صدا۔ یہ تصویر ہے ہماری فارسی کی استادِ محترم ڈاکٹر عزیز بانو صاحبہ کی جن سے ہم ۲۰۰۰ء سے متعارف ہیں۔'' (۱۶۰)

اس خاکے میں قمر جمالی کو فارسی سے لگاؤ، عزیز بانو سے پہلی ملاقات اور ان سے وابستہ عقیدت، احترام، محبت اور ان کا زاویۂ فکر پر روشنی پڑتی ہے۔ خاکہ نگار نے عزیز بانو سے یادوں کی ایک لفظی تصویر بیان کرتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہیں:

''ہم نے فارسی زبان کا 'الف' محترمہ عزیز بانو صاحبہ سے ہی پڑھا۔ عمر میں میری چھوٹی بہن کے برابر مگر عقل سے سچ مچ استانی، ہم نے فارسی کی ابتدائی گرامر من/ما رتو/شما ر او/ایشان (ضمائر) ان ہی سے سیکھی۔ شاید اس کے بعد والا درجہ بھی ہم پڑھی لیتے۔ مگر اس دوران ہماری ترقی ہوگئی اور ہم ایگزیکیٹو مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہو کر محبوب نگر کے ڈویژن ناگر کرنول بھیج دیئے گئے، اور یہ سلسلہ ٹوٹ گیا'' (۱۶۱)

قمر جمالی اس خاکے میں ڈاکٹر عزیز بانو کی شخصیت کے علاوہ اپنے استادِ محترم جناب تنویر الدین خدا نمائی صاحب کا مشفقانہ التفات اور دیگر اساتذہ کرام کا تعارف پیش کرتے ہوئے فارسی زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ بعد ازاں ڈاکٹر عزیز بانو کی علمی خدمات اور ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے نہایت ہی شگفتہ انداز میں وہ لکھتی ہیں:

ڈاکٹر عزیز بانو صاحبہ نے 'عصامی، فردوسیِ ہند' لکھ کر ہم جیسے شاگردوں پر بڑا احسان کیا ہے، عصامی ارض دکن کا اوّلین فارسی شاعر گزرا ہے جو دکن کی پہلی خود مختار اسلامی مملکت کے بانی سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے دربار کا پہلا شاعر تھا۔ جو مرتبے میں برصغیر ہند کے عہد وسطیٰ کے فارسی شاعر حضرت امیر خسرو دہلوی کا ہم پلہ تھا اور خود کو سعدی ہند کہلایا۔ یہ کتاب عصامی کی تصنیف 'فتوح السلاطین' کی اُردو تلخیص ہے۔ ....ڈاکٹر عزیز بانو صاحبہ نے بھی اپنے پیش رؤں کی طرح نہایت ہی شُشتہ و شیریں اور سلیس زبان میں فتوح السلاطین کا اُردو ترجمہ بعنوان ''عصامی - فردوسی ہند'' پیش کر کے حصول علم کی راہیں استوار کی ہیں۔'' (۱۶۲)

قمر جمالی نے ایک خاکہ ''نقشِ رہگزر'' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں عطیہ نورالحق کی شخصیت کی عکاسی کی گئی ہے۔اس خاکہ میں انہوں نے ان کے حلیے ، ان کی دلنواز شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے علاوہ ان کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ یہ مضمون خاکہ نگاری کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔انہوں نے واقعات کے ذریعے بھی شخصیت کی عکاسی کی کوشش کی ہے۔عطیہ نورالحق سے ان کی پہلی ملاقات اور اس ملاقات سے اُبھرنے والے تاثرات کوانہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔جس کے ذریعے عطیہ نورالحق کے حلیے اوران کی شخصیت پرروشنی پڑتی ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''ایک ادبی محفل میں، میں نے ایک خاتون کو دیکھا جوسرتاپاعورت ہی عورت تھی، ماشاء اللہ اب بھی ہے۔سجنا دھجنا عورت کی فطرت میں شامل ہے۔یہ ان کا حق بھی ہے،مگراس عورت کا سنگار سجاوٹ دیکھ کر میری نگاہیں وہیں اٹک گئیں۔کھلتا ہوا،چمپئی رنگ، بولتی آنکھیں اور تبسم بھرے ہونٹوں والی یہ خاتون مجھے بہت پیاری لگی۔میں نے اپنے بازو بیٹھی خاتون سے پوچھا۔''یہ مشرقی عورت کا نمونہ، سرتاپا دلنواز جو میرے پیچھے بیٹھی ہیں۔کون ہے؟''

''آپ انہیں نہیں جانتیں عطیہ نورالحق ہیں۔''

انہوں نے اس اعتماد سے کہا کہ مجھے انہیں جاننا ہی چاہئے تھا۔

میں خاموش ہوگئی مگر نام کے لاحقے سے سمجھ گئی کہ محترمہ ہمارے شہر کے مشہور ایڈوکیٹ اور سابق صدر اُردو اکاڈمی آندھرا پردیش کی بیگم ہیں اس کے بعد ایک اور میٹنگ میں انہیں دیکھا مگر چپ رہی۔لیکن کچھ دیر بعد وہ خود ہی آگے بڑھیں اور کہا'' آپا۔میں آپ کو جانتی ہوں۔میں نے آپ کو پڑھا ہے۔''

ان کی باتوں میں اتنی مٹھاس اور لہجے میں اتنی اپنائیت تھی کہ بہت دیر تک ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔''(۱۶۳)

الغرض قمر جمالی کے خاکوں کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں خاکہ نگاری کے تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔انہوں نے طویل اور مختصر دونوں طرح کے خاکے لکھے ہیں۔زبان وبیان پرانہیں بھرپور قدرت حاصل ہے۔ان کے خاکوں میں تشبیہات اور محاوروں کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ان کے شگفتہ اور پرلطف اندازِ بیان

کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ و مفکرانہ انداز بھی ملتا ہے۔انہوں نے شخصیات کی حلیہ نگاری کے علاوہ ان کی عادات واطوار اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ اور شخصیت میں عقیدت ومحبت اور اخلاص وحمیت اور محبت وشفقت کے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی ملنساری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔شخصیت سے ملاقات اور ملاقات سے اُبھرنے والے تاثرات اس شخص کے جذبات واحساسات کی عکاسی اور اس کی ذہنی نفسیاتی کیفیات کا اظہار بھی کیا ہے۔غرض خاکہ نگار نفسیات انسانی سے بخوبی واقف ہیں۔

قمر جمالی نے کسی فرد کی زندگی اور اس کی شخصیت سے متعلق چند انوکھے پہلو اور منفرد پہلوؤں کو اس فن کاری سے بیان کیا ہے کہ اس شخص کی زندہ جاوید تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے اور ذہن پر اس کا نقش قائم ہوجاتا ہے۔

قمر جمالی نے اپنے خاکوں میں انہیں لوگوں کو شامل کیا ہے جن کی شخصیت قابلِ تعریف ہوں۔موضوع بحث شخصیات میں وہ ان قدروں کو تلاش کرتی ہیں جن کے وہ طرف دار ہیں۔ان کی نظر میں انسانیت کے حسن اور اس کے عظمت ورفعت کی شناسا ہیں۔

قمر جمالی نے اپنے خاکوں میں کرداروں کی اس طرح مرقع کشی کی ہے کہ ان سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور خاکہ نگار کی نہ صرف انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے بلکہ قاری کے دل میں انسانیت کا احساس بھی موجزن ہوجاتا ہے۔اوران کی خاکہ نگاری میں شائستگی اور تہذیب کا عنصر نمایاں ہے۔انسان کی محبت وجفاکشی،راست گفتاری،بے لوث محبت،جذبۂ خدمت اور وضع کرداری پر انہوں نے زیادہ زور دیا ہے۔

ان کے خاکے نہ صرف ادبی حیثیت سے اہم ہیں بلکہ اس حیثیت سے بھی معتبر ہیں کہ اس کے ذریعے جہاں ہم مختلف شخصیتوں سے واقف ہوتے ہیں وہیں قمر جمالی کی شخصیت کو بھی سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔قمر جمالی کی دوسری خاص بات یہ ہے کہ جن شخصیتوں پر انہوں نے قلم اٹھایا ان سے گہرے تعلق بھی رہے ہیں اور ان کے لئے دل میں بے حد احترام اور بہت پیار تھا یہ جذبہ ان کے خاکوں میں جھلکتا ہے۔

غرض قمر جمالی کی نثری خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

ی)صحافت

قمر جمالی کے ادبی سفر کا کارواں یہیں رکتا نہیں بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے وہ صحافت جیسے سنگلاخ میدان میں بھی اپنے کالموں اور مختلف طے شدہ عنوانات پر قلم اٹھاتی رہیں بحثیت صحافی بھی قمر جمالی نے عمدہ خدمات انجام دی ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1۔ انہوں نے حیدرآباد سے شائع ہونے والے روزنامہ "عوام" میں اکتوبر 1996ء تا اپریل 2000ء ادبی صفحہ "دھنک" کی نگران کار کی حیثیت سے انجام دی ہیں۔ وہ چار سال تک مسلسل ایک ادبی کالم مندرجہ ذیل عنوانات سے ہفتہ وار لکھتی رہی ہیں:

(الف) زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔(ادبی)

(ب) شاید آپ جانتے ہوں۔(سماجی)

(ج) داستاں" ایک چھوٹی سی کنٹری پھر کسی داستان کا ایک حصہ سلسلہ وار۔ جیسے عنوانات کے تحت ہر ہفتہ ادبی کالم لکھتی رہی ہیں۔

2۔ وہ سہ ماہی "تناظر" (اردو) کی ایڈیٹر بھی رہ چکی ہیں ہیں۔

سہ ماہی "تناظر" کی صدارت کی ذمہ داری بلراج ورما نے قمر جمالی کے سپرد کی تھی اور اس ذمہ داری کو انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ یہ سہ ماہی رسالہ پہلے دہلی سے شائع ہوتا تھا پھر بلراج ورما کے کہنے پر قمر جمالی نے ایک ایڈیشن حیدرآباد سے نکالا جس کو 1995ء میں کتھا جرنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پھر موصوفہ نے اپنی نجی مصروفیات کے سبب اس ذمہ داری کو واپس بلراج ورما کو منتقل کر دیا۔ الغرض قمر جمالی کی صحافتی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں جاسکتا ہے۔

ک)رپورتاژ

قمر جمالی نے انشائیہ نگاری، مضمون نگاری، سفرنامہ نگاری کے علاوہ رپورتاژ نگاری میں بھی اپنے قلم کو آزمایا ہے۔ انہوں نے سات (7) رپورتاژ تحریر کیے ہیں۔ ان کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں:

☆ رپورتاژ، تقسیم ایوارڈ آل انڈیا میر اکادمی، لکھنؤ، 14 اپریل 1997ء۔

☆ ''عورت، مذہب اور سیاست'' پر نیشنل سمینار بڑودہ، بڑودہ گجرات (سہ روزہ) 22,23,24 جولائی 1997ء۔

☆ ادارۂ 'اسمیتا' حیدرآباد کے زیر اہتمام ''خواتین پر تقسیم ہند کے اثرات'' پر ریتو مینن کا لکچر۔ 13 ستمبر 1997، پریس کلب، بشیر باغ

☆ ''دکنی زبان پر جنوبی ہند کی زبانوں کے اثرات'' کل ہند سمینار 20 اپریل 1998۔

☆ مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کی یکسوئی، تعلیمی پسماندگی اور اقتدار سے بے دخلی، حکومت کی مشنری میں صفر کی نمائندگی۔ وجوہات کی تلاش وتجاویز۔ 'اسمیتا' کی جانب سے ایوان اردو پنجہ گٹہ، حیدرآباد میں 13 اور 14 جون 1998 کو دو روزہ سمینار۔

☆ ''انتالیسواں جشن آنکھوں دیکھا حال۔ گنبدانِ یوم قلی قطب شاہ''، 30 اپریل 1998

☆ تقریب رسم اجراء ''سنگ اٹھایا تھا'' مصنف محمود حامد زیر اہتمام تناظر پبلیکیشنز حیدرآباد (اے پی)۔

قمر جمالی کے رپورتاژ میں رپورتاژ نگاری کی تمام خصوصیات ملتی ہیں۔ انہوں نے یہ رپورتاژ کسی سمینار یا ادبی کانفرنس کے سلسلے میں لکھے ہیں۔ سمینار کی تفصیلات جزئیات نگاری کے ساتھ رپورتاژ کے فنی لوازم کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیش کی گئی ہیں۔

قمر جمالی نے ایک رپورتاژ ''عورت، مذہب اور سیاست'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ رپورتاژ 4 اگست 1997ء کو لکھا گیا جو پہلی بار روزنامہ ''عوام'' میں 7 اگست 1997 اور پھر دوسری مرتبہ روزنامہ ''سیاست'' میں 18 اکتوبر 1997ء کو شائع ہوا۔ قمر جمالی نے یہ رپورتاژ گجرات کے علاقے بڑودہ میں 7 اگست 1997 کو منعقد ایک سمینار کے سلسلے میں لکھا ہے۔ مذکورہ رپورتاژ کی ابتداء میں انہوں نے سمینار کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے اس میں شرکت کرنے والوں کی خوبیوں اور علاقوں

کی نشاندہی کی ہے۔ بعدازاں آزادی کے بعد جو غیر سرکاری ادارے ہندوستانی عوام کو بیدار کرنے، عوام کے اندر شعوری کوشش کو پیدا کرنے اور قوم کی ترقی پذیری میں جو ادارے مسلسل کوشاں ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔قوم کی ترقی پذیری کے متعلق قمر جمالی امبیڈکر کے نظریات سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ’’کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ ان کی عورتیں پڑھی لکھی نہ ہوں۔ یہاں پڑھی لکھی سے امبیڈکر کی مراد صرف خواندگی نہیں ہے۔ اگرچہ کہ خواندگی بنیادی امر ضروری ہے۔ امبیڈکر کے نزدیک خواندگی سے مراد ذہنی بیداری ہے۔ ہندوستان بھر میں پھیلے غیر سرکاری اور رضا کار اداروں کی وجہ سے آج ہندوستانی عورت نہ صرف بیدار ہورہی ہے بلکہ اس میں آواز اٹھانے کی طاقت بھی آ گئی ہے‘‘۔(۱۶۴)

قمر جمالی نے بڑودہ (گجرات) میں ہوئے سہ روزہ سمینار میں شرکت کرنے والے ان حیدرآبادی افراد کے قافلے کی تفصیلات پیش کی ہیں جنہیں ’اسمیتا گروپ‘ نے منتخب کیا تھا، جن میں زیادہ تر وہ خواتین شاملِ حال رہی ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی اقلیتی طبقہ سے تھا۔

ایک اچھے رپورتاژ کی تخلیق کے لئے واقعات کی صداقت کے ساتھ ساتھ جذبات وتاثرات کی گہرائی اور خلوص کا ہونا ضروری ہے اور سماج میں جو حادثات، واقعات اثر انداز ہوتے ہیں وہ رپورٹ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔غرض مصنفہ نے ان کو اپنے رپورٹ میں کرداروں کے ذریعہ بخوبی پیش کیا ہے۔ 22 جولائی کی صبح 9 بجے منعقد ہونے والے سمینار میں ملک کے مختلف حصوں سے تشریف فرما مندوبین ایک ایک کرکے اپنے مقالے پیش کرنے لگے، جن میں محترمہ جیلانی بانو نے بھی اپنا مقالہ پیش کیا۔ جیلانی بانو نے اپنے مقالے میں اسلام میں عورت کے تصور کو واضح کرتے ہوئے دورِ حاضر میں

حقوقِ نسواں کے استحصال پر سخت تنقید کی جس کے متعلق قمر جمالی نے اپنے رپورتاژ میں یوں بیان کیا ہے:

''عورت کا مقام صرف اسلام میں ہی نہیں بلکہ ہر مذہب میں ماورا رہا ہے پھر بھی مٹھی بھر عامروں نے مل کر اسے نہ صرف پائمال کیا ہے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق خواتین پر عمل آوری کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ قوانین شریعت کے مطابق عورت اور مرد دونوں اخلاقی طور پر ایک دوسرے کے پابند ہوتے ہیں۔ بہ صورتِ دیگر مرد کو طلاق کا حق ہے تو عورت کو خلع کا حق بھی دیا گیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد سنگھ پریوار نے جو ہندوتوا کا زہر پھیلایا ہے اس سے عورت بھی بچی نہیں رہی ہے بلکہ عورت ہی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ آج 'مسلم شبان' نے برقعہ پوش خواتین پر سنیما تھیٹر میں داخلہ پر اقضاع لگانے کی مہم چلا رکھی ہے جو سراسر یک طرفہ ہے۔ انہوں نے کہا ایسے مرد جو چہرے مکھڑے سے مومن ظاہر ہوتے ہوں یہ اقضاع ان پر بھی برابر لاگو ہونا چاہیے۔''(۱۶۵)

قمر جمالی نے اپنے رپورتاژ میں جہاں کرداروں کو موقع محل سے پیش کیا ہے وہیں انہوں نے سمینار میں پیش کیے مقالے کے حوالے سے آج کے سماج میں عورت کی بے بسی اور ان پر مردوں کے ہونے والے مظالم پر تنقید کرتے ہوئے پرانے شہر میں ایک لڑکی کے ساتھ ہوئے کربناک واقع کو بھی پیش کیا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی آج عورت اسی دور سے گزر رہی ہے جس سے آزادی سے پہلے گزر چکی ہے۔

قمر جمالی اپنے کرداروں کے نظریات، سکنات، احساسات اور شخصیت کے ایک ایک پہلو سے

بخوبی واقف نظر آتی ہیں۔سمینار کے دوسرے دن یعنی 23 جولائی کو گجرات کے موسم کا ذکر کرتے ہوئے سمینار کے آغاز و موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے 'انصاف گروپ' ممبئی سے تشریف فرما محترمہ رضیہ پٹیل کے لکچر اور ان کے حلیہ و شخصیت کا ذکر کیا ہے۔مزید انہوں نے رضیہ پٹیل کو مہاراشٹرا خواتین کی ایک طاقتور (Symbol) قرار دیتے ہوئے مہاراشٹرا میں خواتین پر ہونے والے مظالم کی طبی داستان پیش کی ہے۔غرض یہ کہ ہندوستان کی آزادی سے قبل عورتوں پر ہوئے جبر وظلم کا المیہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ سے ہی عورت ظلم سہہ رہی ہے لیکن کچھ عورتیں ان مظالم سے نکل کر اپنی راہ خود نکالتی ہیں ان میں ایک نام رضیہ پٹیل کا ہے جنہوں نے کبھی اپنے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ قدامت پرستی کی روایت کو توڑ کر آج وہ مہاراشٹرا کی خواتین کی ایک طاقتور علامت بن گئی ہیں چنانچہ مصنفہ نے زیرِ نظر رپورتاژ میں رضیہ پٹیل کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جس سے صنفِ مخالف بھی حیرت زدہ نظر آتا ہے۔

قمر جمالی نے اپنے رپورتاژ میں مرکزی کردار کا رول بہترین انداز میں نبھایا ہے، وہ ہر جگہ اپنی خصوصیت کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہیں۔انہوں نے ایک جگہ اپنا خود کا تعارف کرواتے ہوئے اپنے مقالے پر روشی ڈالی ہے:

> ''اب اس سیشن کا آخری مرحلہ رہ گیا تھا۔قمر جمالی کو اپنی تخلیقات کے ذریعہ ثابت کرنا تھا کہ عصر حاضر میں ادب سیاسی اور سماجی حالات سے کس طرح متاثر ہو رہا ہے۔خصوصاً بابری مسجد کی شہادت کے بعد۔ کئی سوالات اٹھائے گئے۔قمر جمالی نے کہا کہ حق تو یہ ہے کہ آج کے ایک ادیب کے سامنے پہلے سے بھی سوا چیلنجس کھڑے ہیں اور اسے ان کا جواب دینا ہے۔آخر میں قمر جمالی نے روس کے بکھرنے کے بعد نوسینا اور کروشیا کے مسلمانوں پر ہوئے مظالم کے پس منظر میں لکھی کہانی 'اپچ' پیش کی جو بہت پسند کی گئی''۔(۱۶۶)

قمر جمالی کا ایک رپورتاژ 'خواتین پر تقسیمِ ہند کے اثرات' کے عنوان سے ہے۔قمر جمالی نے 13 ستمبر 1999ء شام 6 بجے پریس کلب بشیر باغ میں ادارہ 'اسمیتا' حیدرآباد کے زیرِ اہتمام خواتین پر تقسیم ہند کے اثرات پر محترمہ ریتومینن کے لکچر کا تعارف کرواتے ہوئے ادارہ 'اسمیتا' کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ بعدازاں اس نشست کی صدر ہند و پاک کی مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو نے اپنے لکچر میں تقسیمِ ہند واقعے کو آزادیٔ ہند سے وابستہ ایک کربناک یاد سے تعبیر کیا ہے اور تقسیمِ ہند کے پس منظر میں لکھی گئی کہانیوں کی طویل تفصیل پیش کی ہے۔غرض مصنفہ نے اجلاس میں شامل جیلانی بانو کے نکات کو اجاگر کرتے ہوئے تقسیمِ ہند کے بعد پیش آئے حقیقی واقعات اور حادثات کو ریتومینن کے کردار کے ذریعہ پیش کیا ہے۔اس سلسلے میں تقسیمِ ہند کا ایک دردناک واقعہ ملاحظہ ہو:

''شیخوپورہ کے کچھ سکھ خاندانوں میں کچھ لوگ اب بھی حیات ہیں جن کی آنکھیں تقسیمِ ہند کے واقعات دیکھنے کے بعد روشنی سے محروم ہو گئیں اور جن کی زبان سے ان واقعات کو قلم بند کرتے ہوئے ریتو نے کہا کہ قلم بھی کانپ اٹھا۔ جب دس بارہ مردوں نے مل کر ایک لڑکی کو لوٹا اور کچھ کو ان کے باپ بھائیوں نے خود شوٹ کر دیا کہ آبرو بچی رہے۔لڑکیوں کا صرف جنسی استحصال ہی نہیں بلکہ انہیں جسمانی طور پر ہراساں کرنے کے لیے ان کے نسوانی اعضاء کاٹے گئے۔غرض درندگی کی ایسی مثالیں جو اس دور میں ملیں خدانخواستہ پھر کبھی ان کی تجدید نہ ہو۔''(۱۶۷)

محترمہ ریتومینن نے تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان کے سرحدی صوبے پنجاب میں پیش آئے حقیقی واقعات کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے ایک پروجیکٹ کا آغاز کیا جس کے تحت انہوں نے جو معلومات اکٹھا کی ہیں۔قمر جمالی نے اس کا نتیجہ اخذ کرتے ہوئے شخصی تاثر و کیفیت کا اظہار کچھ اس طرح پیش کیا

ہے:

''ریتومینن کا مقالہ نہ صرف حقیقی محرکات پر مبنی تھا بلکہ ان کی زبان میں جاذبیت، چاشنی اور درد بھرا تھا۔''(۱۶۸)

الغرض تقسیمِ ہند برِ صغیر کی تاریخ کا نہایت اہم باب ہے برسوں کی جدو جہد اور بڑی قربانیوں کے بعد ملک آزاد ہو کر تقسیم کے المناک حادثے نے حصولِ آزادی کی سرمستی وسرشاری کو جانکاہ اذیت میں تبدیل کر دیا۔ ملک کے ساتھ ساتھ تہذیب، معاشرہ، خاندان سب کچھ تقسیم ہو گیا، حتیٰ کہ آپس کے رشتے اور رابطے، محبتیں اور رفاقتیں بھی دولخت ہو گئیں اور انسان کا وجود دو نیم ہو گیا۔ تقسیم اور فسادات کے ہنگامے میں عورتوں کو سب سے زیادہ صدمے برداشت کرنے پڑے۔ تقسیمِ ہند نے فسادات کی شکل میں جو دکھ جھیلا ہے اس کی تاریخ کبھی نہیں بھولی جائے گی۔ مؤرخین نے تاریخی اعتبار سے اپنی کتابیں مرتب کیں لیکن سماج کا مطالعہ کرنے والے ادیب وشاعر نے اس کے کرب کو جس طریقے سے لفظوں میں بیان کیا ہے اس کا زیادہ ذخیرہ اردو ادب میں ملتا ہے۔ منٹوؔ، کرشن چندرؔ، بیدیؔ، احمد ندیمؔ قاسمی وغیرہ نے کئی ایسے لازوال افسانے لکھے جو تقسیم کے افسانوں کی چھاپ کے طور پر مشہور ہیں۔

قمر جمالی نے ایک اور رپورتاژ 'دکنی زبان پر جنوبی ہند کی زبانوں کے اثرات' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ رپورتاژ 20 اپریل 1998ء کو تخلیق کیا گیا جو 30 اپریل 1998 کو روزنامہ ہمارا عوام میں شائع ہوا۔ دکنی زبان پر جنوبی ہند کی زبانوں کے اثرات کے موضوع پر کل ہند سمینار 20 اپریل 1998 کو حیدرآباد میں 'اسمیتا N.G.O.' کے تحت منعقد کیا گیا تھا جس میں قمر جمالی بھی شامل تھیں۔ اس اجلاس کا افتتاح راج بہادر گوڑ اور صدارت گوپی چند نارنگ نے کی تھی اور جناب نریندر لوتھر نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ قمر جمالی زیرِ نظر رپورتاژ میں سمینار کی روداد بیان کرتے ہوئے افتتاح میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے دکنی زبان کے ارتقائی عناصر پر بحث کی ہے جس کو

اجاگر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''زبان عوام کے درمیان سے شروع ہوئی۔جس خطے میں بولی گئی اس خطے کے اثرات قبول کرتی گئی۔لہذا اس میں تلگو، تامل، کنڑ، مراٹھی اور پنجابی الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔''(۱۶۹)

زیرِ نظر رپورتاژ میں قمر جمالی نے مقالہ نگار پروفیسر مغنی تبسم کے پیش کیے گئے مقالے کے حوالے سے قطب شاہی سلاطین کی دکن سے محبت اور مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے کی خصوصیت کو پیش کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

''قطب شاہی سلاطین نے دکن کو اپنا وطن بنا لیا۔اس سرزمین سے انہیں گہری محبت تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ یہاں ایک منفرد انداز کی مشترکہ تہذیب کو فروغ ہوا، جو مذہبی اور لسانی ہم آہنگی اور یگانگت سے منزہ تھی۔''(۱۷۰)

آخر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نائب صدر سینٹرل ساہتیہ اکادمی نے اپنے خطبے میں اردو زبان کی شناخت اور اس کے فروغ و اہمیت کا ذکر کیا ہے جس کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں:

''علاقائی زبانوں کے اثر کی وجہ سے اردو کی شناخت برقرار ہے اور اگر اس سے علاقائی زبانوں کے الفاظ حذف کر دیے جائیں تو اردو زبان کی شناخت قائم نہیں رہ سکتی اور ہندوستان کی زبان ہے اور پاکستان میں اردو کا فروغ ہندوستان کا مرہونِ منت ہے۔خدانخواستہ اگر ہندوستان سے اردو مٹ جائے تو یہ پاکستان میں ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔انہوں نے مزید کہا کہ اردو زبان نے کبھی تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ دوسری زبانوں کے الفاظ لے کر اسے قوسِ قزح

کا رنگ دیا۔اس زبان نے فراخ دلی سے دوسری زبانوں کے الفاظ کو
خود میں اس طرح جذب کیا کہ ہر علاقے والا اسے اپنی زبان کہنے پر
مصر ہوا۔''(۱۷۱)

غرض یہ کہ اردو ہندوستانی زبانوں میں سے ایک زندہ جاوید، دلکش و شیریں، خیر سگالی، اتحادی، رواداری، آشتی اور انسانیت کو فروغ دینے والی تہذیب تمدن کی زبان ہے۔ اردو ایک زبان ہی نہیں بلکہ اردو ایک معاشرے، تہذیب، معیار، یکجہتی، اعلی اخلاق، تعاون، صلہ رحمی، برداشت، ایک مکمل خاندان، قومی، ملی، حلم اور نہ جانے کتنی خوبیاں اس لطافت والی شیریں زبان میں مخفی طور پر پائی جاتی ہیں جس کا بیان شاید ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

قمر جمالی نے ایک رپورتاژ' آنکھوں کا دیکھا حال۔ گمبدانِ شاہی میں یومِ قلی قطب شاہ' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ رپورتاژ 27اپریل1998 کو لکھا گیا جو روزنامہ ہمارا عوام حیدرآباد سے 30اپریل1998 میں شائع ہوا۔قمر جمالی نے اس رپورتاژ میں سمینار کی روداد اور سمینار میں شرکت کرنے والے شخصیتوں کے ذکر کے علاوہ ہندوستان کے سیاسی پس منظر کو بھی پیش کیا ہے جس سے اس زمانے میں ہونے والے فسادات اور سماجی حالات کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔انہوں نے حیدرآباد کی تہذیب کا ذکر بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں کیا ہے جس سے اس عہد کے حیدرآباد کا علم ہوتا ہے جو آج کا سائنس و ٹیکنالوجی کے دور میں گم ہو گیا ہے۔تہذیب کے علاوہ انہوں نے اس دور کے مکانات، آنگن، اور صحنوں میں زندگی کا لطف حاصل ہوتا تھا اس کی عمدہ منظر کشی کی ہے کہ سارا منظر نظروں میں گھوم جاتا ہے۔اس کا بیان یوں کرتیں ہیں:

''شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کو پیدا ہوئے پورے 400 برس گزر گئے۔
ان 400 برسوں میں یہاں بہت کچھ بدل گیا۔ وہیں حیدرآباد کی
تہذیب رکھ رکھاؤ میں بھی فرق آ گیا۔ یا تو پھر معاشرہ حالات اور

تقاضائے وقت کا شکار ہو گیا۔ ہرے بھرے درخت اور پھولوں کے کنج
کے درمیان والا نما مکانوں کی جگہ سمنٹ اور کنکریٹ کے جنگل اگ
گئے۔ اب نہ وہ بڑے بڑے گھر اور نہ گھروں میں آنگن اور نہ ہی
آنگنوں میں چنبیلی کے مندروؤں تلے مٹی کے آلوں میں دھنسے لال
لال کورے گھڑے جن کے مساموں سے پجرتے تے ٹھنڈے پانی
کی بوندوں کو دیکھ کر ہی روح میں تراوٹ آجاتی سہ پہر کے ساتھ
صحنوں میں نور کی پلنگیں بچھ جاتیں اور موگرا جوہی اور چنبیلی کے گجرے
گوندھے جاتے اور زندگی صحنوں میں اتر آتی۔'' (۱۷۲)

قمر جمالی نے اس رپورتاژ میں قطب شاہی تاریخ کے پس منظر میں قطب شاہ کے عہدِ حکومت کا جائزہ لیا ہے۔ غرض محمد قلی ہندوستانیت کا بڑا پرستار ہے۔ اس کی رگ و پے میں ہندوستان کی تہذیب سرایت کر گئی ہے۔ اس کے کلام میں اپنے عہد اور مقامی ماحول کی مکمل ترجمانی ملتی ہے۔ اس کے شاعری کے متعلق سے اس کے دور کی سماجی زندگی کے متعلق بہت کچھ مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

قلی کو زبان و ادب سے دلچسپی رہی، دنیائے شاعری خصوصاً اردو زبان و ادب کی تاریخ میں سلطان قلی قطب شاہ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس سے کہ وہ ایک اعلیٰ وارفع حکمراں تھا بلکہ اردو زبان و ادب کے اولین محاوروں اور اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے حامل شاعروں و ادیبوں کا مربی و سرپرست ہوتے ہوئے خود بھی ایک بہترین قادرالکلام صاحبِ دیوان شاعر تھا۔

لہٰذا یومِ قلی قطب شاہ کے موقع پر شامل شرکاء نے بادشاہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اردو ادب کی ترویج میں زورؔ اور مولوی عبدالحق کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نائب صدر سینٹرل ساہتیہ اکادمی دہلی نے اردو کو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیب قرار دیا ہے۔ قمر جمالی اردو زبان کی اہمیت و روایت کو اجاگر کرتے ہوئے یوں لکھتی ہیں:

''مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زور کی خدمات اردو اور اردو بہی خواہوں میں ہندوستان بھر میں یاد رہیں گی۔ اردو محض ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے اپنا کوئی وطن نہ ہونے کے اردو زبان ساری دنیا میں اپنا گھر بنا رہی ہے۔ حیدرآباد دکن میں شاہانا قطب شاہیہ نے اس زبان کو توانائی بخشی۔ ان روایات کا تحفظ ہماری قومی ذمہ داری ہے۔ یہ زبان اپنے علاقائی رد و بدل اس کا مٹنا ایک اور محال ہے۔'' (۱۷۳)

قمر جمالی ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں وہ ایک اچھی افسانہ نگار ہیں۔ اسی طرح ان کے رپورتاژ کا انداز بھی نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب میں شگفتہ بیانی بھی جھلکتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ گنبدانِ شاہی میں منعقد جشن کے منظر کا بیان کرتے ہی شگفتہ انداز میں شام کے ایک منظر کی انہوں نے بہترین عکاسی کی ہے، مثلاً:

''شام کے سائے تیزی سے مقبروں کے گمبدوں سے اتر کر ان دامنوں میں جذب ہو رہے تھے اور افق پر شاہ مشرق سرخ ردا اوڑھ کر زمین کی کوکھ میں چھپ رہے تھے اور باقی شہر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے مقبرے پر سفید چاندنیوں کے فرش پر گہرے سرخ رنگ کی ہاؤں گھڑی بچھائی جارہی تھی۔'' (۱۷۴)

قمر جمالی نے 'سنگ اٹھایا تھا' کے عنوان سے ایک رپورتاژ تحریر کیا ہے یہ رپورتاژ انہوں نے 26 دسمبر 1998 کو لکھا جو 'تناظر' سہ ماہی شمارہ 29-28 مارچ 1999۔ اکتوبر 1998 میں شائع ہوا۔ اس رپورتاژ میں قمر جمالی نے تفصیل کے ساتھ مصنف محمود حامد کی کتاب 'سنگ اٹھایا تھا' کے رسمِ اجراء کے موقع پر جلسے کی انعقاد سے پہلے حاضرین جلسہ کا منظری رویہ اور جلسے میں شامل اہم شرکاؤں کا تعارف و

شخصیت پیش کرتے ہوئے جو ادیب و نقاد کتاب سنگ اٹھایا تھا کے مصنف محمود حامل کی فنِ افسانہ نگاری کی خصوصیات پر مختلف نظریات و اظہارِ خیال پیش کیا ہے جس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ قمر جمالی نے رپورتاژ کی ابتداء میں تناظر پبلکیشنز رسالے کی مدیر کی ذمہ داری سنبھالنے پر اپنے نظریات و احساسات اور اپنی شخصیت کے ایک پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''بڑے آرام سے اپنے گھر بیٹھے تسکین طبع کے لیے گاہے گاہے لکھ لیتے تھے کہ یکا یک ایک ایسے رسالے کے مرید بنا دیے گئے جس کی دنیائے ادب میں پہلے ہی سے ساکھ بنی ہوئی تھی۔ یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ گوندھی مٹی ہاتھ میں ہو تو اپنی مرضی کے مطابق صورت گری کی جا سکتی ہے۔ مگر جب کوئی بنی بنائی صورت ہاتھ میں لگ جائے تو اس کا تحفظِ جمال ایک چیلنج بن جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ ایک طرف تو ہم بے حد خوش ہیں کہ ہم ایک ایسے رسالے کے مدیر بن گئے جن کی ادبی شناخت پہلے ہی سے مسلمہ ہے تو دوسری طرف خوف زدہ بھی کہ اتنی بڑی زمہ داری سے ہم عہدہ برآ سکیں گے بھی!'' (۱۷۵)

تناظر پبلیکشنز کے زیرِ اہتمام جناب محمود حامد کے افسانوں کا مجموعہ 'سنگ اٹھایا تھا' کی اشاعت اور اردو زبان میں انیس الرحمٰن بلاک میں 'سنگ اٹھایا تھا' کی رسمِ اجراء کا اہتمام ذکر کرتے ہوئے جلسے میں جن جن مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا اس کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''جلسوں کا انعقاد کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ناظم جلسہ یا میزبانِ جلسہ اختتام تک ایک مسلسل کرب سے دوچار رہتا ہے۔ سامعین کا دیر سے آنا ہمیشہ باعث زحمت ہوتا تو ہے مگر کبھی کبھی وقت پر آنا بھی زحمت کا باعث بن جاتا ہے۔ ٹھیک پونے چھ بجے اردو زبان

کے ایوان سے 'اللہ اکبر' کی صدا گونجی۔ ایوننگ کالج کے عین نیچے
بڑے ہال میں جہاں دن میں مدرسہ چلتا ہے جائے نمازیں بچھ گئیں
اور ناظمِ جلسہ نے شکریہ ادا کیا۔ پورے دس منٹ تک اردو ہال میں
مکمل سناٹا چھا گیا اور ایوننگ کالج کے محمود ایاز ایک ہی صف میں
کھڑے ہو گئے۔ مغرب کے وقت اردو ہال کا یہ منظر بڑا روح پرور
ہوتا ہے۔نماز کو فوری بعد ناظم جلسہ نے جوں ہی ہال میں قدم رکھا،
ہال میں ایک بے ترتیب خاموشی چھا گئی کہ شائد جلسہ شروع ہو رہا ہے
مگر ناظم کو مائک کے قریب نہ جاتا ہوا دیکھ کر دو چار دوستوں نے ہاتھ
اٹھا کر احتجاج کیا۔''(۱۷۶)

ہندوستان کی تہذیب کے علاوہ انہوں نے اپنے رپورتاژ میں موجود شخصیتوں کے حلیہ کا بیان بھی خوبصورت اور دلچسپ انداز میں کیا ہے جس میں انہوں نے رپورتاژ کے فن کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر یوسف کمال کی شخصیت کو نہایت ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اب اور کس کا انتظار ہے۔؟ گھڑی بھر کو فضا میں سعی لہروں کا ارتعاش
پھیل گیا اس آواز کو تعارف کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ آواز سینکڑوں
میں پہچانی جاتی ہے۔لگتا ہے کسی اونچے گمبد کے اندر ایک خاموش
کبوتر صدا دے کر کہیں چھپ گیا ہو۔یعنی یہ تھے ڈاکٹر یوسف کمال۔
بیچارے! سرگوشی نہیں کر سکتے فوری پکڑے جاتے ہیں۔''(۱۷۷)

غرض قمر جمالی کے رپورتاژ کی تفصیلی تجزیہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مختصر اور طویل دونوں طرح کے رپورتاژ ملتے ہیں اپنے رپورتاژ میں انہوں نے موضوع کے اعتبار سے معروضی نکتۂ نظر کا

اظہار کیا ہے۔انھوں نے حقیقی واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ شخصی تاثرات و کیفیات کا اظہار بھی کیا ہے۔انھوں نے گجرات،حیدرآباد کا سفر کیا تھا۔اپنے رپورتاژ میں انھوں نے ان شہروں میں ہوئے کانفرنس وسمینار اور جلسوں کی روداد دلچسپ انداز میں رپورٹنگ کی ہے۔ان کے رپورتاژ میں ادبی چاشنی اور اسلوب کی لطافت موجود ہے۔

قمر جمالی نے ہندوستان کے تاریخی، سیاسی، سماجی و معاشرتی،تہذیبی اور مذہبی واقعات کا بیان دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔جس سے اس عہد کے معاشرتی حالات،تہذیبی روایات کے علاوہ ادبی رجحانات کا بھی پتا چلتا ہے۔

رپورتاژ کی سب سے اہم خصوصیت یعنی سمینار و کانفرنس کی روداد کا بیان میں بھی انہیں سلیقہ حاصل ہے۔انھوں نے سمینار کی اس کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ وہاں شریک تمام بڑی بڑی ہستیوں، سیاسی رہنماؤں، دانشوروں اور ادیبوں و شاعروں کا بھرپور تعارف کرواتے ہوئے ان کے خیالات اور حرکات وسکنات کا بھی جائزہ لیا ہے۔انہیں کردار نگاری پر بھی مکمل دسترس حاصل ہے۔

ان کے کردار ناول یا افسانوں کی طرح تخیلی نہیں ہوتے بلکہ ان کے رپورتاژ میں واقعات کی بنیاد چونکہ ٹھوس صداقت پر ہوتی ہے اس لیے ان کے کردار جیتے جاگتے اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ان کے رپورتاژ میں صرف دوسرے اشخاص ہی نظر نہیں آتے بلکہ ان کا مرکزی کردار یعنی قمر جمالی کی شخصیت بھی موقع کا محل کے ساتھ جلوہ گر ہوتی نظر آتی ہے کیونکہ وہ خود ان چشم دید واقعات کی عینی شاہد ہیں اس لیے جگہ جگہ ان کی شخصیت کی بھی جھلکیاں پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہیں اور ساتھ ہی ان کے خیالات و نظریات کا بھی پوری طرح علم ہوتا ہے۔

واقعہ نگاری اور کردار نگاری کے علاوہ ماحول آفرینی کی خصوصیت بھی پوری طرح ان کے رپورتاژ میں نظر آتی ہے۔انھوں نے اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کی جھلکیاں تمام حقائق کے ساتھ پیش کر دی ہیں۔ان کے اسلوب تحریر میں شادابی اور ان کے فکر میں بلندی اور مشاہداتی گہرائی بھی ہے۔

چونکہ اظہارِ بیان پر انہیں قدرت ومہارت حاصل ہے۔اس لیے گہرے سے گہرے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو بھی سلاست اور خوبصورتی سے پیش کر دیتی ہیں۔ان کی بیانی قدرت اور تخلیقی بصیرت نے ان کے رپورتاژ کی فنی قدر و قیمت کو قابلِ توجہ اور پرکشش بنا دیا ہے۔

قمر جمالی نے اپنی شخصیت کا اظہار بھی جگہ جگہ کیا ہے۔ان کے رپورتاژ میں گفتگو کا انداز بھی بخوبی نظر آتا ہے۔شگفتہ بیانی اور طنز ومزاح کے جوہر بھی ان کے اسلوب کی خوبی ہیں۔انہوں نے اپنے رپورتاژ میں منظر نگاری کا کمال بھی دکھایا ہے۔ان کی منظر نگاری بھی معلوماتی نوعیت کی ہے۔انہوں نے بالخصوص حیدرآبادی بازاروں، پھولوں، جنگلوں کی بہترین تصویریں پیش کر دی ہیں کہ قاری خود کو ان مناظر کے آگے محسوس کرتا ہے۔

غرض قمر جمالی کے رپورتاژ فنی اصول وضوابط پر پورے اترتے ہیں اور صداقت واہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔فنی تقاضوں کے پیش نظر ان کے رپورتاژ اردو ادب میں اہمیت کے حامل ہیں۔

ل) دیباچے

تحقیق وتنقیدی مضامین اور تبصروں کے علاوہ قمر جمالی نے مختلف ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر عالمانہ دیباچے، پیش لفظ اور ابتدائیہ بھی لکھے۔ان کے دیباچوں کی کل تعداد لگ بھگ اکتیس (۳۱) ہے۔جن میں انتیس (۲۹) شائع ہو چکے ہیں اور دو ابھی شائع نہیں ہوئے ہیں۔

قمر جمالی نے جب ۲۰۱۲ء میں 'انعکاس' کو ترتیب دیا تو اس میں تبصرے اور مضامین کے علاوہ کچھ دیباچے بھی شامل کیے''انعکاس'' میں شامل دیباچوں کی تعداد سات (۷) ہے۔اس کے علاوہ دیگر دیباچے، پیش لفظ اور ابتدائیہ مختلف مصنفین کی کتابوں میں شامل ہیں۔جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

☆ 'می گویم'، 'طاس'، جناب محمود حامد، دسمبر ۲۰۰۷ء

☆ 'کائنات لفظ'، 'عکس فریادی'، نسیمہ تراب الحسن، ۲۸/جنوری ۲۰۰۸ء

☆ 'شاغل ادیب کا علمی ردِعمل'، 'آبروئے لوح وقلم'، ۲۰۰۹ء

☆ 'لغزش دوراں-ایک تعارف'،'لغزش دوراں، رئیسہ محمد، ۹/ جنوری ۲۰۱۰ء

☆ 'بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے- ایک مطالعہ'، 'بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے' افروز سعیدہ، ۲۳/ اگست ۲۰۱۲ء

☆ 'پھولوں کی چبھن-ایک تجزیہ' 'پھولوں کی چبھن، ثریا جبیں، نومبر ۲۰۱۲ء

☆ 'طنز و تبسم کے میدان میں عطیہ نور الحق قادری کا قلم'، طنز کے رنگ تبسم کے سنگ'، عطیہ نور الحق قادری، نومبر ۲۰۱۲ء

☆ 'دل کی دھڑکنوں سے جوجھتی انیس فاروقی کی کہانیاں'، تند دھڑکنوں کا بھنور' انیس فاروقی، نومبر ۲۰۱۲ء

☆ 'جہاں رنگ و بو-ایک تعارف'، جہاں رنگ و بو، عزیز احمد عروسی، ۲۰۱۴ء

☆ 'انجم شافعی اور وہ شاہکار' کی کہانیاں'، 'وہ شاہکار'، انجم شافعی، ۱۹/ جنوری ۲۰۱۴ء

☆ پیش لفظ، صحرا بکف، قمر جمالی، ۱۵/ جون ۲۰۱۵ء

☆ 'تنویر القرآن-ایک تعارف'، 'تنویر القرآن'، تنویر الدین خدانمائی، ۱۱/ مئی ۲۰۱۵ء

☆ 'پیش لفظ شان چمن'، شان چمن (بچوں کا ادب) ثریا جبین ۳/ نومبر ۲۰۱۶ء

☆ 'شاہانہ اقبال کی کہانیاں-ایک تعارف' وجو دِزن، شاہانہ اقبال، ۸/ جنوری ۲۰۱۷ء

☆ 'اُردو ادب میں احتجاج کا نسائی رنگ'، زکاء عظیم کو مل گیا، ۲۸/ فروری ۲۰۱۹ء

☆ 'محبت زندگی ہے'، محبت زندگی ہے، محمد مجیب احمد، ۲۱/ مارچ ۲۰۱۹ء

☆ 'خواب، آنکھیں اور سایے کا شاعر-معین افروز'، 'خواب آنکھیں اور سائے، معین افروز، ۲۳/ اپریل ۲۰۱۹ء

☆ 'اجلی مسکراہٹ کی افسانوی کرنیں'، اجلی مسکراہٹ، علیم صبا نویدی ۱۸/ جولائی ۲۰۱۹ء

☆ 'کوئی بات اٹھا نہ رکھنا' کوئی بات اٹھا نہ رکھنا، رفیعہ نوشین، ۱۶/ دسمبر ۲۰۲۰ء

☆ 'انجن کمار گوئل-ایک بصیرت افروز شاعر'، مہتاب غزل، انجنی کمار گوئل ۲۸/ فروری ۲۰۲۲ء

دیباچہ نگاری کے کوئی خاص اصول نہیں ہیں۔ دیباچہ نگار دیباچے میں مصنف کا مختصر تعارف کراتا ہے اس کی تعلیم و تربیت، سیرت و شخصیت کا اختصار سے جائزہ لے کر کتاب کے موضوع کی طرف آتا ہے۔ موضوع سے معلق مختصر سا پس منظر بیان کرنے کے بعد کتاب کا تعارف کرواتا ہے اس طرح قاری کو دیباچہ یا پیش لفظ پڑھنے

کے بعد ہی کتاب سے متعلق بنیادی باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔قمر جمالی بھی اپنے دیباچوں میں مصنف یا تصنیف کے متعلق مختصر طور پر پس منظر بیان کرتی ہیں۔قمر جمالی بنیادی طور پر تنقید و تحقیق کے اسرار و رموز سے بھی واقفیت رکھتی ہیں اس لئے ان کا بھی خیال ہے کہ مصنف کے خیالات و نظریات کا پتہ لگانے کے لئے اس عہد کی تاریخ کا بھی علم ہونا چاہیئے،عصری حسیت ایک بہت ہی اہم چیز ہے۔جس کا قمر جمالی کو بہ اعلیٰ شعور ہے۔

ان کا لکھا ہوا ایک دیباچہ 'شاغل ادیب کا علمی ردِّعمل' ہے شاغل ادیب کی کتاب 'آبروئے لوحِ قلم' میں شامل دیباچے میں وہ لکھتی ہیں:

> ''انہوں نے (شاغل ادیب) نے بیسویں صدی کے سیاسی،سماجی،تہذیبی،ثقافتی اور نفسیاتی سطح کے زیر اثر ادب اور ادبی رجحانات کی شکست وریخت دیکھی۔روس کا شیرازہ بکھرتا دیکھا۔نوآبادیاتی نظام Neo-Colonialind کا عروج وزوال دیکھا اور افغانستان کی بربادی پر .U.N.O کی بے چارگی دیکھی تو ظاہر ہے انہیں محسوس ہوا ہوگا کہ جو بھی تخلیق سامنے آئی وہ کہیں نہ کہیں ان ہی اثرات کے زیر اثر ہے۔ایک حساس شخص جب ان تاثرات کے ردِّعمل کو ایک منضبط انداز میں قلمبند دیکھتا ہے تو چپ نہیں رہ سکتا۔(۱۷۸)

یہاں ان کا یہ خیال بھی سامنے آتا ہے کہ ایک قلمکار اپنے عہد کے سیاسی،سماجی یا معاشی حالات سے بے حد متاثر ہوتا ہے اور یہ چیزیں ایک مصنف کی تحریروں میں بھی آتیں ہیں۔

قمر جمالی کسی کتاب پر لکھتے وقت کسی محدود دائرے کے اندر نہیں رہتی بلکہ وہ اپنے بہت سے خیالات، احساسات، تجربات اور مشاہدات قاری کے ساتھ بانٹ لیتی ہیں۔مختلف دیباچوں میں ان کی ایسی باتیں ملتی ہیں جن سے ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔'زین العابدین صدیقی کے ناول 'زہر' کے دیباچے میں وہ لکھتی ہیں کہ فن کی تکمیل کے لئے جامعیت ضروری ہے اور یہ ایک ناگزیر شرط ہے۔قمر جمالی لکھتی ہیں:

> ''دراصل فن کی تکمیل اور صداقت کے لئے جامعیت ایک ناگزیر شرط ہے یہاں جامعیت کا مطلب واقعات،حرکات وحادثات کے علاوہ بھی کچھ ہے۔اگر یہ نہ ہو سارا واقعہ آرٹ کے حدود سے باہر ہو جائے گا اور محض ایک تاریخی (Scenario) بن جائے گا۔فنی صداقت کے لئے تخیل شرط ہے تاکہ غیر محسوس چیزوں کو منطقی سطح تک لایا جاسکے

مگر تخیل کی ڈور اتنی ڈھیلی بھی نہ ہو کہ جس نکتے کی عکاسی کرنا مقصود ہے وہ محض ایک کلیشے
بن کے رہ جائے۔‘‘(۱۷۹)

قمر جمالی مصنف اور تصنیف کے متعلق بہت سی اہم باتوں پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ دیباچوں میں چونکہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی ہے یہاں اختصار کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔قمر جمالی نے بھی اپنے دیباچوں میں اختصار سے کام لیا ہے۔تصانیف کا تعارف پیش کیا ہے اور اپنے اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔نسیمہ تراب الحسن کی کتاب ’’عکس فریادی‘‘ کا دیباچہ قمر جمالی نے ’’کائنات لفظ‘‘ کے عنوان کے تحت لکھا ہے جس میں انہوں نے اختصار کے ساتھ نسیمہ تراب الحسن کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں لکھتی ہیں:

’’نسیمہ تراب الحسن‘ صاحبہ لفظوں کی ایسی ہی پارکھ ہیں ان کی عبارت اپنا جواز خود ہے یہ لفظوں کے اوصاف سے اچھی طرح واقف ہیں۔دھان پان سی نسیمہ آپا جب اپنی نرم و نازک انگلیوں سے طنز کے تیر چھوڑتی ہیں تو انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی مگر بات سیدھے قاری کے دل میں اُتر جاتی ہے۔لفظ چاہے جتنے سنگین رہے ہوں نسیمہ آپا اسے نرمی سے ادا کرنا جانتی ہیں۔ پان کی سرخی سے رنگے ان کے ہونٹوں کی نرم مسکراہٹ قاری کو ناراض کرنے کے بجائے تنبیہ مادری کا احساس دلاتی ہے۔‘‘(۱۸۰)

یہاں قمر جمالی نے اختصار کے ساتھ نسیمہ تراب الحسن کی شخصیت کے بہت سے پہلو قاری کے سامنے لاتی ہیں۔قمر جمالی کے فن کی خوبیوں میں یہ ایک بڑی خوبی ہے کہ وہ رعایت لفظی سے کام لے کر بڑی سے بڑی بات اختصار کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

قمر جمالی نے یہ دیباچے اور پیش لفظ کسی ایک صنف سے تعلق رکھنے والی تصنیف پر نہیں لکھے بلکہ مختلف متضاد تصانیف پر انہوں نے ناول، افسانہ، شاعری، تنقید، غرض سبھی اصناف سے تعلق رکھنے والی تصانیف پر دیباچے لکھے جس سے اُن کی علمی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کا مطالعہ لامحدود ہے وہ کسی خاص صنف سے تعلق رکھنے والی تصانیف کا ہی مطالعہ نہیں کرتیں بلکہ ہر قسم و ہر نوعیت کی کتابیں پڑھتی ہیں اور ان کے متعلق لکھتی ہیں کیوں کہ اُن کا موقف ہی یہ ہے کہ قاری کو پڑھنے کے بعد چپ نہیں سادھ لینی چاہئے بلکہ (React) کرنا چاہئے۔

قمر جمالی چونکہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ قلمکار ہیں۔ان میں سوچ و فکر بھی بلند پایہ ہے۔اپنی بات قاری تک پہنچانے کا ان کے پاس نہایت ہی عمدہ سلیقہ ہے۔اپنی بات کی دلیل پیش کرنی ہو تو قرآن مجید کی آیات سے سہارا

لیتی ہیں۔ بزرگانِ دین کے اقوال سے مدد حاصل کرتی ہیں اور ادب میں اعلیٰ مقام رکھنے والوں کے اقتباسات سے قاری کو اپنی عالمانہ انفرادیت سے قائل کرتی ہیں۔ ان کے تبصرے ہوں یا دیباچے متعدد جگہوں پر قرآنی آیات، احادیث، رومی، عطارؒ وغیرہ سے حوالے لئے گئے ہیں۔ جس سے اُن کی علمی وسعت اور فکر کی بلندی کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ قمر جمالی نے اکثر تبصروں اور دیباچوں کا آغاز قرآنی آیات یا فارسی اشعار سے کیا ہے۔ مشاغل ادیب کی کتاب 'آبروئے لوحِ قلم' کا دیباچہ جو 'مشاغل ادیب کا علمی ردِّعمل' سے کتاب میں شامل ہے اس میں قمر جمالی آغاز ہی میں قرآنی آیت اور فارسی شعر سے کرتی ہیں۔ مثلاً لکھتی ہیں:

"انا عرضنا الامانة علی السموات والارض

(ترجمہ: ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو)

والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان

(ترجمہ: اور پہاڑوں کو پر کسی نے قبول نہ کیا کہ اٹھائیں اور ڈر گئے اور اٹھالیا اس کو انسان نے)

بقول حافظ

آسماں بارِ امانت نتوا نست کشد

قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند" (۱۸۱)

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ قمر جمالی کی فکر اور مطالعہ کتنا وسیع ہے۔

قمر جمالی اس بات کا مختلف جگہوں پر ذکر کر چکی ہے کہ عورت ایک مرد کی بہ نسبت اچھی کہانی لکھ سکتی ہیں۔ اس کا ذکر اگرچہ تبصروں کے ضمن میں بھی ہوا ہے لیکن ان کے دیباچوں میں بھی انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے شاہانہ اقبال کی کتاب ''وجودِ زن'' کے دیباچے ''شاہانہ اقبال کی کہانیاں ایک تعارف'' میں وہ لکھتی ہیں:

''عورت مرد کی بنسبت کہانی اچھی بُن سکتی ہے کیوں بننا اور جوڑنا اس کی سرشت میں شامل ہے''۔ (۱۸۲)

اس کی عملی مثال خود قمر جمالی ہے جس کے قلم سے مختلف شہ پارے وجود میں آئے۔

قمر جمالی تانیثی نقطۂ نظر سے بھی متاثر نظر آتی ہے۔ وہ عورتوں کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں اور دوسرے قلم کاروں کی تخلیقات میں بھی وہ ان چیزوں کا پتہ لگانے کی کوشش کرتی ہیں۔ کبھی کبھی اُن کو محسوس ہوتا ہے کہ

عورت کی محکومیت ہی اس کا بنیادی حق ہے۔ایک دیباچے کے آغاز میں وہ لکھتی ہیں کہ:

''ہم جس نسائی احتجاج کی بات کرتے ہیں تو، درحقیقت اُس حق گوئی کی بات کرتے ہیں جو ازل سے الٹی سمت میں سفر کر رہا ہے۔کیوں کہ ابتدائے آفرینش سے ہی عورت نے ایسی زندگی بھی کہ اس کی محکومیت ہی اس کا بنیادی حق بن گیا۔

یعنی......عورت روزِ اوّل سے کسی نہ کسی کی محکوم، تابع اور فرمانبدار رہی اور اسی کو اس نے اپنا مقدر مان لیا۔نتیجتاً سماج نے بھی اُسے کلیتاً اسی کا اہل قرار دیا۔''(۱۸۳)

قمر جمالی ایک حساس قلمکار ہیں ان کا متاثر ہونا ایک فطری چیز ہے۔وہ عورت کی مشکلات ومصائب سے بھی واقف ہیں اور ان کی ایثار وقربانی اور اطاعت وفرمانبرداری سے بھی۔ایک فرمانبردار عورت کا یہ مقدر ہی ہوتا ہے۔

قمر جمالی اپنے خیالات وتاثرات پیش کرتے ہوئے مبالغہ آرائی سے اجتناب کرتی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ 'فن بولنا چاہئے نہ کہ فن کار' اسی اصول کے تحت ایک تخلیق کو دیکھتی ہیں۔فن کو مدنظر رکھ کر وہ اس پر بات کرتی ہیں۔ اکثر کتابوں کے دیباچے اس لئے لکھوائے جاتے ہیں کہ قاری کی توجہ مبذول کرائی جائے۔مصنف کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے لیکن قمر جمالی کبھی حق کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ان کے دیباچوں میں حقائق پیش کیے گئے ہیں۔اُن کے یہاں اعتدال اور توازن برقرار ہے۔کسی کتاب سے متعلق تمام تفصیلات کا بڑی گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کرتی ہیں اور مدلل انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔

قمر جمالی بلاشبہ موجودہ عہد کی ممتاز اور قدآور علمی وادبی شخصیت ہیں۔قمر جمالی دیباچہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ان کے نزدیک دیباچہ نگاری ایک مستقل فن ہے۔یہی وجہ ہے کہ قمر جمالی کے تحریر کردہ دیباچے، پیش لفظ نہ صرف مصنف اور کتاب کا تعارف کراوتے ہیں بلکہ کتاب اور موضوع پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔

قمر جمالی ایک ایسی شخصیت ہیں کہ شعراء وادبا کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچوں میں جو ان کی علمی کاوش اور محنت کی حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ ان کی کاوشش کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

قمر جمالی کے خیال میں نئے لکھنے والوں کی اصلاح، رہنمائی اور حوصلہ افزائی ہوتی ہے اس لئے کہ وہ کتاب میں کمزوری محسوس کرتی ہیں تو اس طرح اصلاح کرتی ہیں کہ مصنف کا دل بھی رکھ لیتی ہیں اور کمزوری کی

نشاندہی بھی کر جاتی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو موضوع پر مکمل گرفت رکھتا ہو۔انہوں نے جب کسی کتاب کا پیش نامہ دیباچہ لکھا تو سچائی، ایمانداری خوش اسلوبی اور سچے دل سے لکھا۔قمر جمالی نے جن حضرات کی کتابوں کے دیباچے لکھے ان کا تعلق کسی نہ کسی طور پر قمر جمالی سے گہرائی اور قریبی تعلق رہا ہے۔اپنے دیباچوں میں انہوں نے ایسے سوالات بھی اٹھائے ہیں جو ادب میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔قمر جمالی کی دیباچہ نگاری کا انداز ہ بھی منفرد ہے۔ان کے لکھے گئے چند دیباچوں میں تنقیدی آرا بھی ملتی ہے۔

آپ نے حد درجہ سادہ رواں اور عام فہم زبان میں دیباچے تحریر کئے ہیں۔تا کہ قاری کو کسی قسم کی الجھن نہ ہو۔غرض قمر جمالی بحیثیت دیباچہ نگار ایک کامیاب ادیبہ نظر آتی ہیں۔

ن) ریڈیو فیچر

قمر جمالی نے ریڈیو فیچرز بھی تحریر کیے ہیں۔ان کے دو ریڈیو فیچر منظر عام پر آئے اور نشر بھی ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا ریڈیو فیچر ”ہوئی مدت کہ غالب مر گیا“ فروری 2005 اور دوسرا قطب بھاگمتی مارچ 2005 کو نشر کیے گئے ہیں۔ریڈیو نے بھی غالب کے بارے میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ کلامِ غالب کے مفاہیم کو عوام تک لانے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔اگر چہ غالب کا انداز کافی پیچیدہ اور ریڈیو کا میڈیم کافی سہل پسند ہے۔اس لیے بعض اوقات ان دونوں کے درمیان تال میل قائم رکھنا ایک کار دار ثابت ہوتا ہے۔غالب کی فکر کو عام کرنے اور غالب کو غالب بنانے میں ریڈیو نے اہم رول ادا کیا ہے۔اس نے غالب کو ادبی گلیاروں سے نکال کر عوام الناس کے درمیان کھڑا کر دیا۔آج منظّم ہندوستانی نشریات کی عمر (81) برس سے زائد ہو چکی ہے۔اس طویل مدت میں اس نے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں لیکن اس کے پروگراموں میں اردو زبان و ادب کو ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ ابتدائی دور سے ہی ہمیں اردو میں ادبی پروگراموں کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ان نقوش میں ریڈیو کے کئی اصناف بھی ہمارے ساتھ ابھر کر آئے ہیں جیسے ریڈیو ٹاک، ڈراما، فیچر، مباحثہ اور موسیقی وغیرہ، ریڈیو کے ان اصناف کے ذریعے غالب کو اکثر یاد کیا جاتا رہا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ان پروگراموں میں غالب کے اشعار کی تفہیم، ان کی زندگی، ان کے دور کے حالات، ان کا سفر کلکتہ اور پنشن کے قضیہ کے سلسلے میں پروگرام براڈ کاسٹ ہوتے رہے ہیں۔ان پروگراموں کی وجہ سے غالب نے برصغیر کے گلی کوچوں کی سیر کی۔

غالب کی مقبولیت ہر دور میں رہی ہے لیکن ماضی میں اس کی مقبولیت کا دائرہ اتنا وسیع نہ تھا جتنا آج ہے۔ اس مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کرنے کا سہرا ریڈیو کے سر جاتا ہے کیونکہ آج بھی یہی ایک واحد میڈیم ہے جو سکنڈوں میں لاتعداد لوگوں کے دلوں پر دستک دیتا ہے۔

ریڈیو ٹاک سے قطع نظر ریڈیو فیچر کے ذریعہ بھی غالب کی شاعری اور ان کی زندگی کے حقائق پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ ابتدا سے ہی اس طرح کے فیچر کا ذکر ملتا ہے۔ دراصل فیچر ریڈیو کی ایک ایسی صنف ہے جس میں حقائق کو Graphics کے انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور اس گرافک کا تانا بانا الفاظ کے ذریعہ بنا جاتا ہے کہ پوری بات واضح انداز میں پیش کی جاسکے۔

اس طرح کی کوشش آل انڈیا ریڈیو کے تمام اہم مراکز سے کی گئی جیسے 28 فروری 2005 کو غالب پر ایک فیچر ''ہوئی مدت کہ غالب گیا'' کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن حیدرآباد سے نشر ہوا جسے قمر جمالی لکھا تھا۔ اس فیچر کے پروڈیوسر سید عبدالقاسم مقرب الحسینی ہیں اور گلی قاسم جان نے راوی کا کردار ادا کیا ہے۔

مذکورہ فیچر میں غالب کا تعارف، غالب کے دور کا پس منظر اور ان کی پیدائش و پرورش، بچپن، خاندان اور ان کے آباء و اجداد کا پیشہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں انہوں نے غالب کے مزاج کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے غالب کی شخصیت کے متضاد پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ مزید برآں غالبؔ کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ان کی غزلیں نشر بھی کی جاتی ہیں جس سے تفہیم کے لیے مزید راستے ہموار ہو جاتے ہیں۔ غالب کے دور میں ہندوستان کی سیاست، مروجہ تہذیب و ثقافت کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی، مغلوں کی شان و عظمت دم توڑ چکی تھی۔ اقتدار زوال پذیر تھا۔ زندگی سے بیزاری، نفرتیں، افسرگی، ناامیدی کا رجحان عام تھا۔ اس بے چینی اور گھٹن کے دور میں غالب نے ان تمام مصائب و آلام میں زندگی کیسے بسر کی اور ان کے ذہن پر کیا اثر پڑا ان پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے ان حقائق کی روشنی میں غالب سے قہقہہ، نشاط کی امید رکھنا بے جا توقع قرار دیتی ہے اور غالب کی ازدواجی زندگی کی بھی بے اطمینانی تھی، خاندانی حالات اور کسبِ معاش کی تلاش میں دلی منتقل ہوئے، اس کے بعد کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے غالب کے ایک قطعہ کے حوالے سے ان کے دور کی شاعری اور ان کے ہم عصر شعرا نے دلی میں جس شاعرانہ روایت کی بنیاد ڈالی اور جن کی شاعری نے سماج پر کیا اثر ڈالا اور غالب کی رنگِ شاعری بالکل جداگانہ کی بناء پر قابل قبول نہ ہونے کے وجوہات کا بیان کیا ہے۔ مزید اس فیچر میں غالب کی شراب

نوشی کے تذکرہ کرتے ہوئے غالب کے خلاف کئی بدگمانیاں جو عام تھیں جن وجوہات کی بناء پر غالب کو جیل جانا پڑا، ان سب پر تفصیل روشنی ڈالی ہے۔ غالب کے جیل جانے کا اصل واقعہ خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب 'دہلی کی آخری سانس' میں اس طرح لکھا ہے کہ:

''اس وقت دہلی کا صاحبان اقتدار قمار بازی کو روکنے پر بہت توجہ دے رہے تھے۔ مقصد تھا کہ بڑھتی ہوئی تباہی سے سوسائٹی کو بچایا جائے۔ لہٰذا قمار بازوں کو گرفتار کر کے ان پر بھاری جرمانے عاید کیے جا رہے تھے۔ غالب نے اپنے مکان کو جوئے کا اڈہ بنا رکھا تھا۔ دہلی کی عام حالت یہ تھی کہ بے فکر اور آزاد منش نو جوان جن میں کچھ جوہری بچے بھی شامل تھے، جوا کھیلا کرتے تھے۔ عام طور پر گنجفہ کا شغل رہتا۔ غالب ایک تو خود شائق تھے۔ دوسرے روایت کے مطابق مہتمم خانہ کی حیثیت سے ہر بازی میں ان کا بھی حصہ شامل رہتا۔ دراصل ان دنوں امراؤں کے دیوان خانے کلب کی حیثیت رکھتے تھے۔ جب تک مرزا خان شہر کے کوتوال رہے، یہ سلسلہ آرام سے چلتا رہا۔ 1845 میں مرزا خان کی جگہ دوسرا کوتوال آیا تو پھر کسی کی سفارش کام نہ آئی۔ نئے کوتوال کے ذمہ دارانہ تیور دیکھ کر احباب و غالب کو قمار بازی سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہے مگر غالب اپنی عادت سے باز نہ آئے اور آخر۔ قمار خانے کی آوازیں، قہقہے، پھر پولیس کی گربہ جیسے Raid پڑ گئی ہیں، رنگے ہاتھوں دھر دبوچ لیے گئے اور سزا ہو گئی اور جیل میں محصور کر دیے گئے۔''(۱۸۴)

غالب کے خون میں عسکریت اور فوجی خشونت اس بلا کی تھی کہ ان کے مزاج میں ایک قسم کی کرختگی، تلخی اور گھمنڈ آ گئی تھی گو کہ انہوں نے نہ صرف معاصرین کے خلاف سخت و تند الفاظ استعمال کیے بلکہ انہوں نے تو مرحومین تک کو نہ بخشا۔ چنانچہ انہوں نے محمد حسین آزاد، قتیل، عبدالواسع واقف اور غیاث الدین کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا۔ الغرض قمر جمالی، غالب کے اس سخت مزاج کے متعلق ان کے ہی اشعار کے حوالے سے ان کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے صائب کے نام ایک خط میں 'مسجع' اور 'ایطاع' کے متعلق بحث کرتے ہوئے غالب نے قتیل کو کس طرح یاد کیا ہے۔ مذکورہ فیچر میں جس پر روشنی ڈالتے ہوئے غالب کی زبان ثقیل اور لہجہ سخت ہونے کے امکانات کا جائزہ مدلل انداز میں لیا ہے۔ مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ وماعلیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھودیا۔ ان کی سی قیمت کہاں سے لاؤں جو صاحب عالم کی نظر اعتبار پاؤں۔ خالصتاً للہ غور کرو دخران نا مشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ جاں کیا بکتا ہوں۔ واللہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی شعر جانتا ہے۔ میرا یہ خط پڑھو۔ یہ نہیں کہتا خواہی اور نخواہی پڑھو۔ قوت ممیّزہ سے کام لو۔ ان نمونوں پر لعنت کرو۔ سیدھی راہ پر آجاؤ۔ اگر نہیں آتے تو تم جانو۔ تمہاری بزرگی اور مرزا تفتہ کی نسبت پر نظر کر کے لکھا ہے۔ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی تحریر مانو۔ مگر اس کھتری بچہ سے اور اس معلم سے مجھے کمتر نہ جانو۔ عربی حرف اور ہے اور فارسی کا قاعدہ اور ہے۔ سمجھو نہ سمجھو تم کو اختیار ہے۔ عقل کو کام میں لاؤ۔ غور کرو۔ سمجھو۔ عبدالواسع پیغمبر نہ تھا، قتیل برہمانہ تھا، واقف غوث الاعظم نہ تھا۔ میں یزید نہیں ہوں۔

شمر نہیں ہوں، مانتے ہو مانو—نہ مانو تم جانو۔(۱۸۵)

مذکورہ ریڈیو فیچر میں نہایت جامعیت کے ساتھ غالب کی خطوط نگاری اور غالب کے خطوط کی امتیازی اوصاف اور خصوصیات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ غدر کے دوران غالب کے ساتھ پیش آئے ایک واقعے کے حوالے سے ان کی نثری صلاحیتوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس فیچر کا ایک اقتباس دیکھئے:

''**راوی ا:** 1856 کے آغاز میں غالب کے نام تین خطوط لندن سے آئے۔ دورانِ غدر غالب نے ان خطوط سے خوب کام لیا، چنانچہ ایک دن غالب کے گھر میں کچھ گورے گھس آئے اور غالب کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے اور کرنل براؤن کے سامنے پیش کیا۔ کرنل براؤن بہت نرمی سے پیش آیا، جس کا ذکر مولانا حاؔلی نے یادگارِ غالب میں کیا۔

راوی ۲: وَیل: 'تم مسلمان؟'

مرزا نے کہا: ' آدھا'

کرنل نے کہا: 'اس کا مطلب؟'

مرزا نے کہا: 'شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔'

کرنل یہ سن کر ہنسنے لگا اور نہایت مہربانی سے مرزا اور ان کے تمام ساتھیوں کو رخصت کیا۔

راوی ۱: گھر میں گوروں کے گھسنے کا واقعہ غالب نے 'دستنبو' میں لکھا اور گوروں کو محض اس نے نیک خو لکھا کہ انہوں نے گھر کے اسباب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ حالانکہ ان ہی نیک خو لیٹروں کی بندوق سے بے شمار وطن پرست موت کی گھاٹ اتارے دیے گئے۔

راوی ۲: ان تمام باتوں سے یہ جواز نکالا جاتا ہے کہ غالب نے کسی خاص فلسفۂ حیات کو پیش کرنے کا ادعا نہیں کیا۔ ان کا اصل جوہر زبان کی صفائی اور صحت ہے۔ جہاں تک اسلوب کا سوال رہا غالب اپنے اسلوب کے آپ موجد بھی ہیں اور مختتم بھی۔ غالب کے اسلوب کا اعجاز، لفظوں کا سحر، اظہار کا تاثر اور معنویت کی پہنائی اور محض اندازِ بیان کا وہ خزانہ تھا جس کا کوئی مدمقابل نہیں۔'' (۱۸۶)

بالآخر غالبؔ پنشن کی غرض سے کلکتہ پہنچنے پر قتیل کے حلقہ بگوشوں سے صف آرا ہونا اور انگریزوں کی خدمت میں عرضیاں بھیجنے پر ہم عصروں کی نظر میں گر جانا وغیرہ کے حالات کے بیان کے ساتھ ان کی شخصیت وسیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے اور موسیقی کے ذریعہ بھی غالبؔ کے خطوط کی تفہیم کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اداس موسیقی کے ذریعے غالب کے ایام آخر جس بڑی کسمپرسی میں گزرے انہوں نے ایک خط میں لکھا ہے جس کو ایک راویہ کے کردار کی مدد سے نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے، ملاحظہ ہو::

راویہ: ''میں فقیر غالب اسد اللہ، دبیر الملک نجم الدولہ، نہ مقبول ہوں نہ مردود ہوں، نہ بے گناہ ہوں نہ گنہہ گار ہوں، نہ فجر نہ مفسد۔ زندہ ہوں مگر مردے سے بدتر۔ جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلب گار ہوتا، بوڑھا ہوں دعائے مغفرت کا طلب گار ہوں۔

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے(۱)'' (۱۸۷)

درد بھری موسیقی کے ذریعہ غالب کے موت کا سناٹا اور راوی نے کردار کی مدد سے ایک نقشہ کھینچا ہے۔۔ سارنگی پر رنجیدہ دھن اور اشعار کے تحت اس بات کو واضح کیا ہے کہ غالب مرنے کے بعد بھی آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ تابندہ محفوظ ہیں جن کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس بیان کے متعلق اس فیچر کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''برسوں کے تھکے مسافر کو نیند آ گئی تھی۔ وہ شاعر پر ہجوم خاموش تھا۔ شعر و سخن کی شوریدہ سری چپ تھی۔ اب دلی اداس تھی کیونکہ غالب محض ایک فرد تنہا نہیں محرومیوں کی داستان

تھا۔فطری اغلاط اور بڑی کمزوریوں کا مجموعہ، پھر بھی وہ محبوب ہے۔ ہمارا تمہارا ہم سب کا۔ اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت وہ مر گیا، پر زندہ رہ گیا دلوں میں، شعری شبستانوں میں وہ یاد نہیں آتا کیونکہ وہ کبھی محو نہیں ہوا جو دلوں میں زندہ وتابندہ محفوظ ہے۔ وہ فراموش کیسے ہوسکتا ہے۔تب ہی تو—

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے

وہ ہر ایک بات پر کہنا یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' (۱۸۸)

خلاصہ گفتگو یہ کہ ریڈیو فیچر 'ہوئی مدت کہ غالب مر گیا' کے پروگرام میں غالب کے کلام کی روشنی میں ان کی پوری زندگی اور ان کے عہد کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کو اچھی طرح سے نشر کیا گیا ہے۔اس ریڈیو فیچر میں مغلوں کی زوال پذیر تہذیب اور غالب کے ساتھ پیش آئے ادبی معرکوں کا ذکر ان معرکوں کا اثر غالب پر کیا پڑا ان کی زندگی میں اس کا ردعمل جیسے نکات پر روشنی ڈالی ہے۔اس میں کلکتہ کے ادبی معرکے کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے سامعین میں اس غالب کی تصویر ابھر کر ساتھ آئی جو معاشی بدحالی اور مالی تنگی کی وجہ سے نہ جانے کتنے پر پیچ سفر کر کے کلکتہ پہنچا اور سرکار انگلیشیہ میں اپنی عرض داشت پیش کی۔

مزید اس فیچر میں غالب کے اشعار کے حوالے سے غالب کی نفسیاتی ذہنی کیفیات کا کھل کر اظہار کیا ہے جس سے غالب اور غالب کے کلام کی تفہیم عمومی سطح سے ہوئی البتہ موسیقی کے ذریعہ بھی غالب کے اشعار کی تفہیم کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔الغرض مذکورہ ریڈیو فیچر میں غالب اشعار کے حوالہ سے ان کی زندگی کی شکست وریخت کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔

مذکورہ ریڈیو فیچر میں غالب میں بھی نہایت سادہ زبان میں غالب کی شاعری کو مختلف اندازِ بیان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس فیچر میں دورِ غالبؔ کو سمجھنے کی اچھی سعی کی گئی ہے۔

اور اس ریڈیو فیچر میں نہایت جامعیت کے ساتھ غالبؔ کی خطوط نگاری اور غالبؔ کے خطوط کی امتیازی اوصاف اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔علاوہ ازیں غالبؔ کی نثری صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے غالب کے خطوط کی روشنی میں ان کی ایام خاطر جس کسمپرسی میں گزرے اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔اس نوع کی کوشش سے یہ آشکار ہوتا ہے کہ ریڈیو کے ذریعے غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کا ایک طویل سلسلہ ہے لیکن اس کی تحریروں

میں تحقیق وتنقید کا فقدان نظر آتا ہے۔ ریڈیائی تحریروں میں رسمی تنقید یا برائے نام تنقید سے ہی کام لیا جاتا ہے۔ اس نوعیت کی تحریریں زیادہ تر تعارفی نوعیت کی ہوتی ہیں لیکن دلوں میں غالب کے تئیں محبت کو تر وتازہ رکھنے میں کافی مددگار ہوتی ہیں۔ غرض قمر جمالی نے اپنے ریڈیو فیچر میں غالب کی زندگی اور شخصیت سے متعلق موجود تمام خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے اور غالب کے تئیں دلوں میں محبت کو تر وتازہ رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

غرض زیر نظر ریڈیو فیچر میں عنوان حسب موضوع، اسلوب میں دلکشی، زبان وبیان میں شگفتگی، کردار تراشیدہ، نفسیاتی کشمکش، ڈرامائی انداز، درد بھری موسیقی راوی اور راویہ کے بیانیہ انداز جیسے خصوصیات کے ساتھ اس ریڈیو فیچر کو پیش کیا گیا ہے جس سے نہ صرف دورِ غالب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ قمر جمالی کی علمی بصیرت، وسعتِ علم اور تحقیقی وتنقیدی نظر کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اس طرح ریڈیو کی اس صنف نے بھی غالب فہمی کو آگے بڑھانے غالب کی شناخت کو عمومی سطح تک پہنچانے اور مقبول بنانے میں کافی اہم رول ادا کیا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) قمر جمالی، ابتدائیہ، انعکاس، 2012، ص:7-6

(۲) قمر جمالی، نقد ونظر میں شاہد پٹھان کا رویہ زرنقد کی روشنی، انعکاس، 2012، ص:9

(۳) قمر جمالی، نقد ونظر میں شاہد پٹھان کا رویہ زرنقد کی روشنی، انعکاس، 2012، ص:10-9

(۴) قمر جمالی، عارف خورشید کا افسانوی سفر، انعکاس، 2012، ص:20

(۵) قمر جمالی، مرزا دبیر نمبر، (مجموعہ مقالات)، انعکاس، 2012، ص:121

(۶) قمر جمالی، بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ ایک مطالعہ، (افروز سعیدہ کے افسانوں میں حجاب آمیز احساس تشنگی)، انعکاس، 2012، ص:151

(۷) قمر جمالی، پنچھی باورا۔ ایک تجزیہ، انعکاس 2012، ص:80

(۸) قمر جمالی، اردو ناول میں نسائی حسیت، انعکاس 2012، ص:87

(۹) محمد اسلم ڈوگر، بحوالہ: فیچر کالم اور تبصرہ 1998، ص:335

(۱۰) قمر جمالی، اے وحشت دل کیا کروں، مشمولہ: روزنامہ سیاست، حیدرآباد، 25/دسمبر 1990،

(۱۱) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۲) قمر جمالی، لمحوں کے جھروکے سے، مشمولہ: روزنامہ ہمارا عوام، حیدرآباد، 12/مارچ 1998،

(۱۳) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۴) قمر جمالی، محشر بپا کرے کہ یہ پیاس کی ڈلی، مشمولہ: روزنامہ ہمارا عوام، حیدرآباد، 22/اکتوبر 1999

(۱۵) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۶) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۷) قمر جمالی، زبان سنبھال کے، مشمولہ: روزنامہ سیاست، ادبی ایڈیشن، 2/نومبر 2014

(۱۸) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۹) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۲۰) قمر جمالی، اللہ میاں کے نام ایک خط، 6/اپریل 2020، ذاتی بیاز، (غیر مطبوعہ)

(۲۱) قمر جمالی، زندگی تیری عنایات اُف! جھروکا زندگی کا، بنات: بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم، دہلی، 4/اگست 2020

(۲۲) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۲۳) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۲۴) قمر جمالی،پیش لفظ،نواح ادب،2016،ص:17

(۲۵) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:17

(۲۶) قمر جمالی،شیخ فریدالدین عطارؒ،نواح ادب،2016،ص:23-22

(۲۷) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:22

(۲۸) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:25

(۲۹) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:26

(۳۰) قمر جمالی،حکیم ناصر خسرو،نواح ادب2016،ص:54

(۳۱) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:55

(۳۲) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:56

(۳۳) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:57

(۳۴) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:58

(۳۵) قمر جمالی،حسین منصور بن حلاّجؒ،نواح ادب2016،ص:62

(۳۶) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:62

(۳۷) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:64

(۳۸) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:64

(۳۹) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:71

(۴۰) قمر جمالی،مولانا جلال الدین بلخی الرومیؒ،نواح ادب2016،ص:30

(۴۱) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:33

(۴۲) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:46

(۴۳) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:49-48

(۴۴) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:50-49

(۴۵) قمر جمالی،صوفی سرمد شہیدؒ،نواح ادب2016،ص:74

(۴۶) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:76

(۴۷) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:76

(۴۸) قمر جمالی،حضرت شمس تبریزؒ،نواح ادب2016،ص:86-85

(۴۹) ایضاً۔۔۔۔۔ص:88

(۵۰) ایضاً۔۔۔۔۔ص:92

(۵۱) ایضاً۔۔۔۔۔ص:94

(۵۲) ایضاً۔۔۔۔۔ص:95-96

(۵۳) قمر جمالی،ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور بہادر شاہ ظفر ایوارڈ برائے سال 1990،نواح ادب 2016،ص:116

(۵۴) ایضاً۔۔۔۔۔ص:116

(۵۵) ایضاً۔۔۔۔۔ص:120

(۵۶) ایضاً۔۔۔۔۔ص:117

(۵۷) ایضاً۔۔۔۔۔ص:120-121

(۵۸) قمر جمالی،ڈاکٹر راج بہادر گوڑ:ایک شخصیت منشور مثلثی،نواح ادب 2016،ص:106-107

(۵۹) ایضاً۔۔۔۔۔ص:107-108

(۶۰) ایضاً۔۔۔۔۔ص:105

(۶۱) ایضاً۔۔۔۔۔ص:111

(۶۲) قمر جمالی،مردِ آہن۔ڈاکٹر راج بہادر گوڑ،نواح ادب 2016،ص:123-124

(۶۳) ایضاً۔۔۔۔۔ص:137

(۶۴) ایضاً۔۔۔۔۔ص:148

(۶۵) قمر جمالی،بلقیس علاء الدین۔ایک تعارف،نواح ادب 2016،ص:179-180

(۶۶) ایضاً۔۔۔۔۔ص:180-181

(۶۷)ایضاً۔۔۔۔۔ص:181

(۶۸) قمر جمالی،ڈاکٹر عینی حسن۔سادگی،ذہانت اور اخلاص کا پیکر،نواح ادب 2016،ص:182

(۶۹) ایضاً۔۔۔۔۔ص:183

(۷۰) ایضاً۔۔۔۔۔ص:184

(۷۱) ایضاً۔۔۔۔۔ص:190

(۷۲) قمر جمالی،فرہنگ دکن۔مخدوم،نواح ادب 2016،ص:157

(۷۳) ایضاً۔۔۔۔۔ص:158

(۷۴) ایضاً۔۔۔۔۔ص:165

(۷۵) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:167

(۷۶) قمر جمالی، نجمہ نکہت ۔میری یادوں کے صحیفے میں،نواح ادب 2016،ص:175-176

(۷۷) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:174-175

(۷۸) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:177-178

(۷۹) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:176-177

(۸۰) قمر جمالی،ترقی پسند تحریک اور حیدرآباد کی ترقی پسند خواتین افسانہ نگار،نواح ادب 2016،ص:231

(۸۱) قمر جمالی،ترقی پسند اردو غزل میں سماجی سروکار،نواح ادب 2016،ص:205-206

(۸۲) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:210

(۸۳) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:212

(۸۴) قمر جمالی،ترقی پسند تحریک کیا ہے،نواح ادب 2016،ص:199-200

(۸۵) قمر جمالی، ماس میڈیا میں عورت کا رول اور ریڈیو ڈراما میں خواتین کا حصہ،(AIR کے حوالے سے)ص:
261-262

(۸۶) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:262-263

(۸۷) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:265

(۸۸) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:266

(۸۹) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:273

(۹۰) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:277

(۹۱) قمر جمالی،اردو ڈراما اور منجو قمر کی خدمات،نواح ادب 2016،ص:255-256

(۹۲) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:257

(۹۳) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:258-259

(۹۴) قمر جمالی،مولانا آزاد۔صحافتی زندگی کے آئینے میں،نواح ادب 2016،ص:234

(۹۵) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:238

(۹۶) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:240

(۹۷) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:241

(۹۸) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:244

(۹۹) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:246

(۱۰۰) قمر جمالی،فریدہ زین کا تخلیقی سفر۔فسانے سے حقیقت تک،نواح ادب 2016،ص:279

(۱۰۱) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:281

(۱۰۲) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:282-283

(۱۰۳) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:285

(۱۰۴) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:287

(۱۰۵) قمر جمالی،عکس عظمت،انعکاس 2012،ص:39

(۱۰۶) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:41

(۱۰۷) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:38

(۱۰۸) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:43-44

(۱۰۹) قمر جمالی،عارف خورشید کا افسانوی سفر،انعکاس 2012،ص:22

(۱۱۰) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:23

(۱۱۱) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:30

(۱۱۲) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:31

(۱۱۳) قمر جمالی،تحریم ناز،انعکاس 2012،ص:132

(۱۱۴)ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:132

(۱۱۵) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:135-136

(۱۱۶) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:138

(۱۱۷) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:140-141

(۱۱۸) قمر جمالی،شاخِ نبات،سبوچہ،1992،ص:119

(۱۱۹) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:110-111

(۱۲۰) قمر جمالی،آخری تیکون،زہاب 2007،ص:133

(۱۲۱) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:134-135

(۱۲۲) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:139-140

(۱۲۳) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:140

(۱۲۴) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:141

(۱۲۵) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:145

(۱۲۶) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:145

(۱۲۷) قمر جمالی، سفر نامہ انکل، کلنگا اور اوڑیسہ، صحرہ بقف 2015، ص:193

(۱۲۸) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:194

(۱۲۹) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:195

(۱۳۰) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:202

(۱۳۱) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:202

(۱۳۲) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:204

(۱۳۳) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:211

(۱۳۴) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:209

(۱۳۵) قمر جمالی، یادِ عظمت (وفیہ) ادبی میگزین، محفل خواتین، حیدرآباد، 17/مارچ 1990، ص:19-18

(۱۳۶) قمر جمالی، آواز کا مینار۔ سرینواس لاہوٹی، ہفتہ روزہ، نانڈیڑ گزٹ، جلد نمبر 6، شمارہ نمبر 29، یکم جولائی 1992

(۱۳۷) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۳۸) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۳۹) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۴۰) قمر جمالی، اے راحت جاں، زہاب 2007، ص:116

(۱۴۱) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:120-119

(۱۴۲) قمر جمالی، آہ! رفیعہ آپا، مشمولہ: روزنامہ سیاست، حیدرآباد، 19/اگست 2008،

(۱۴۳) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۴۴) قمر جمالی، آہ! راج انکل بڑی مشکل ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا، نواح ادب، 2016، ص:153

(۱۴۵) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:155

(۱۴۶) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:156

(۱۴۷) قمر جمالی، آہ! فریدہ زین، مشمولہ: روزنامہ منصف، حیدرآباد، 24/ستمبر 2015، ص:9

(۱۴۸) قمر جمالی، آہ! راشد بھائی، کیسے راوی داستاں کی داستاں کھا جائے گا، ماہنامہ سب رس، حیدرآباد، جنوری 2017

(۱۴۹) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۵۰) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۵۱) قمر جمالی، آہ! فاطمہ آپا (فاطمہ عالم علی)، ماہنامہ قومی زبان، حیدرآباد، جلد نمبر 5، شمارہ نمبر 12، دسمبر 2020، ص:63

(۱۵۲) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:64

(۱۵۳) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:64-65

(۱۵۴)ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:65

(۱۵۵) قمر جمالی،ادب کا ایئر مارشل،عاتق شاہ،انعکاس 2012،ص:107

(۱۵۶)ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:113

(۱۵۷)ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:114-115

(۱۵۸)قمر جمالی،نگار سلطانہ نایاب،13/نومبر 2013،ذاتی بیاض (غیر مطبوعہ)

(۱۵۹)ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۶۰)قمر جمالی،ڈاکٹر عزیز بانو،استاد فارسی،دانشگاہ عثمانیہ،نواح ادب 2016،ص:191

(۱۶۱) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:193

(۱۶۲)ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:194-195

(۱۶۳) قمر جمالی،نقشِ رہگزر،6/مارچ 2011،ذاتی بیاض (غیر مطبوعہ)

(۱۶۴) قمر جمالی،برودہ، گجرات،مشمولہ:روزنامہ سیاست،حیدرآباد،18/نومبر 1997

(۱۶۵)ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۶۶)ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۶۷)قمر جمالی،ادارہ اسمیتا،حیدرآباد کے زیر اہتمام،خواتین پر تقسیم ہند کے اثرات پر محترمہ ریتومینن کا لکچر،13/ستمبر 1997،پریس کلب،بشیر باغ

(۱۶۸) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۶۹)قمر جمالی،دکنی زبان پر جنوبی ہند کی زبانوں کے اثرات،مشمولہ:روزنامہ ہمارا عوام،حیدرآباد،30/اپریل 1998

(۱۷۰)ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۷۱)ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۷۲) قمر جمالی، 39واں جشن آنکھوں دیکھا حال۔گنبدان یوم قلی قطب شاہ،مشمولہ: روزنامہ ہمارا عوام، حیدرآباد، 30/اپریل 1998

(۱۷۳)ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۷۴)ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۷۵)قمر جمالی،رسم اجراء (اردو ہال)،سنگ اٹھایا تھا،26/دسمبر 1998

(۱۷۶) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۷۷) ایضاً۔۔۔۔۔۔

(۱۷۸)قمر جمالی،شاغل ادیب کا علمی ردعمل (آبروئے لوح قلم)،انعکاس 2012،ص:35-36

(۱۷۹)قمر جمالی، زہر۔ایک تجزیہ،زہر (ناول)،انعکاس 2012،ص:61-62

(۱۸۰)قمر جمالی، کائنات لفظ (عکس فریادی)،انعکاس 2012،ص:39

(۱۸۱)قمر جمالی،شاغل ادیب کا علمی ردعمل،انعکاس 2012،ص:33

(۱۸۲)قمر جمالی،شہانہ اقبال کی کہانیاں۔ایک تعارف (وجود زن)،مسودہ،تاریخ تخلیق،8رجنوری 2017

(۱۸۳)قمر جمالی،اردو ادب میں احتجاج کا نسائی رنگ،مسودہ تاریخ تخلیق،28رفبروری 2019

(۱۸۴)ڈاکٹر محمد شکیل اختر،بحوالہ:غالب بصد انداز 2018،روشان پرنٹر،دہلی،ص:369

(۱۸۵) ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:371

(۱۸۶)ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:371-374

(۱۸۷)ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:375

(۱۸۸)ایضاً۔۔۔۔۔۔ص:375-376

ماحاصل

ماحاصل

سرزمین حیدرآباد اپنی بیش بہا خصوصیات کی بناء پر اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔ابتداء ہی سے یہ شہر اپنی منفرد زبان ،تہذیب اور ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی سرزمین اردو ادب کے لئے بہت زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ قمر جمالی حیدرآباد کے ان گنے چنے ادیبوں میں شمار ہوتی ہیں جنہوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گیسوئے اردو کے دراز سنوارنے میں لگادیا۔ان کے ادبی سرمایے میں افسانوی اور غیر افسانوی ادب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہے۔ اظہار کی بے چینی انہیں خاموش رہنے نہیں دیتی۔انہوں نے غیر افسانوی نثر کی ابتداء تبصروں سے کی ہے۔قمر جمالی کے مطالعہ میں گہرائی ،فکر میں وسعت اور خیالات میں رفعت ہے۔قمر جمالی جب کسی کتاب پر تبصرہ لکھتی ہیں تو اس میں شامل جزئیات نگاری کا باریک بینی سے جائزہ لیتی ہیں۔صرف فہرست کو دیکھ کر اور سرسری تعارف وتوصیف سے کام نہیں لیتی۔ان کا خیال ہے کہ کتاب پڑھنے کے بعد (React) کرنا چاہئے خواہ وہ مثبت ہو یا منفی۔جس کا وہ اپنی عملی زندگی میں بھی استعمال کرتی ہیں۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قمر جمالی قول وفعل کی سچی اور صداقت پسند مصنفہ ہیں۔جب کبھی کوئی بات قمر جمالی کو نامناسب اور غیر متوقع محسوس ہوتی ہے تو وہ اس خامی کی نشاندہی کرتی ہیں اور دوٹوک الفاظ میں قلمبند کرتی ہیں۔کبھی کوئی تحریر اگر صنف کے اعتبار سے اجزائے ترکیبی پر کھرا نہیں اترتی تو اس کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں۔قمر جمالی کی تحریروں کا خاص وصف میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ ابتدائیہ کو بڑی اہمیت دیتی ہیں کبھی آیات قرآنی ،کبھی احادیث ،کبھی حکایتیں ،کبھی اقوال زریں ،کبھی فارسی کلام سے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے فنی نکتہ دانیوں سے شخصیت کی پرتیں کھولتی ہوئیں مصنف اور اس کی تخلیق کا جائزہ لیتی ہیں۔ یہ ان کے وسیع مطالعے کے ضمانت ہے۔قمر جمالی کے تبصروں کے مطالعے سے ان کی زبان و بیان پر قدرت کا بھی پتہ چلتا

ہے ان کا میدان عمل محدود نہیں ہے اس کی بھی وجہ ہے کہ وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتی ہیں۔ وہ فارسی ،عربی اورانگریزی ادب سے الفاظ وتراکیب لے کران کا اردو میں استعمال کرتی ہیں۔قمر جمالی ایک کامیاب تبصرہ نگار ہیں۔انہوں نے اپنے قلم سے قاری کے سامنے جواہر پارے پیش کئے ہیں۔قمر جمالی کے تبصروں کا جو بنیادی وصف ہے وہ ان کامنفرد اسلوب اورطرزِ تحریر ہے۔ان کے طرزِ بیان میں شائستگی ،سنجیدگی ،متانت اورصداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔غیر جانبداداری اورمعاشرتی اقدار کی پاسداری بھی ان کے پاس قوت فیصلہ بھی مضبوط اوروہ فنی تقاضوں سے آ گاہی بھی رکھتی ہے امید ہے کہ ان کے قلم سے اورتبصرے بھی قلم بند ہوتے رہیں گے اوران کا ادبی ذخیرہ اوربھی بڑھتا جائے گا۔

قمر جمالی نے انشائیہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں عصر حاضر کے اہم مسائل کو پیش کیا ہے۔ان کے انشائیوں میں طنز کا نشتر بھی اورظرافت کی چاشنی بھی ہے۔ وہ جس مسئلے کی جانب قارئین کوتوجہ مبذول کرانا چاہتی ہیں بغیر کسی تلخی کے مسائل تک ہماری رسائی ہوجاتی ہے۔قمر جمالی کے انشائیہ نگاری میں جن چیزوں سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے وہ بزلہ سنجی ،حاضر جوابی اورشگفتہ بیانی،قمر جمانی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معمولی مضمون کوبھی نہایت دلکش اورموٴثر انداز میں بنا کر پیش کرتی ہیں۔ان کی زبان میں سادگی ،شگفتہ اورشیریں ہونے کی وجہ سے قبول عام حاصل کر چکی ہے۔ان کے انشائیوں میں جو جدت اورشوخی ہے وہ ان کے وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے۔لہٰذا یہ کہا جائے گا معاشرے کی اصلاح کے لئے انہوں نے انشائیے کوذریعہ بنایا ہے۔ان کے انشائیے صرف تبسم نہیں بلکہ تفکر کی دعوت بھی دیتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان کے انشائیے صنف انشائیہ نگاری میں اہمیت کے حامل ہیں۔

قمر جمالی کے تبصرہ نگاری ، انشائیہ نگاری کے علاوہ مضمون نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ان کے مضامین کی نوعیت تحقیقی وتنقیدی ،شخصی اورتعارفی ہے۔تصوف کے موضوع پر لکھے گئے تحقیق مضامین میں فارسی کے چند اہم صوفیوں کی شخصیت وسیرت اورترک دنیا ،مشائخوں کی خدمت ومحبت اوران کی قوت روحانی وکرامات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضامین ان کے وسیع مطالعہ اورغور وفکر کا نتیجہ ہے ان مضامین کی خاص بات یہ ہے کہ مختلف حکایات وروایات کی روشنی میں مختلف مذہبی کتابوں سے دلائل پیش کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قمر جمالی کی تحریروں میں تصوفانہ رنگ جھلکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اہل تصوف کے عقائد وحدت الوجود اور

وحدت الشہود کو ان تحقیقی مضامین میں بہترین پیرائے میں بیان کیا ہے۔تحقیقی مضامین کی زبان اور اقدار میں سادگی الفاظ اور موضوع کی خوبصورتی نظر آتی ہے۔انہوں نے اپنے مضامین میں ایک ایک چیز کو باریکی سے سوچتے ہوئے ہر چیز کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔قمر جمالی کے مضامین کے مجموعے 'انعکاس' میں شامل منتخب مضامین ہو یا نواح ادب میں شامل شخصیات، گوشۂ راج بہادر گوڑ ا ادبی مطالعے یا ترقی پسند ہو جس میں انہوں نے دکن کی تہذیبی فضا میں پنپنے والے بیسویں صدی کے ان معروف و مشہور دانشور ادیب، شاعر، مرد حضرات و خواتین افسانہ نگار، ڈراما نگاروں کو ہی اپنی تخلیقات میں شامل کیا ہے جن کا وجود ایک منفرد کردار میں ڈھل کر سماج میں ایک صیقل شدہ آئینے کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو وہ پھر ایک مثالی شخصیت بن جاتا ہے اور ہر بالغ النظر انسان، اُس آئینے میں اپنے خدوخال کو درست کرنے کی سعی کرتا ہے۔ان ہی چند معدودِ شخصیات کی ادبی سیاسی، سماجی، معاشرتی، مذہبی و صحافتی خدمات کو ادبی ماحول کے پس منظر اور پس منظر میں انہیں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ادب دوست و شخصیات پر لکھے گئے مضامین موضوع کی وضاحت کے ساتھ ساتھ دکن کی تاریخی و تہذیبی فضاء کو جابجا اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔اور بعض مضامین میں انہوں نے اتنی لمبی تمہید باندھی ہے کہ جس سے قاری کہیں گم ہونے لگتا ہے مگر وہ اپنے لطیف اندازِ بیان کے اظہار سے قاری کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔اوران کے بعض مضامین نے عالمانہ خیالات کا اظہار بھی ملتا ہے۔اور وہ اپنے خیالات اور اظہار کے لئے قرآن وحدیث کی روشنی میں مدلل انداز میں اپنی بات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔شخصیات پر لکھے گئے مضامین میں مصنف کی شاعری افسانہ نگاری وغیرہ کا تجزیہ کرتے وقت اپنی تنقیدی رائے کا اظہار بھی کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معروضی نقطۂ نظر رکھتی ہیں متوازن اور مدلل انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں وہ ایک اچھی محقق اور نقاد بھی ہے۔

قمر جمالی کے مضامین کی سب سے بڑی خوبی ندرتِ فکر ہے۔قاری جب کوئی مضمون پڑھتے ہوئے اس کے موضوع پر آتا ہے تو وہ اپنے طور پر جس چیز کا خیال کرتا ہے اس سے بالکل الگ نئے خیال اور نئے پہلو سے ہم کنار ہوتا ہے۔اس طرح غیر متوقع خیالات اس کی دلچسپی کو بڑھاتے ہیں۔الغرض ان کے تمام مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے انفرادیت رکھتے ہیں۔تحقیق و تنقید کے لئے جس جرأت مندی کی ضرورت ہوتی ہے وہ قمر جمالی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔تلاش و جستجو صاف گوئی، بے باکی، حق گوئی ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے نمایاں وصف

ہیں۔

قمر جمالی تبصرہ نگار، انشائیہ نگار اور مضمون نگار کے علاوہ ایک کامیاب سفر نامہ نگار بھی ہیں۔قمر جمالی اپنے سفر ناموں میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی، جغرافیائی، مذہبی، تعلیمی اور معاشرتی زندگی کو نہ صرف بغور دیکھا بلکہ نہایت خوبی کے ساتھ اپنے سفر ناموں میں سمیٹ لیا ہے۔ان کے اسلوب میں بے پناہ روانی ہے۔ان کا خطابیہ انداز اور تکرارِ الفاظ میں داخلی حسن ہے اور یہ اسلوب قاری کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ قمر جمالی کی تحریر کا انداز فطری، دلآویزی اور بعض جگہ مکالماتی ہے۔ان کے سفر ناموں کی ایک جداگانہ اہمیت اور حیثیت اس لئے بھی ہے کہ مصنفہ نے مروجہ روش سے ہٹ کر اسے تحریر کیا ہے۔ یہ سفر نامہ قدیم اور جدید کا حسین امتزاج ہیں۔ چوں کہ قدیم سفر ناموں کی طرح تاریخ کو زیادہ اہمیت دی ہے اور جدید سفر ناموں کی طرح اس میں ایک سچی سیاحت مخصوص مشاہدات اور فلسفۂ زندگی ملتی ہے۔ان کے سفر ناموں کی سب سے بڑی تخصیص یہ ہے کہ سفر حیات کے تجربات ومشاہدات کا عکس کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ منظر نگاری ہے ۔قمر جمالی کی تحقیقی کامیابی کا راز ان کی منظر نگاری میں پوشیدہ ہے۔سفر ناموں میں اول تا آخر منظر نگاری کو جس خوبی اور فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا وہ قابل ستائش ہے۔ان کے سفر ناموں میں منظر نگاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ان کے سفر ناموں سے منظر نگاری کی فضا کو الگ کر دیا جائے تو ان کے یہ سفر نامے محض ایک تاریخی دستاویز بن کر رہ جائیں گے۔غرض شگفتہ اور پُر لطف نثر، سفر کی روداد، سیاسی، سماجی، تہذیبی وتاریخی حالات کی عکاسی، وہاں کی زبان کی خصوصیات کے بیان اور دلکش منظر نگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری کے مطالعہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک اچھی سفر نامہ نگار ہیں۔اوران کے سفر نامہ اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قمر جمالی نے وفاتیہ نگاری کی طرف بھی توجہ مرکوز کی ہے۔انہوں نے جس کسی بھی مرحوم پر وفاتیہ لکھا ہے اس میں خلوص ومحبت کے ساتھ غم کا اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنے جذبات واحساسات، کیفیات وتاثرات کا اظہار نہایت ہی پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔جس سے قاری کا دل بھی درد وغم سے بھڑک اٹھتا ہے۔سہل اسلوب اور وسیع الفہم تعبیر کے ذریعے ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ حیات وخدمات اور احوال آثار کا پورا مرقع آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔قمر جمالی کے لکھے گئے وفاتیوں میں شخصیتوں کی محبت، عقیدت والفت کی جلوہ گری نے مندرجات کو خشک وسپاٹ ہونے سے بچالیا۔حرف حرف روشنی اور سطر سطر خلوص کا بحر بیکراں موجزن ہے۔مزید چند وفاتیوں میں

مصنفہ نے موت کی حقیقت اور وقت کی اہمیت پر اپنا اظہارِ خیال کرتے ہوئے سماج کو پیغام دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ غرض قمر جمالی ایسی شخصیات کو ہی اپنی توجہ مرکز بنایا ہے جو اپنی بیش بہا علمی، ادبی، سیاسی، سماجی دنیا سے جڑے ادب دوست رہے ہیں۔ خلاصہ گفتگو یہ کہ ان کے لکھے گئے وفیات نثر میں شخصی مرثیہ نگاری کے بہترین نمونوں کو پیش کرتے ہیں۔

قمر جمالی نے خاکہ نگاری میں بھی اپنے قلم کو آزمایا ہے۔ ان کے خاکوں کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں خاکہ نگاری کے تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ زبان وبیان پر انہیں بھرپور قدرت حاصل ہے۔ ان کے خاکوں میں تشبیہات اور محاوروں کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ قمر جمالی نے کسی فرد کی زندگی اور اس کی شخصیت سے متعلق چند انوکھے پہلوؤں کو اس فن کاری سے بیان کیا ہے کہ اس شخص کی زندہ جاوید تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے اور ذہن پر اس کا نقش قائم ہو جاتا ہے۔ قمر جمالی نے اپنے خاکوں میں کرداروں کی اس طرح مرقع کشی کی ہے کہ ان سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور خاکہ نگار نہ صرف انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے کہ بلکہ قاری کے دل میں انسانیت کا احساس بھی موجزن ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے خاکوں میں محبت، جفاکشی، راست گفتاری ، بے لوث محبت، جذبۂ خدمت اور وضع کرداری پر زیادہ زور دیا ہے۔ قمر جمالی نے اپنے خاکوں میں ان کے اساتذہ کرام اور معاصرین کی سیرت کو اُجاگر کیا ہے جن سے انھیں زندگی کے کسی موڑ پر قربت رہی ہے۔ اور ان کے دل میں بے حد احترام اور بہت پیار تھا یہ جذبہ ان کے خاکوں میں جھلکتا ہے۔ الغرض قمر جمالی کی نثری خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

قمر جمالی کے ادبی سفر کا کارواں یہیں رُکتا نہیں بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے وہ صحافت جیسے مشکل میدان میں بھی اپنے کالموں اور مختلف طے شدہ عنوانات پر قلم اٹھاتی رہیں بحیثیت صحافی بھی قمر جمالی نے عمدہ خدمات انجام دی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۶ سے ۲۰۰۰ء تک روزنامہ ہمارا عوام کے ادبی صفحہ ''دھنک'' کی نگراں کار رہیں اور چار سال تک مسلسل ایک ادبی کالم 'زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے' شاید آپ جانتے ہوں کے عنوان سے سماجی حالات پر تبصرے اور ''داستان'' پر کمنٹری لکھتی رہیں۔

اس کے علاوہ قمر جمالی سہ ماہی 'تناظر' کی ایڈیٹر بھی رہ چکی ہیں۔ سہ ماہی 'تناظر' کی صدارت کی ذمہ داری برراج ورما نے قمر جمالی کے سپرد کی تھی اور اس ذمہ داری کو انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ یہ سہ ماہی

رسالہ پہلے دہلی سے شائع ہوتا تھا پھر بلراج ورما کے کہنے پر قمر جمالی نے ایک ایڈیشن حیدرآباد سے نکالا جس کو ۱۹۹۵ میں کتھا جرنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پھر موصوفہ نے اپنی ذاتی مصروفیات کے سبب اس ذمہ داری کو واپس بلراج ورما کو منتقل کر دیا۔ غرض قمر جمالی کے صحافتی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

قمر جمالی نے سفر نامہ نگاری کے علاوہ سفر نامے اور رپورتاژ بھی لکھے ہیں۔ قمر جمالی کے رپورتاژ کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مختصر رپورتاژ ہیں۔ انہوں نے رپورتاژ میں اپنوں نے معروضی انداز کو اپنایا ہے۔ انہوں نے حقیقی واقعات کے بیان کے ساتھ شخصی تاثرات کو بھی پیش کیا ہے۔ قمر جمالی نے ہندوستان کے تاریخی، سیاسی، سماجی، ومعاشرتی، تہذیبی اور مذہبی واقعات کا بیان بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ جس سے اس عہد کے معاشرتی حالات، تہذیبی روایات کے علاوہ ادبی رجحانات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ انہیں کردار نگاری پر بھی مکمل دسترس حاصل ہے۔ ان کے رپورتاژ میں صرف دوسرے اشخاص ہی نظر نہیں آتے بلکہ ان کا مرکزی کردار یعنی قمر جمالی کی شخصیت بھی موقع ومحل کے ساتھ جلوہ گر ہوتی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ وہ خود ان چشم دید واقعات کی عینی شاہد ہیں اس لئے جگہ جگہ ان کی شخصیت کی بھی جھلکیاں پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہیں اور ساتھ ہی ان کے خیالات ونظریات کا بھی پوری طرح علم ہوتا ہے۔ غرض قمر جمالی نے اپنے رپورتاژ میں کردار نگاری، واقعہ نگاری منظر نگاری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ اور شگفتہ بیانی، دلکش اسلوب اور طنز ومزاح کے باعث ان کے رپورتاژ اردو ادب میں اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔

تحقیقی وتنقیدی مضامین اور تبصروں کے علاوہ قمر جمالی نے مختلف ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر عالمانہ دیباچے اور پیش لفظ بھی لکھے ہیں۔ قمر جمالی نے یہ دیباچے اور پیش لفظ کسی ایک صنف سے تعلق رکھنے والی تصنیف پر لکھے بلکہ مختلف ومتضاد تصانیف یعنی ناول، افسانہ، شاعری، تنقید، غرض سبھی اصناف سے تعلق رکھنے والی تصانیف پر دیباچے لکھے جس سے ان کی علمی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قمر جمالی چونکہ ایک تعلیم یافتہ قلمکار ہیں۔ ان میں سوچ وفکر بھی بلند پایہ ہے۔ اپنی بات قاری تک پہنچانے کا ان کے پاس نہایت ہی عمدہ سلیقہ ہے۔ اپنی بات کی دلیل پیش کرنی ہو تو قرآن مجید کی آیات سے سہارا لیتی ہیں۔ بزرگان دین کے اقوال سے مدد حاصل کرتی ہیں اور ادب میں اعلیٰ مقام رکھنے والوں کے اقتباسات سے قاری کو اپنی عالمانہ انفرادیت سے قائل کرتی ہیں۔ قمر جمالی اپنے خیالات وتاثرات پیش کرتے ہوئے مبالغہ آرائی سے اجتناب کرتے ہوئے مدلل انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔ قمر

جمالی ایک ایسی باوقار شخصیت ہیں کہ شعراء وادباء کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچوں میں جوان کی علمی کاوش اور محنت کی حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ ان کی کاوش کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔قمر جمالی کے خیال میں نئے لکھنے والوں کی اصلاح، رہنمائی اور حوصلہ افزائی ہوتی ہے اس لئے کہ وہ کتاب میں کمزوری محسوس کرتی ہیں تو اس طرح اصلاح کرتی ہیں کہ مصنف کا دل بھی رکھ لیتی ہیں اور کمزوری کی بھی نشاندہی بھی کرجاتی ہیں۔حقیقت یہ کہ یہ کام وہی کرسکتا ہے جو موضوع پر مکمل گرفت رکھتا ہو۔انہوں نے اپنے دیباچوں میں ایسے سوالات بھی اٹھائے ہیں جوادب میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔قمر جمالی کی دیباچہ نگاری کا انداز بھی منفرد ہے۔ان کے لکھے گئے چند دیباچوں میں تنقید آرا بھی ملتی ہے۔غرض قمر جمالی بحیثیت دیباچہ نگار ایک کامیاب ادیبہ نظر آتی ہیں۔

قمر جمالی کے دو ریڈیو فیچرز بھی تحریر کئے ہیں۔ان ریڈیو فیچرز میں غالب اور قطب شاہی عہد کے سیاسی، سماجی معاشرتی وثقافتی، اورادبی سرگرمیوں کو اچھی طرح سے نشر کیا گیا ہے۔ مذکورہ ریڈیو فیچرز میں عنوان حسب موضوع، چست منظر نگاری میں پائیداری، اسلوب میں دلکشی، زبان وبیان میں شگفتگی، کردار تراشیدہ، نفسیاتی کشمکش، ڈرامائی انداز، درد بھری موسیقی، صوتی اشارے اور راوی اور راویہ کے بیانیہ انداز جیسے خصوصیات کے ساتھ ان ریڈیو فیچرز کو پیش کیا گیا ہے۔جس سے دور غالب اور قطب شاہی دور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس طرح ریڈیو کی اس صنف نے بھی غالب فہمی کو آگے بڑھانے، غالب کی شناخت کو عمومی سطح تک پہنچانے اور مقبول بنانے میں کافی اہم رول ادا کیا ہے۔

غرض غیر افسانوی ادب کو ہم ترسیل وابلاغ کا بہترین ذریعہ کہہ سکتے ہیں۔کیوں کہ اس کے ذریعہ خیالات واحساسات اور نظریات کی ترسیل بغیر کسی الجھاوے کے آسانی کے ساتھ ہوجاتی ہے۔لہٰذا قمر جمالی، غیر افسانوی ادب میں اپنے ہم عصر معاصرین نثر نگار یعنی ۱۹۵۰ء کے بعد لکھنے والوں میں رفیعہ منظور الامین، نسیمہ تراب الحسن، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، سلطانہ شرف الدین احمد، سکینہ وسیم عباس، نجمہ نگہت، محترمہ ا۔و۔شاکرہ، شبینہ فرشوری وغیرہ تخلیقات کی تقابلی مطالعے بعد قمر جمالی اپنے ہم عصر معاصرین میں منفرد اور اہمیت کی حامل ان وجوہات کی بناء پر نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنے تمام تخلیقات میں اپنے خیالات وتاثرات کے اظہار کے لئے قرآنی آیات واحادیث، اقوال رزیں، حکایات، فارسی کلام کے اشعار کا سہارا لیکر اپنی بات کو مدلل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے عام قاری ان کی تخلیقات پڑھ کر نہ صرف نصیحت حاصل کرتا ہے بلکہ متاثر بھی نظر آتا ہے۔دوسری

وجہ یہ ہے کہ اردو ادب میں افسانوی نثر کے مقابلے میں غیر افسانوی نثر کا سرمایہ کم ہے جبکہ مرد حضرات کے مقابلے میں خواتین کے تخلیقات کا سرمایہ اور بہت کم ہی نظر آتا ہے۔ چنانچہ قمر جمالی کی غیر افسانوی ادب کی مجموعی حیثیت کے مطالعے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی غیر افسانوی نثر کے نمایاں یعنی موضوع کا انتخاب، حسن ترتیب، لطیف انداز بیان، زبان و بیان پر عبور، تخلیقی حسیت، تحقیقی وتنقیدی نظر اور وسیع مطالعہ کے بناء پر ان کی تمام تخلیقات ادبی اعتبار سے اہمیت کی حامل اور اردو ادب کے باب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆☆☆☆☆

کتابیات

کتابیات

نمبر	مصنف کا نام	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	انیس قیوم فیاس	حیدرآباد میں افسانہ نگاری	شالیمار پبلی کیشن، حیدرآباد	1980ء
2	پروفیسر خالد سعید	خواتین کی تحریریں، خواتین کے متعلق تحریریں (اردو ادب کے حوالے سے)	مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد	
3	قمر جمالی	فتراک	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2020
4	پروفیسر مجید بیدار	اردو میں غیر افسانوی ادب۔ ایک جائزہ	ڈائریکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، حیدرآباد	دسمبر 2020
5	ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد	غبار خاطر ایک تنقیدی مطالعہ	لکھنؤ	اپریل 1971
6	کلیم الدین احمد	اردو تنقید پر ایک نظر: اردو میں تبصرہ نگاری	پٹنہ پریس، پٹنہ	1983
7	پروفیسر مجید بیدار	اردو کی شعری اور نثری اصناف	حیدرآباد	2014
8	محمد اسلم ڈوگر	فیچر، کالم اور تبصرہ	مقتدرہ، قومی زبان، پاکستان	1998
9	وزیر آغا	انشائیہ کے خدوخال	نئی آواز۔ جامعہ نگر، نئی دہلی	1991
10	فرمان فتح پوری	اردو نثر کا فنی ارتقا	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	2013
11	پروفیسر حامد حسین	داستان تاریخ اردو	میٹیا محل، دہلی	1938
12	نورالحسن نقوی	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1997
13	پروفیسر سیدہ جعفر	اردو مضمون کا ارتقا	حیدرآباد، چارکمان	1972

14	مولاناابوالکلام آزاد	رباعیات سرمد شہید(فارسی مع ترجمہ اردو)	دہلی	1963
15	انورسدید	اردوادب میں سفرنامہ	لاہور	1989
16	ڈاکٹر قدسیہ قریشی	اردوسفرنامے انیسویں صدی میں	لکھنؤ	1987
17	ڈاکٹر مرزاحامد بیگ	اردوسفرنامے کی مختصر تعریف	اسلام آباد	1987
18	صابرہ سعید	اردوادب میں خاکہ نگاری	مکتبہ شعروحکمت،حیدرآباد	1978
19	ڈاکٹرانورسدید	برسبیل تنقیدلاہور	مقبول اکیڈمی	1990
20	پروفیسر محمد ظفرالدین	ششماہی ادب وثقافت	ڈاکٹریٹ آف نیشنل اینڈ پبلی کیشن، مولانا آزاداردویونی ورسٹی،حیدرآباد	ستمبر2020
21	محمودحامد	سنگ اٹھایاتھا	وسنتا گرافکس،حیدرآباد	نومبر1998
22	واجدہ بیگم	قرۃالعین حیدرکی رپورتاژ نگاری	روشان پرنٹرس،دہلی	2015
23	ارشاداحمد خاں	اردومیں رپورتاژ نگاری کافنی جائزہ	ماہنامہ فکروتہذیب،دہلی	2015
24	سجادظہیر	روشنائی	تحقیق کارپبلی کیشنز،دہلی	2006
25	آمنہ صدیقی	افکارعبدالحق	ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس،دہلی	1979
26	آل احمدسرور	تحقیق کیاہے؟	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	2011
27	ڈاکٹراخلاق اثر	ریڈیوڈرامے کی اصناف	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	1980
28	ڈاکٹر محمد شاہد حسین	ابلاغیات	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،دہلی	2004
29	محمودحامد	طاس	ایس کے پرنٹرس،حیدرآباد	دسمبر2007
30	شبینہ فرشوری	شہرآرزو	چھتہ بازار،حیدرآباد	2011
31	نسیمہ تراب الحسن	نقوش دل	اردواکیڈمی،آندھرپردیش	2003
32	عطیہ نورالحق	طنزکےرنگ تبسم کےسنگ	حیدرآباد	2012

رسائل وجرائد

۱۔ماہنامہ قومی زبان،مدیر:ڈاکٹرمحمد غوث،تلنگانہ ریاستی اردواکیڈمی،حیدرآباد،2020

۲۔ماہنامہ قومی زبان،مدیر:سیدعبدالشکور،جلد4،شمارہ2،تلنگانہ اسٹیٹ اردواکیڈمی،حیدرآباد،ماہ فروری2019

۳۔ماہنامہ لاریب،مدیر:رشیدقریشی،جلد26،شمارہ1،لکھنؤ،جنوری2014

۴۔ماہنامہ آجکل،مدیر:ڈاکٹرابراررحمانی،جلد24،شمارہ8،نئی دہلی،مارچ2016

۵۔ششماہی بیسوی صدی،مدیرہ:ڈاکٹرشمع افروززیدی،شمارہ نمبر2،افسانہ نمبرجولائی تادسمبر 2022،نئی دہلی

۶۔ادبی میگزین(محفل خواتین)،مدیرہ:فاطمہ عالم علی،17/مارچ1990

مضامین

۱۔غیرافسانوی ادب کےفروغ میں خواتین کاحصہ،ڈاکٹرعزیزسہیل،17/جون2019،

www.mazameen.com

۲۔مضامین نوبہ نو:حافظ کرناٹکی کی عمدہ پیش کش،ڈاکٹراحسان عالم،2/جولائی2022

www.lazawal.com

۳۔خودوفاتیے،محمداظہارالحق،11/جنوری2022، www.duniya.com.pk

۴۔ وفاتیہ،ویکیپیڈیا، ur.m.wikipedia.org

۵۔حیدرآباددکن،جسےموتیوں کاشہرکہاجاتاہے،رضوان وانی،26/فروری2022

www.independenturdu.com

☆☆☆☆☆

AS PER THE UNIVERSITY POLICY, ANTI-PLAGIARISM SCREENING IS NOT REQUIRED FOR THE REGIONAL LANGUAGES

Librarian
Indira Gandhi Memorial Library
UNIVERSITY OF HYDERABAD
Central University P.O.
HYDERABAD-500 046.